ماہنامہ
حنا
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

قارئین کرام! مارچ 2016ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

آج کل ملک میں کرپٹ عناصر کے خلاف نیب کی کارروائیوں پر احتجاج کا طوفان اٹھا ہوا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں نیب کے خلاف یکجان نظر آرہی ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ہر شخص کرپشن کے خلاف بیان دے گا اور یہی کہے گا کہ کرپشن ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اگر ملک سے اس کا خاتمہ کر دیا جائے تو بہت سے مسائل سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن یہ بات ہر شخص دوسرے کے بارے میں کہتا ہے اور جب اس کا احتساب کیا جائے تو شور مچانا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی ہو رہی ہے۔

ہماری نظر میں یہ بات بالکل درست ہے کہ اوپر سے نیچے تک سب کا احتساب ہونا چاہیے اور بلا امتیاز ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کرپشن کا ملزم کوئی صاحب حیثیت ہے یا کوئی عام آدمی۔ ملک میں کرپشن کا جو حال ہے اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔ ملک کی بقا کے لیے کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے اس لیے اگر نیب بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈال رہی ہے تو اس کا راستہ روکنے کی بجائے اس کی تحسین کرنی چاہیے اور اس کا حوصلہ بڑھانا چاہیے۔ ملک میں اگر بے چینی کی حالت ہے اور جرائم کی شرح بڑھ رہی ہے تو اس کی ایک وجہ کرپشن بھی ہے۔ جس سے قومی وسائل کی لوٹ مار ہوتی ہے اور ان کی منصفانہ تقسیم ممکن نہیں رہتی۔ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے جس سے ملک کی ترقی متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ احتساب منصفانہ ہو، یہ نہ ہو کہ افسران لوگوں کو دھمکانے کے لیے بلاوجہ ان کو احتساب کے نام پر بلا کر دفتروں میں ذلیل کریں۔ ضروری یہ ہے کہ کرپشن کے خلاف مقدمات کی تحقیقات جلد از جلد مکمل کی جائیں اور مقدمات عدالت میں پیش کیے جائیں کیونکہ اگر دیر کی جائے تو ملزمان مل ملا کر شواہد مٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح صاف چھوٹ جاتے ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کوشش کی جائے تو ملک میں کرپشن سے پاک معاشرے کے قیام کا دیرینہ خواب پورا ہو سکتا ہے۔

اس شمارے میں: ۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں مہمان نازش امین، معروف اعجاز اور شنک ارم ذاکر کے مکمل ناول، فرح بخاری اور رمشا احمد کے ناولٹ، شگفتہ ستار، فرزانہ حسین ہاشمی، عمارہ امداد، شعیلہ زاہد، جمیرہ توشین، مہجبانہ شوکت اور فاطمہ خان کے افسانے، مسعودہ گیلانی، نایاب جیلانی اور ام مریم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

ہے لرزہ اعضا میں کہ خطا بھی بہت ہے
دل کو تری رحمت پہ بھروسا بھی بہت ہے

ہے کسی خبر کی چاہت کا ٹھکانہ بھی دلوں میں
اور ان کو ترے عشق کا دعوا بھی بہت ہے

دے ان کو مگر کوئی بشارت عشق کا موسم
دکھ جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

کھول کر وہ دیکھ پائیں ترے حسن کو یارب
دل جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

رک جائے قلم حرف ثنا پہ مرا آ کر
ہر چند سخن کا یہ سلیقہ بھی بہت ہے

سمجھو نہ تو دریا و سمندر نہیں کافی
گر سمجھو تو قطرے کا یہ پیالہ بھی بہت ہے

بخشش کہ میں لائق نہیں تو پھر بھی کرم کر
نعمان اکیلا بھی ہے پیاسا بھی بہت ہے

نعمان فاروقی

نعت رسول مقبول ﷺ

ملے شاد تو رنگینیِ بہار مدینے میں
بنا رکھے ہیں فرشتوں نے گھر مدینے میں

نبی کے نور کی پاکیزگی اسکی طلب
کر ہیں طواف میں شمس و قمر مدینے میں

ہوا میں پاک و منور اثر رکھیں ہجم
حرم سے آئے ہوئے ہیں شجر مدینے میں

بیان کرتے ہیں تفسیر سورۂ رحمٰن
گل و شگوفہ و برگ و ثمر مدینے میں

وہاں سے منزل عرفان بلانے لگتی ہے
تمام ہوتا نہیں ہے سفر مدینے میں

ملے کچھ اس طرح دست طلب دراز نہ ہو
کہیں بھی ایسا نہیں ہے مگر مدینے میں

وہ چند روز سبھی زندگی کا حاصل ہیں
جو ہو گئے ہیں تصور بسر مدینے میں

یعقوب تصور

پیارے نبی کی پیاری باتیں

سیدہ خرم

اللہ کی محبت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس تو بھی اس سے کر، پھر جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمان والے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں کے دلوں میں وہ مقبول ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے دشمنی رکھتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں کا دشمن ہوں تو بھی اس کا دشمن ہو تو پھر وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں پھر آسمان والوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے دشمنی رکھتا ہے، تم بھی اس کو دشمن رکھو، وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں میں اس کی دشمنی جم جاتی ہے۔" (یعنی زمین میں بھی اللہ کے جو نیک بندے یا فرشتے ہیں، وہ اس کے دشمن رہتے ہیں۔) (مسلم)۔

بھائی چارہ

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن (دوسرے) مومن کے لئے ایسا ہے جیسے عمارت میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے (اسی طرح ایک مومن کو لازم ہے کہ دوسرے مومن کا مددگار رہے۔)

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"مومنوں کی مثال ان کی دوستی، اتحاد اور شفقت میں ایسی ہے جیسے ایک بدن کی، (یعنی سب مومن مل کر ایک قالب کی طرح ہیں) بدن میں سے جب کوئی عضو درد کرتا ہے تو سارا بدن اس (تکلیف) میں شریک ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی اور بخار آ جاتا ہے۔" (اسی طرح ایک مومن پر آفت آئے خصوصاً وہ آفت جو کافروں کی طرف سے پہنچے تو سب مومنوں کو بے چین ہونا چاہیے اور اس کا علاج کرنا چاہیے۔) (مسلم)۔

پردہ پوشی کے بیان میں

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کسی بندے پر اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ ڈال دیتا ہے تو آخرت میں بھی پردہ ڈالے گا۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جو کوئی شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کا عیب چھپائے گا۔" (مسلم)

نرمی کے بارے میں

سیدنا جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

"جو شخص نرمی سے محروم ہے، وہ بھلائی سے محروم ہے۔"

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کسی میں نرمی ہو تو اس کی زینت ہو جاتی ہے اور جب نرمی نکل جائے تو عیب ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

تکبر کرنے والے کے بارے میں

سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"عزت اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اور بڑائی اس کی چادر ہے (یعنی یہ دونوں اس کی صفتیں ہیں) پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جو کوئی یہ دونوں صفتیں اختیار کرے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے بات نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، نہ ان کی طرف (رحمت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کو دکھ کا عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زنا کرنے والا، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے مغرور محتاج۔" (مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھانے والے کے متعلق

سیدنا جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا۔

"ایک شخص بولا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔"

"اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کون ہے جو قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کو نہ بخشوں گا، میں نے اس کو بخش دیا اور اس کے (جس نے قسم کھائی تھی) سارے اعمال لغو (بیکار) کر دیے۔" (مسلم شریف)

برے شخص کا بیان

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس کو اجازت دو برا اپنے کنبے میں ایک برا شخص ہے۔"

جب وہ اندر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نرمی سے باتیں کیں تو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس کو ایسا فرمایا تھا پھر اس سے نرمی سے باتیں کیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! برا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت میں وہ ہوگا جس کو لوگ اس کی بدگمانی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔" (مسلم شریف)

درگزر کرنے کے بیان میں

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"صدقہ دینے سے کوئی مال نہیں گھٹتا اور جو بندہ معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔" (مسلم شریف)

غصہ کے وقت پناہ مانگنے کا بیان

سیدنا سلیمان بن صرد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گالی گلوچ کی۔ ایک کی آنکھیں لال ہو گئیں اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"مجھے ایک کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے، وہ کلمہ یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔" (مسلم شریف)

راستہ صاف کرنے کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک شخص نے راہ میں کانٹوں کی ڈالی دیکھی تو کہا کہ اللہ کی قسم میں اس کو مسلمانوں کے آنے جانے کی راہ سے ہٹا دوں گا تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کیا۔"

سیدنا ابوبرزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ "یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"مسلمانوں کی راہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دے۔"

مومن کی مصیبت کا بیان

اسود کہتے ہیں کہ قریش کے چند جوان لوگ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور وہ منیٰ میں تھیں اور لوگ ہنس رہے تھے۔
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔
"تم کیوں ہنستے ہو؟"
انہوں نے کہا کہ "فلاں شخص خیمہ کی طناب پر گرا اور اس کی گردن یا آنکھ جاتے جاتے بچی۔"
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا "مت ہنسو اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسلمان کو ایک کانٹا لگے یا اس سے زیادہ کوئی رنج پہنچے تو اس کے لئے ایک درجہ بڑھے گا اور ایک گناہ اس کا مٹ جائے گا۔" (مسلم شریف)

مومن کی تکلیف

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔
"مومن کو جب کوئی تکلیف یا غم یا بیماری یا رنج ہو یہاں تک کہ فکر جو اس کو ہوتی ہے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔"
سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ
"جو کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا۔" تو مسلمانوں پر بہت سخت گزرا (کہ ہر گناہ کے بدلے ضرور عذاب ہوگا)۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"میانہ روی اختیار کرو اور ٹھیک راستہ کو ڈھونڈو اور مسلمان کو (پیش آنے والی) ہر ایک مصیبت (اس کے لئے) گناہوں کا کفارہ ہے، یہاں تک کہ ٹھوکر اور کانٹا بھی۔" (گویا بہت سے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں ہو جائے گا اور امید ہے کہ آخرت میں مواخذہ نہ ہو۔) (مسلم شریف)

دوسرے مسلمان سے برتاؤ

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک دوسرے سے بغض مت رکھو اور ایک دوسرے سے حسد مت رکھو اور ایک دوسرے سے دشمنی مت رکھو اور اللہ کے بندو بھائیوں کی طرح رہو اور کسی مسلمان کو حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک (بغض کی وجہ سے) بولنا چھوڑ دے۔" (مسلم شریف)

سلام میں پہل

سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"کسی مسلمان کو یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تک (بولنا) چھوڑ دے۔ اس طرح کے دونوں ملیں اور یہ ایک اپنا منہ ادھر اور دوسرا اپنا منہ ادھر پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہوگا جو سلام میں پہل کرے گا۔"

کینہ رکھنا اور آپس میں قطع کلامی

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں، پھر ہر ایک بندے کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا لیکن وہ شخص جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے، اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو رہنے دو جب تک کہ صلح کر لیں۔" (جب صلح کر لیں گے تو ان کی مغفرت ہوگی)۔

بدگمانی سے بچنے کا حکم

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے اور کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ اور جاسوسی نہ کرو اور (دنیا میں) رشک مت کرو (لیکن دین میں درست ہے) اور حسد نہ کرو اور بغض مت رکھو اور دشمنی مت کرو اور اللہ کے بندے اور (آپس میں) بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم شریف)

☆☆☆

انشاء نامہ

ابن انشاء

ایک اخبار کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی بیوی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں، ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچے یار میاں سے آزردہ تھے جس کا رویہ ہماری نظم و نثر کے بارے میں کچھ اس قسم کا ہے، ہم نے اس عزیز محترم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں، افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا، علم عروض اور لسانیات کے نکات سمجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دور رس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا، لیکن اس نے ہمیشہ جمائی لے کر ٹالا اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا، حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں، اگلے ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔

لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ عزیز مذکور کو ادب عالیہ اور دیگر معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں، نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفتگی کا اظہار کرتا، ایسے کچھ چیزوں سے کسی کو بنا نہیں، کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ نعت پاک ہے حجازی سے زبان کو اتنا گراں مایہ نہ بناتے اور سیدھے سیدھے زبان میں شعر کہتے اور اک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے تو آج آپ کی بیوی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستار لے بیٹھتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستار بجانا کوئی بری بات نہیں ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع و خشوع سے بیٹھ کر بیوی کا الاپ سنتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لاڈلا ٹھیکا ڈنڈے سے مزے کا ٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی واہ واہ کرتے ہیں اور جب ٹیچ ہوتے ہیں تو اچھے لوگ اسپورٹس پرکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو بھی نصیب نہیں ہو سکتے، اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے، لیکن لوگوں کا کیا ہے، وہ تو پھر

کو بھی پاگل ہی سمجھتے۔

ان مثالوں سے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فضلاء کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیوں بنتے ہیں اور بڑے بڑے شعرا یعنی تا میفرالرحمن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابن، کٹ پیس بیچتے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون از کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل ابھی زخمی ہے، لیکن کوئی مشاعرہ ہونے کی خبر نہیں تو وہ گھر سے خیرات شروع کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں۔ بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے، مغز کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا متحمل ہو سکے، ہمارے ایک بزرگ دلدار شاہجہاں پوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داد طلب کیا کرتے تھے، وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا، دلدار صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے چکے ہیں کہ ”عزیزم واپس آ جاؤ، اب تمہیں کوئی غزل نہ سنائی جائے گی۔“ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اس کا حال ہی میں کھلا، صاحبزادے کراچی کے ایک مشہور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابا میاں کی غزل نہ چھپی ہو۔

ہماری شہرت تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے، لیکن اگر ادارہ فنا ہماری غزلیں چھاپنے میں صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے، یہ قدر ناشناسی حنا والوں تک محدود نہیں، کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا، اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکنا بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔

ہمیں اس صورت حال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا، لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو، ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے سب ہی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے، بیجنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات بھی تھیں، ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی، کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی، تھوتھا سا منہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے، عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی، اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی، اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا، غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے، لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر لی کہ اب کچھ یاد نہیں، کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا، البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔

”غزلیں جو آپ نے پڑھیں، کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں، آپ شاعر ہیں کیا؟“

ہمارا خیال ہے کہ کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا شکیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے، بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سنانے پڑتے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نازش امین

قاری کا مصنف سے دلی و جذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات، وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب و روز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "ایک دن حنا کے نام" جس میں ہر ماہ ایک مصنفہ اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی کہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

رات باقی تھی ابھی
جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا
جاگ سحر آئی ہے

پھر دیکھ اور دن تمام ہوتا ہے اور رات ہوتی ہے، رات جس کا پورے دن میں شدت سے انتظار کرتی ہوں، کیونکہ یہ وہ واحد وقت ہوتا ہے جو میں اپنے ساتھ بسر کرتی ہوں۔

رات میری سہیلی ہے، میرے ان کہے لمحوں کی راز دار، رات جس سے میں سب کہہ دیتی ہوں اور اس میں، میں وہ بنی ہوتی جو دن بھر ہوتی ہوں۔

دن بھر میں ڈاکٹر نازش، جو ایک ہومیوپیتھ بھی ہے اور میڈیکل کے طلبہ اور طالبات کو پڑھانے والی ٹیچر بھی جو ایک M.Phil اسکالر بھی ہے اور ایک بیوی اور ماں بھی، بہت سے کردار ہیں میرے جو میں دن بھر نبھاتے جب تھک کر چور ہو جاتی ہوں تو رات کا انتظار کرتی ہوں، جب میں صرف نازش امین ہوتی ہوں، جو کہ شاعر بھی ہے اور ایک لکھاری بھی۔

میں نے انگریزی زبان میں شاعری لکھی اور اس قدر تو لکھ چکی ہوں کہ کتاب چھپنے کو ہے مگر وقت کی قلت اور ذمہ داریوں کی شدت کے بیچ

کہیں تنگ ہو گئی ہے، اردو میں بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا وہ حنا کے توسط سے آپ تک طویل بغیر کسی پہچان کے ہزار یقین جانیے اس میں بہت ہاتھ فوزیہ شفیق کی محبت کا بھی ہے ورنہ دو لفظ لکھنا بھی محال تھا۔

باقاعدگی سے آن لائن بلاگ لکھتی ہوں اور انگلش کتابیں پڑھتی ہوں، انگریزی میں پہلا ناول لکھنا شروع کیا تو کافی لکھ ڈالا مگر پھر پوسٹ گریجویشن کی پڑھائی نے سلسلہ روک لیا سو اب با آسانی سے مجھے ان لوگوں میں شامل کر لیں جن کے لیے فیض نے کہا تھا، کچھ عشق کیا کچھ کام کیا۔

سو رات مجھے جگاتی ہے، سبز چائے یا سرخ کافی کی وجہ سے تیکھی کم لے پاتی ہوں، صبح نماز کے وقت جاگ جاتی ہوں، بچی کو اسکول روانہ کر کے کوئی آدھ گھنٹہ واک کرتی ہوں، ساتھ میں وہی سبز چائے ہوتی ہے جس کے بغیر نیند سے بوجھل آنکھیں کھلتی بھی نہیں۔

کمرو سمیٹا، ناشتہ بنایا، میاں صاحب اور میں ناشتہ اکٹھے کرتے ہیں پھر وہ اپنے دفتر اور میں اپنی یونیورسٹی روانہ ہو جاتے ہیں، اپنے دفتر پہنچ کر پہلے تلاوت قرآن پاک کرتی ہوں، پھر اگر کوئی میٹنگ یا پیپر ورک ہو وہ نمٹاتی ہوں، میں میڈیکل کے طالب علموں کو پڑھاتی ہوں، ساتھ ہی پوسٹ گریجویشن کا سلسلہ ہے، تھیسس پر کام جاری ہے، سپروائزر سے ملنے جناح اسپتال بھی جانا ہوتا ہے یوں کافی بھاگ دوڑ میں دن گزرتا ہے۔

واپسی کوئی تین بجے تک ہوتی ہے، پھر گھر کی ذمہ داریاں، بچی سے گپ شپ، اسکول کا ہوم ورک، کھانا پینا، لانڈری صفائی کے کچھ باقی ماندہ کام، کچن دیکھنا، جو کچھ بھی چھوٹے موٹے گھر میں کام بچ سکتے ہیں، اس سب میں مصروف رہتی ہوں، کبھی کبھی لگتا ہے دن کی مشینی رفتار میں اگر نماز نہ ہو تو انسان خود کو اپنی ذات کو اپنی روح کو کیسے سیراب کرے، مجھے نماز یہ یاد دلاتی ہے کہ سب سے اہم ذمہ داری تو میری اللہ سے ملاقات ہے، جو مجھے تھکاتی نہیں بلکہ نیا حوصلہ دیتی ہے۔

رات نو کے بعد جب بچی سو جاتی ہے، میں پھر اگلے دن کی تیاری کرتی ہوں، تھیسس کا کام، کچھ دیر جنرل فزکس، یا پھر آن لائن دوستوں سے رابطہ یا پھر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ۔

میری زندگی میں ٹی وی اور موویز کا بہت کم وقت ہے، لیکن ان کے لیے بھی وقت نکال لیتی ہوں، موسیقی سے کافی لگاؤ ہے جو کام کرتے ہوئے چلتا ہی جاتا ہے۔

کہانیاں جو لکھنا ہیں بہت سی ہیں، زیادہ ذہن کے کونے میں، کچھ خاکے بنائے ہوئے کاغذوں پر اپنی ڈگری کے سلسلے سے فارغ ہو کر ارادہ تو یہی ہے کہ بہت لکھنا ہے، کتاب تین کتابیں چھپوانی ہے، اگر زندگی نے ساتھ دیا، پلاننگ تو بہت ہے مگر بہترین پلانز تو وہ ہے اس کا حکم ہوا تو آپ کی محفل میں آنا جانا لگا رہے گا۔

آج ان سب قارئین کو شکریہ کہنا چاہتی ہوں جو مجھے پڑھتے ہیں اور یاد بھی رکھتے ہیں، یقین جانیں بڑا گہرا ربط ہے جو لفظوں کا رشتہ ہے، میں آپ سب کی اور حنا کی بہت و فوزیہ کی بے حد مشکور ہوں، دعا کی طالب ہوں، اگر یاد رہے۔

☆☆☆

یہ ان کی مسکراہٹ اور کراہیں ہی تھیں کہ وہ چونک اٹھا۔ ان کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ بے ساختہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ پازیب اس نے بظاہر لاپروا انداز میں دراز میں پھینک دی تھی۔

"آپا میرے کمرے کی صفائی کروا دیں۔ تمام بے کار اشیاء نکال دیجئے گا۔ تمام بے کار اشیاء...... آپ سمجھ رہی ہیں؟" وہ ان سے نگاہیں چار نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کی آواز صاف اور متوازن تھی، مضبوط تھی۔

"تم کہہ دیتے مجھے بچے کو بلانے لاؤنج کے واسطے ان ہو گئے انتظار کرتے ہوئے۔" انہوں نے بھی خود پہ قابو پا لیا۔ اس تکلیف دہ موضوع کو نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا اب۔

"انتظار تو میں بھی کر رہا ہوں آپا، کچھ اور آپ بھی کر لیں۔" وہ اپنی مطلوبہ فائل اٹھا کر واپس صوفے پہ جا بیٹھا تھا۔ پہلے کی طرح نارمل جیسے مضبوط اور شاندار نظر آتا ہوا۔ بے حد شاندار نظر آتا ہوا سحر طاری کرتا ہوا، طلسم پھونکتا ہوا، کیا شک تھا کہ وہ بہت وجیہہ شاندار تھا۔

"کیا مطلب؟ کیس چل رہا ہے عدالت میں تمہارا؟" وہ تشویش کر سوال کر رہی تھیں۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ انہوں نے اچنبھے، الجھن میں گھر کر اسے دیکھا، گویا سمجھنے سے قاصر رہی ہوں۔

"ابھی چند ماہ میں دوسرے بچے کے دنیا میں آنے میں آپا، اس بات کا فیصلہ تب ہو گا۔" وہ ان کی الجھن محسوس کر کے ہی جواب میں وضاحت دے رہا تھا۔ انہوں نے گہرا سانس بھر لیا۔

"یعنی ایک بچہ تم لے لو گے اور ایک اس کے پاس رہے گا؟"

"ابھی ایسا بھی کچھ طے نہیں ہوا۔ آپا پلیز تھوڑا انتظار کر لیں۔" وہ اب کے ذرا سا جھلا کر بولا تو انہوں نے سر ہلا کر پھر کے تحمل سے سر ہلا دیا۔

"میں کھانے کا پوچھنے آئی تھی اور یہ بھی کہ تمہارے بھائی جان کی طبیعت کچھ ناساز ہے، مجھے جانا پڑے گا۔"

"آپ ضرور چلی جائیں آپا، اور میں کھانا نہیں کھاؤں گا، کافی کا ایک مگ بھجوا دیں، بھائی جان کی خیریت معلوم کرتا ہوں فون پہ۔" وہ فائل میں گم ہو کر بول رہا تھا۔ انہیں عجیب سے دکھ نے آن لیا۔ وہ انہیں خود سے صدیوں کے فاصلے پہ محسوس ہوا۔ حالانکہ جب یہ پیدا ہوا تو اماں کئی ماہ بیمار رہی تھیں۔ اسے انہوں نے ہی پالا تھا اور ایسا پالا تھا ان سے کہ اماں کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی انہی کے ساتھ سوتا رہا۔ جب ان کی شادی ہوئی تو کتنا فساد مچائے رکھا تھا مون نے حالانکہ تب وہ گیارہ سال کا تھا۔ کتنی مشکلوں سے سنبھلا تھا اور آج کتنا بیگانہ سا لگ رہا تھا۔ بچپن سے یا پھر ان کا دل ابہار کھا کر پھر سے اس کرم جلی کو کوسنے سے خود کو نہ روک سکیں۔

☆☆☆

لازم تو نہیں ہے تمہیں آنکھوں سے ہی دیکھیں
کیا تیرا تصور تیرے دیدار سے کم ہے

اس کے ہونٹوں پہ ایک مستقل مسکان کا بسیرا تھا اور آنکھوں میں جیسے جگنوؤں کے قافلے اتر آئے تھے۔ محبت کی جیت اور فتح کا احساس خمار بن کر اسے بے خود کیے دیتا تھا۔ بے وقوف تھی، حالانکہ اس شخص کی آنکھوں میں غرور و نفرت کے شعلے دیکھ چکی تھی۔ جو صرف اسی کے لیے تھے اور کتنے دن تک وہ اس احساس سے نہیں نکل سکی تھی کہ وہ شعلے اس کے آس پاس ابھی بھی بھڑک رہے ہیں اور ان کی تپش، یہ حبس اسے آرام سے رہنے نہیں دیتی تھی مگر اب وہ سب کچھ فراموش کر گئی تھی، بے وقوفی ہی تھی، محبت کی حماقت اور خوش فہمی۔ بے وقوفی ہی کاریں سے مہمانوں کی آمد نے اسے تنگ سے متحرک کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ جو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی، آج خود ملازماؤں کے ساتھ ہلکان ہوئی پورے گھر کو چمکانے میں مصروف تھی۔ ابھی کچن میں جا کر خانساماں کو کھانے کے مینو کے متعلق ہدایات جاری کرنے لگی، مما کا ضبط جواب دے گیا تو اس کے سر پہ آ پہنچیں۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے، کمرے میں آؤ ذرا۔" انہوں نے دانت بھینچ کر کہا۔ ملازموں کے سامنے وہ اس کی جھاڑ جھپاڑ نہیں کر سکتی تھیں بہرحال۔

"رضیہ آپ تمام مصالحے نکالنے میں چاچا کی مدد کریں، جو چیزیں کم ہیں بازار سے منگوا لیں۔ کھانا میں خود بناؤں گی۔" وہ کتنی ذمہ دار، کتنی مطمئن اور خوشحال لگ رہی تھی، مما کا خون جل کر راکھ ہو گیا۔

"کیا سمجھوں میں تمہارے اس انداز و اطوار سے ثانیہ! کہ جو تمہارا باپ گل کھلا چکا ہے، وہ تمہاری ایما پہ کر رہا ہے سب؟ خوش تو تم ایسے ہو رہی ہو جیسے دنیا میں اچھے لڑکوں کا کال پڑ چکا ہو، مجھے تم سے ایسے اوچھے پن کی قطعی امید نہیں تھی بیٹے۔" ان کا انداز غصیلا بھڑکا ہوا تھا اور چوٹ کھائے سانپ کی طرح بل کھاتی تھیں۔ اپنی شکست کا احساس انہیں پاگل کیے دیتا تھا۔ ثانیہ کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا۔ وہ ماں تھیں، انہیں کیسے بتاتی انہیں ایسی بات یا گفتگو اس سے نہیں کرنی چاہیے۔

"آپ کیا چاہتی ہیں مما پاپا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں؟ جانتی ہیں کتنی بدنامی ہو گی ہماری۔" اپنے جذبات چھپا کر اس نے بظاہر عاجزی و انکساری سے انہیں رام کرنا چاہا۔ حبیب کے متعلق اپنے احساسات ان سے چھپائے رکھنا ہی سود مند تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتی تھی۔

"ہاں ہو جاؤ کھڑی، میں ہوں نا تمہارے ساتھ، ویسے بھی کیا یہ تمہارا اسٹینڈرڈ نہیں ہے۔ تم یہ سب زبردستی نہیں کر رہی ہو بیٹے؟" ان کے ایک ایک لفظ میں تپش تھی۔ اکساہٹ اور دباؤ تھا۔ یہ شوہر تھا اور ہر صورت اسے اپنے تابع کر کے ہرانا چاہتی تھیں۔ ثانیہ انہیں متاسفانہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر بولی تھی۔

"آپ کو اختلاف اصل میں کس بات سے ہے مما؟ حبیب سے؟ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں مما وہ اس قابل ہیں کہ ان پہ ان کی دولت پہ فخر کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے انہیں دیکھا نہیں ہے، ایک بار ان سے ملیں تو سہی، سارا اختلاف بھول جائیں گی۔" وہ جذبات کی رو میں بہہ گئی اور مما کو آگ لگا دی، پھر وہ سوچ کر نہیں بولی تھیں۔

"مجھے کسی کو دیکھنے ورکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، میری بیٹی نے جو اسے دیکھ لیا، اس سے مل

لبا اور تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح ظاہر ہو بیٹھ گئی، مجھے سمجھ آ گئی ہے، بلکہ ابھی تو آئی ہے۔" ان کا برہم لہجہ جہالت کی کرختگی و سفاکی کے ساتھ تنی بھی سموئے ہوئے تھا، غانیہ کا رنگ پہلے اڑا پھر یک دم جلا بجھ گیا، شاید نہیں یقیناً اسے ماں سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی، اس کی آنکھیں ایسے جل اٹھیں گویا کسی نے مٹھیاں بھر بھر ان میں مرچیں جھونک دی ہوں، اسے یقین نہ آتا تھا اتنے برے انداز میں اس کی کوتاہی کرنے والی اس کی سگی ماں ہی ہیں، کچھ دیر وہ وہیں کھڑی غم و غصے کی زیادتی سے کانپتی رہی پھر بنا ایک لفظ کہے بغیر پلٹ کر لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے بھاگتی اپنے کمرے میں آ گئی، اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور ہونٹ رقت آمیز انداز میں کانپ رہے تھے، اتنی ہی اس سے بھی کڑوی ذلت اسی محبت کے ہاتھوں اس نے پہلے بھی سہی تھی، اس شخص کی زبان سے، وہ تب بھی ایسے ہی ٹوٹ کر بکھری تھی، وہ اب بھی ایسے ہی بکھر رہی تھی، اس نے مشکل راہوں کا انتخاب کیا تھا، اسے اور جانے کتنی بار کب کب ایسی ذلت سہنی تھی، ایسے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنا تھا، یہ تو آغاز تھا، یہ تو کچھ بھی نہیں تھا، وہ تو غیر تھا، جس نے سنگدل تھا، ایسا کر سکتا تھا، اسے اعتبار تھا، یہ تو ماں تھیں، اس سے محبت کرتی تھیں، انہوں نے ایسا کیسے کر لیا، اپنے ہی بازوؤں میں منہ چھپائے وہ جانے کب تک سسکتی رہی، بے دریغ آنسو بہاتی رہی، ماما نے آج اس کا دل دکھانے کی حد کر دی تھی، اسے یقین نہیں آتا تھا، یقین آ گیا تو صبر نہ آتا تھا۔

اس کے بعد وہ افسردہ کمرے سے نکلی تھی، اس میں ماما کی کٹیلی نظروں کو سہنے و سفاکانہ جملوں کو سہنے کی تاب نہیں تھی، دوپہر کے بعد گاؤں سے تائی جی کی فیملی آن پہنچی، دادی سے لے کر حبیب بھائی کے دونوں بچوں تک، یہ لوگ بہت جوش و خروش اور پھل پھول مٹھائیوں سے لدے پھندے آئے تھے، آنے والوں میں جتنا جوش، خروش، سرخوشی اور والہانہ پن پایا جاتا تھا، ماما کا انداز پاپا کی ہزار ہا کوشش اور سرزنش کے باوجود اسی قدر روکھا، سرد اور رعونت آمیز تھا، نخوت سے بھرا ہوا تھا، پاپا خود ہر کام میں پیش پیش رہے تھے، مہمانوں کے استقبال سے لے کر لوازمات سے چائے پیش کروانے تک، وہ ایک ایک فرد کے آگے جتنا بچھے جا رہے تھے، ماما اسی قدر کانٹوں پہ لوٹی تھیں، جب یہ ضبط تمام ہوا تو ایک جھٹکے سے اٹھیں۔

"غانیہ کہاں ہے چچا جان، نظر نہیں آ رہی۔" کنیز جو بار بار چچی کے طنزیہ سرد مہر برتاؤ سے ابھی خاصی دل برداشتہ تھی، گھبرا کر استفسار کر گئی کہ مسکراتی پھرتی کی نظریں اسے شرمسار کیے جاتی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہے غانیہ، تیار ہو رہی ہوگی، بیٹے آپ خود اس کے پاس چلی جاؤ، وہیں بیٹھ کے مل لو۔"

"بیٹھنے سے نہیں بھاگ رہے۔" سہیل نے لطیف پیرائے میں نکلا جوڑا، پاپا کھلکھلا کر مسکرائے، جبکہ ماما کی پیشانی پہ شکنوں کا جال گہرا ہو کر رہ گیا، کنیز کی نگاہ اتنی تیز تھی، جب ہی دل بجھ اور گھبرا گیا، اس ماحول سے فرار کی غرض سے وہ تیزی سے وہاں سے اٹھ گئی، ملازمہ نے اس کی غانیہ کے کمرے تک رہنمائی کی تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی اس کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا، گھریلو حلیے میں بکھرے بالوں کے ساتھ غانیہ بستر پہ دوزانو بیٹھی تھی، چچی کے بعد اس کا یہ انداز کنیز کی جھجک اور

کرنے کا باعث بن گیا تھا۔

(تو کیا چچی جان کی طرح غانیہ بھی خوش نہیں؟ اس کے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں چاچو؟)
خدشات سے بوجھل دل نے لمحوں میں لاتعداد وہم پال لیے، آہٹ پہ ہی غانیہ نے بے دلی سے گردن موڑی تھی، چوکھٹ پہ کنیز کو ایستادہ پا کر وہ ایک دم جھٹکا کھا کر اٹھی۔

"تم...... تم کب آئیں بھئی؟" اگلے لمحے وہ بستر سے چھلانگ مار کر اتری اور بھاگ کر درمیانی فاصلہ سمیٹتے خود اسے گلے لگا لیا، کنیز کی جانے کب کی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں۔

"یہاں کیوں کھڑی ہیں، ملی نہیں مجھ سے آ کے؟ مجھے تو تمہارے انداز سے لگ رہا تھا جیسے فرار ہونے کا ارادہ ہے۔" غانیہ خود اس کا ہاتھ پکڑے گرمجوشی اور خلوص سے صوفے تک لائی، کنیز مرعوب سی تھی، کھل کر مسکرا بھی نہ سکی۔

"خیر اب تو ہم تمہیں ساتھ لے کر ہی فرار ہوں گے، فکر نہ کرو۔" غانیہ کے اپنائیت آمیز انداز نے اس کا ذرا سا اعتماد بحال ہونے میں مدد دی، جھجک بھی گئی، غانیہ بے تکلف بے تحاشا سرخ پڑ گئی، کنیز نے بہت دلچسپی سے اس کا یہ دلکش رنگین روپ دیکھا تھا۔

"تم خوش تو ہو نا غانیہ؟" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد اہم سوال کرتی کنیز کے لہجے میں خفیف سی لرزش آ گئی تھی، جس میں کوئی انجانا سا خوف ڈولتا تھا، غانیہ کی پلکیں حیا بار انداز میں لرز کر عارضوں پہ جھک گئیں، چہرہ گلابی گلابی ہو کر لو دینے لگا، مگر کچھ توقف سے بولی تو اس کا لہجہ یاس زدہ، دل ملول ہو چکا تھا۔

"مجھ سے کہیں زیادہ، یہ سوال ان کی طرف اہمیت کا حامل ہے، مجھے وہ خوش نہیں لگتے، میں تو اس بات پہ حیران ہوتی ہوں سب...... اتنا اچانک...... وہ بھی شادی۔" اس کا رکتا اٹکتا ہوا لہجہ اس کی چھپی خلجان پکڑتا تھا، کنیز کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تمہارے حسن کا جادو چل گیا ہے بس...... اور کیا۔" کنیز کی شوخی و شرارت کے جواب میں غانیہ نے بوجھل پلکیں اٹھا کر محض اک نظر اسے دیکھا تھا، کچھ بولی نہیں۔

"تمہیں کیا ہماری آمد کی خبر نہیں تھی جو اس حلیے میں نظر آ رہی ہو، سہیل گھبرا رہے گا، ایسے تصور میں ہماری کی تو لاڈلے دیور کو شادی سے اعتراض ہوگا۔" کنیز نے پھر اسے چھیڑا، اب کے وہ واقعی جھینپ گئی تھی۔

"تم رکو...... ابھی تیار ہوتی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئی، کنیز نے اس کی مسکان کو محسوس کیا تھا خوشی کو، دیکھا تھا اور اس کی دائمی خوشی کے لئے دعا گو ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہم تجھ ہی سے ہیں تنہا مگر بارش جیسے
کسی روز ملو ہم سے تمہیں سونا کر دیں

ابھی وہ سو رہی تھی، فون کی بیل اس کی نیم خوابیدہ سماعتوں سے تسلسل سے ٹکرانے کا اثر تھا کہ بالآخر اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے مندی ہوئی آنکھوں سمیت ہاتھ مار کر موبائل فون اٹھانا چاہا، جو جانے کہاں چلا گیا تھا، ابھی چند ماہ قبل پاپا نے اس کی اٹھارویں سالگرہ پہ یہ قیمتی تحفہ دیا تھا۔

"ہیلو۔" فون اس کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس نے بند آنکھوں سے ہی فون کان سے لگایا۔
"ابھی تک سو رہی ہو کاہل لڑکی۔" حفصہ نے اس کی کوتاہی سے آغاز کیا، غانیہ کو خوشگوار احساس نے چھوا، وہ ایک دم مسکرا دی۔
"ہم..... اتنی صبح صبح۔" منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی لیتی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا چکی تھی۔
"بی بی تو آپا ہی کہہ دیا کرو، سات سال بڑی ہوں تم سے۔"
"بچھڑ رہے کو کون کہاں ہے گزرے سے۔" اس کی خوش دلی خوش مزاجی عروج پہ جا پہنچی۔
"بچھڑ تو دینا ہے مگر اس موضوع پہ نہیں۔" حفصہ نے جس انداز میں ٹوکا وہ از خود سمجھ گئی تھی، آگے وہ کیا کہنے والی ہے، یوں جب ہوئی کو با اجازت دے دی ہو، کہہ ڈالو جو کہنا ہے۔
"مما کو اتنا خفا کر دیا تم نے غانیہ، میرے خیال میں تم نے عقل کا کوئی کام کیا بھی نہیں ہے۔" مما کی طرح حفصہ بھی اسے بالکل خوش نہیں لگی۔
"تو بہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟" اسے اس چپ نے تاؤ دلایا، غانیہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
"اس میں میرا کہاں قصور نکلتا ہے، یہ شادی بابا نے طے کی ہے۔" وہ عاجز ہو کر بولی تو حفصہ نے فوراً ٹوک دیا۔
"خیر اب اتنی بھی معصوم نہ بنو تم، مما بتا رہی تھیں تمہاری ذاتی انوالومنٹ بھی ہے اس بندے میں کیا نام ہے اس کا؟" حفصہ نے الجھن آمیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی، غانیہ نے ہونٹوں کو باہم بھینچا، مما یہ کریں گی وہ جانتی تھی، پھر بھی جانے کیوں دکھ ہوا تھا، حفصہ نے بھی اس خاموشی کو محسوس کر لیا۔
"تم مائنڈ نہ کرو غانیہ، دیکھو ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے، زندگی تمہیں ہی گزارنی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے تمہاری منتخب کردہ یہ زندگی کچھ اتنی سہل نہ ہوگی جس کی تم عادی ہو، بالفرض وہ بندہ تمہیں خالی خولی محبت دے بھی دے، تو آسائشات کے بغیر محبت بھی پھیکی لگتی ہے۔"
"تم کب تک آؤ گی حفصہ آپی، بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔" وہ بولی تو اس کی بھیگی آواز میں گھبراہٹ اتر رہی تھی، حفصہ کو یکدم چپ لگ گئی تھی۔
"مجھے کل ہی مما نے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کا بتایا، ابھی ایک ماہ ہے، پریشان نہ ہو، ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل آ جاؤں گی۔" حفصہ کا انداز کسی قسم کی خوشی و مسرت سے مبرا اکھڑا اکھڑا اس کا دل رکھنے والا تھا اور غانیہ کا دل جب رہا تھا، وہ رو رہا تھا، چاہتیں یہ کیسا بندھن بندھنے جا رہا تھا جس میں دلوں کی خوشی کا رنگ کسی بھی زاویے سے نہیں جھلکتا تھا۔
"عمر سب سے زیادہ خوش ہو رہا ہے تمہاری شادی کا سن کر، کل عامر سے کہہ رہا تھا، پاپا میں خالہ کے لئے ساڑھی اور چوڑیاں لوں گا، اس کی نظر میں وہ مما سے زیادہ پریٹی لگیں گی، پتا تو ہے تمہیں میرا بچہ شروع سے تم سے زیادہ امپریس ہے۔" حفصہ کا موڈ بدل گیا تھا جیسے مسکرانے وہ اسے عمر کی باتیں سنانے لگی تھی، فون بند ہوا تو غانیہ نے بے دلی سے موبائل رکھ دیا، اس سے پہلے کہ اٹھ کر واش روم میں جاتی، فون زور و شور سے بجنے لگا، اس بار کال لینڈ لائن پہ آ رہی تھی، اس نے گہرا

سانس بھر کے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔
"السلام علیکم!" اس نے عادت کے مطابق سلام کیا تھا، دوسری جانب سے جواب کی بجائے سرد اور کھردرا لہجہ سنائی دیا، جس میں نخوت اور تلخی کی گہری آمیزش تھی۔
"کب سے فون بج رہا ہے آپ کا، دو بار ٹرائی کر چکا ہوں۔"
"دھک۔" غانیہ کا دل بے اختیار اچھل کر حلق میں آ گیا، اس آواز، اس لہجے کو بھی بھلا نہ پہچان پاتی، وہ جو دل و روح کے ایوانوں میں ہر لمحہ گونجتی محسوس ہوا کرتی تھی، اسے یقین نہیں آ سکا، منیب چوہدری اسے کال کر رہا تھا بھلا، یقین آ سکتا تھا وہ جس کی بے مہری لاتعلقی بے نیازی اور ستم گری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا، بھلا وہ کیونکر اسے اتنی اہمیت دینے لگا، لیکن یہ خوش فہمی ظہور میں آ چکی تھی، اسے لگا اس کی پیاسی سماعتیں صدیوں بعد سیراب ہو رہی ہیں۔
"مجھے معلوم نہیں، شاید بابا کہیں فون کر رہی ہوں گی، انہیں معلوم نہیں ہوگا آپ کال کر رہے ہیں ورنہ......" وہ گھبرا کر رہ گئی تھی، بوکھلائی ہوئی خواہ مخواہ کی صفائی پیش کر رہی تھی کہ وہ جھڑک کر کہہ گیا۔
"ورنہ کیا...... نکال دیا آپ کرکے میرا فون ریسیو کر لیتیں؟" اس کا لہجہ گہرا طنز اور تمسخر سمیٹ لایا تھا، غانیہ خفت و خجالت سے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی، کچھ لمحوں کو دونوں کے مابین گہری خاموشی تن گئی، جسے منیب کی سرد و سپاٹ آواز نے توڑا۔
"مس غانیہ جمال مجھے آپ سے ضروری بات کرنی پڑ گئی ہے، کل آپ مجھ سے ملنے آ رہی ہیں۔" وہ گزارش نہیں کر رہا تھا کہ وہ قبولیت یا رد کرنے کا حق محفوظ رکھتی، وہ آرڈر کر رہا تھا، حکم دے رہا تھا، وہ ششدر رہ گئی، آرڈر پہ نہیں، وہ حق رکھتا تھا حکم دے سکتا تھا، وہ حق تو تھا، جو اس سے جو دل چاہے سلوک کر سکتا تھا، اسے اختلاف اس آرڈر کی نوعیت پہ ہوا، ماما اور وہ بھی باہر، منیب جس کافی شاپ کا نام لے رہا تھا، وہ غانیہ کے کالج کے پاس تھا۔
"آ..... آپ..... گھر آ جائیے، جو بھی بات....." اس نے ہکلا کر گھبرا کہا مگر دوسری جانب اس کی گھبراہٹ کو جانے کن معانی میں لیا گیا کہ بھڑک اٹھا، یوں گویا آگ دہک اٹھی ہو۔
"بی بی مشورہ نہیں مانگا آپ سے میں نے، مشورہ اتنی بیہودہ ہی جتنی اس وقت ظاہر کر رہی ہیں خود کو، کل یاد رہے آپ کو ہر صورت وہاں ہونا چاہیے۔" اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ ہوئی، اگلے لمحے سلسلہ کٹ گیا، وہ اسی شعلہ بار و اہانت آمیز انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس مرد اس کی معمولی جسارت پہ بگڑ گئی تھی، ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا اور رنگت تانبے کی مانند ہو گئی، چہرے سے حجاب نکل رہی تھی، ابھی کچھ دیر قبل جب اس کی غیر متوقع طور پہ آواز سنی، کتنی خوش فہمیاں پال بیٹھا تھا دل، مگر حقیقت خوش گمانی سے بہت برے، بہت سفاک اور کریہہ ہوا کرتی ہے، اس پہ پھر منکشف ہوا تھا، بے مائیگی کا شدید اور رگوں کو کاٹتا احساس اس کے وجود میں اپنے وحشی پنجے گاڑے جا رہا تھا، ریسیور ہاتھ سے رکھ کر اس نے بے دھیانی میں چہرہ چھپایا تو پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، ایک سرد آہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی، اب وہ یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جاتی تھی، فون پہ یوں عزت افزائی کرنے والا ملاقات میں ستم کے کیا انداز اپنائے گا اور ماما کیوں

جاہتا تھا، ظاہر ہے اس کی دید کی چاہ میں تو مرا نہیں جاتا تھا، وہ جتنا سوچتی اس قدر وہ پریشان اسی حد تک بکھری ہوئی جاتی تھی۔

☆☆☆

کورٹ سے نکلتے گیارہ بج گئے۔ آج اس کے ایک کیس کی ہی سماعت تھی وہ بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ ہو رہا تھا، غصے سے، تنگی سے، یہی سرخ رنگ اس کی آنکھوں کے نقوش کو مزید گہرا اور آتشہ کر رہا تھا۔ عدالت کے مرکزی گیٹ پہ آج معمول سے بھی زیادہ رش تھا، کسی سیاسی لیڈر کے کیس کی سماعت تھی۔ گاڑیوں کی یہ قطار، پی پی پروٹوکول کا حصہ تھیں وہ گیٹ سے آگے سڑک تک دور تک پیدل چلا، اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو بیگ میں منتقل نہیں کیا تھا، اس سے اس کی ذہنی الجھن و انتشار کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیوروں کی ان پکاروں پہ بھی کان نہیں دھرا تھا جو اس کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے وہاں میں بھی کی کر رہے تھے۔ اس کی ذہنی حالت دہی خاصی معمول سے ہٹ کر تھی۔ اس کے اعصاب پہ فانیہ جمال سوار تھی، کسی آسیب کی طرح، وہ اتنا تنگ پڑا ہوا تھا کہ بس نہ چلتا تھا کسی بھی طریقے سے اس سے نجات حاصل کرے۔

ہاں یہ بھی نجات حاصل کرنے کا ہی ایک طریقہ تھا، جو اس نے اس لڑکی کی نفرت کی انتہا پہ جا کے سوچا تھا۔ اس سے ملنے کا اصل مقصد ہی اس سے دائمی نجات تھا۔ اس نے ان گزرنے والے چند دنوں میں ہی اپنی متدرج ذہنی حالت کے باعث جانا تھا وہ اس لڑکی کو اماں کی خاطر بھی قبول کرنے سے قاصر ہے، دکھ نہیں اس کے انکار سے ہوا تھا اماں، اگر وہ لڑکی یہ کام کرتی تو صاحب بھی مر جاتا اور لالی بھی سلامت رہتی۔

(تم جیسی بھی نفس کے تابع کسی فانیہ جمال، اتنی انا تو رکھتی ہوگی کہ میں اتنی نفرت سے تمہیں ٹھکراؤں اور تب بھی تم اس بندھن کو باندھنے پہ قائم رہو۔)

اس کی رگ رگ میں تشنر بہ رہا تھا، اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہ تھی، کہ دوسری مرتبہ بھی خود کو اک تجربے کی بھٹی میں گزارتا، خود کو اک نئی قربانی کے لئے تیار کرتا۔

قریب سے شور مچاتی گزرتی ٹیکسی کو اس نے ہاتھ دے کر روکا اور ڈیل پہ بھی سمجھا کر خود پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی منزل کی جانب رخ کر کے فی فراٹے بھرنے لگی تو اس نے اپنا بریف کیس گود میں رکھتے ہوئے اک بار پھر گھڑی پہ بندگی سٹور ڈائل کی رسٹ واچ پہ نگاہ کی، گیارہ بج کر پچپن منٹ ہو چکے تھے، یعنی وہ پون گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا، ابھی مزید اسے آدھا گھنٹہ لگ جانا تھا، یہ ممکن تھا، وہ اس کا انتظار کر کے واپس لوٹ جائے، اسے اک بے بسی کے احساس نے گھیرا۔

"کیا وہ آ جائے گی یوں مجھ سے ملنے؟" اک اور بے معنی سوچ ذہن کے گوشے سے اٹھی اور چہرے پہ تفکر کی صورت پھیل گئی، بارہ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے، جب وہ کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے باہر آیا، والٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے اس نے گردن موڑ کر کافی شاپ کے شیشے کے بند دروازے کو دیکھا، قدم بڑھاتا ہوا اندر سے اندر داخل ہو رہا، ہنوز ذہنی خلفشار کا شکار نظر آتا

تھا، اس کی ذہین نگاہ نے لمحے کے ہزارویں حصے میں ہال میں موجود تمام چہروں کا جائزہ لے لیا، اسے اپنے اعصاب کھنچتے محسوس ہوئے تھے، فانیہ اسے وہاں کہیں نظر نہیں آ سکی، قدم بڑھا کر اک خالی میز کی جانب آتے اس نے بدمزگی کی کیفیت میں اپنا بریف کیس میز پہ پھینکا اور خود کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"گڈ نون سر! کیا پسند کریں گے آپ؟" مستعد ویٹر لپک کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا، منیب نے اس کی جانب نہیں دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ دیر بعد آنے کا اشارہ کیا تھا۔

(اگر تم نکلی نہیں تو اپنے حق میں مزید برا کرو گی فانیہ جمال......) ہونٹ بھینچے وہ اس کے تصور پہ غرایا اور پھندے کی مانند گلے میں جھولتی ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا۔

"السلام علیکم!...... م...... میں کب سے ویٹ کر رہی تھی آپ کا؟" معاً اس نے اپنی داہنی جانب اس کی نازک مہین آواز سنی تھی، اک خاصی گھبراہٹ کا احساس لئے، جس میں گریز بھی تھا، جھجک بھی، خوف بھی تھا، اضطراب بھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ منیب کو اس کی آواز سن کر غصہ آنے کی بجائے قدرے سکون کا احساس ہوا، حالانکہ یہ آواز یہ لہجہ اس کا سب سے ناپسندیدہ تھا کوئی شک نہیں، اس کے باوجود اس نے اس کی جانب دیکھنے اس کی جانب رخ کرنے میں قطعی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا، پہلے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکالا، پھر سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ کھینچ کر ہونٹوں کے درمیان رکھتے لائٹر سے شعلہ دکھا کر لائٹر کو جیب میں اڑستے دھواں بکھرتے اس نے نگاہ کا زاویہ بدلا تھا، سیاہ چادر میں سر تک آئی جنگلی لمبی پلکوں کے ساتھ خفیف سا کانپتی وہ اس کے سامنے تھی، منیب چوہدری کی اسے دیکھتی نظروں میں صرف تمسخر ہی نہیں ابھرا، سلگن اور تضحیک بھی گہری ہوتی چلی گئی۔

"تشریف رکھیے۔" سگریٹ ہونٹوں سے انگلیوں کی گرفت میں منتقل کرتے اس کا زہر میں بجھا ہوا لہجہ گونجا، نگاہ لمحہ بھر کو اس کے سفید ہاتھ کی نازک مومی انگلیوں پہ ٹھہری، جو ہینڈ بیگ کے اسٹریپ پہ لرزاں تھیں، غالباً ایسے فی الفور تیمی کو باہر اس کے اس حکم کی منتظر تھی وہ، جنگلی نظروں سمیت کرسی پہ ہمہ تن گوش نظر آنے لگی، منیب چوہدری کی نگاہوں کا تمسخر مزید بڑھا، کتنے روپ تھے اس لڑکی کے، اپنے گناہ چھپانے کے کتنے طریقے جانتی تھی، اس کی سوچوں پہ مزید نفرت کی پھوار برسنے لگی، فانیہ کا معصومیت سے بھرا گھبرایا ہوا چہرہ اسے دنیا کا مکار ترین چہرہ نظر آ رہا تھا۔

"آ...... آ...... آپ نے کیوں بلوایا ہے مجھے؟" اس کی جھلسا دینے والی راکھ کر ڈالنے والی نظروں کا ہی کمال تھا کہ فانیہ اس قدر جزبز ہو کر کہہ گئی تھی، اس طرح بلوا کر پھر خاموشی اوڑھ لینا، نظروں سے زدوکوب کرنا تو اخلاقیات کے زمرے میں نہیں آتا تھا، وہ کمزور بزدل تو نہیں تھی، مگر جس طرح پلیز ہو کر رہ گئی تھی وہ یہ بتانے کو امر ضرور تھا، ایسے میں کسی کو بھی باخبر کیے بغیر وہ اس شخص سے ملنے آ گئی تو یہ بعید کھل جانے پہ، اس کے کہنے لئے بے اسکی نہیں، یہ فانیہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا، مگر اس شخص کے حکم سے سرتابی بھی تو محال نہیں تھی، پھر کیا کرتی وہ بھلا۔

"بے فکر رہیے محترمہ! آپ کے حسن باخبر کے نظارے کی چاہ میں نہیں دی آپ کو یہ زحمت، بہرحال اتنا اندازہ تو آپ بھی بخوبی کر پائی ہوں گی کہ میرا شمار ایسے احمقوں میں نہیں ہوتا۔"

کوشش سے لہجے کو بشاش بنایا، مگر پپا کی تسلی کرانے میں ناکام رہی۔

"منیب بہت ڈیسنٹ اور شاندار لڑکا ہے بیٹے! اس کی پہلی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی، پتا نہیں کیوں مجھے لگا میری بیٹی بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ، جبھی آپ سے پوچھے بغیر یہ شادی طے کر دی، آپ کی مما کے خدشات بالکل بے جا ہیں، منیب کو فیملی پرابلم کا سامنا نہیں ہے، وہ ویل سیٹلڈ ہے، آپ کو بہترین لائف اسٹائل دے سکتا ہے، اس کا بیٹا بھی بہت کیوٹ بہت فرمانبردار قسم کا بچہ ہے، میرا نہیں خیال آپ کو کسی بھی لحاظ سے پرابلم ہو سکتی ہیں، اس کے باوجود بیٹے، اگر آپ کو معمولی سا بھی اعتراض ہے تو مجھے بتا دیجیے، میں بھائی جان سے معذرت کر لیتا ہوں، یہ بات طے ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کی مرضی، خوشی سے بڑھ کر اور کچھ اہم نہیں۔"

غانیہ جس نے ان کی بات کے آغاز میں ہونٹ بھینچ لیے تھے، ان کی اضطراب بھری خاموشی جان کے ہاتھ تھام لیے نم آنکھوں سے لگائے اور جھک کر بوسہ ثبت کیا۔

"پپا آپ ایسا خیال نہ کریں کہ میں خوش نہیں ہوں، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، آپ نے بالکل ٹھیک سوچا، مجھے منیب سے ان شاء اللہ کوئی شکایت نہیں ہو گی اور حمدان... وہ واقعی بہت معصوم اور بے ریا بچہ ہے، جس سے صرف پیار کیا جا سکتا ہے، آپ پریشان نہ ہوں میں ہرگز بھی خود پر کسی قسم کا جبر نہیں کر رہی۔" اس نے پوری جان لگا دی تھی انہیں مطمئن کرنے کو اور وہ ہو بھی گئے تھے، مگر اک آخری کانٹا چبھا رہ گیا تھا جو نکال لینا چاہتے تھے۔

"تو پھر یہ اداسی، یہ خاموشی اور کنارہ کشی کیوں؟ آپ کی مما کا خیال ہے آپ خوش نہیں ہو۔"

اس سوال پر غانیہ کسی طرح بھی خود پہ قابو نہ رکھ سکی، بے ساختہ سسک اٹھی۔

"میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں پپا، ان کی ناخوشی کا احساس دہنا مجبور ہے کہ مجھے مکمل کر خوش نہیں ہونے دیتا۔" اور جس کے باعث مجبور مما کہ جمال کس طرح اسے فوکس کرتے ہیں، پروا نہ سے لگ کر ساری گفتگو سنتیں ایک دم اپنے حوصلوں کو پست ہوتا محسوس کر کے پیچھے ہٹ گئیں، انہوں نے جانا وہ جتنی بھی ناخوش سہی مگر اب اپنی بیٹی کی خاطر ضرور یہ کمپرومائز کریں گی، کچھ کہے بغیر وہ اسی خاموشی سے پیچھے ہٹ گئیں۔

اگلی صبح انہوں نے ہتھیار باقاعدہ ڈالتے ہوئے پپا کے سامنے کچھ شرائط رکھی تھی۔

"غانیہ کی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں بطور داماد منیب کو قبول کر رہی ہوں، مگر میری ایک شرط ضرور ہے، آپ منیب کو شہر میں سیٹل ہونے میں فیملی ہیلپ کریں گے جمال، ہماری بیٹی گاؤں میں نہیں رہے گی، یہ بات طے ہے، بہتر ہو گا آپ ابھی منیب سے بات کلیئر کر لیں۔"

ان کا انداز یہ بات کرنے کا بھی مخصوص تھا، خود پسند، خود پرست اور کسی حد تک متکبرانہ، پپا قدرے جزبز ہوئے، اگر انہیں مما کا انداز پسند نہیں آیا تھا تو منیب کو تو سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا قابل قبول ہوتا، جبھی وہ باقاعدہ کھنکھارے۔

"منیب اس قسم کا لڑکا نہیں ہے بیگم صاحبہ! ایسی بات اس کے سامنے غلطی سے کر بھی نہ دیجیے گا کبھی، یہ تو ویسے بھی سید عباس جیسے غیرت دار شخص کی انا پر حملہ کرنے والی بات ہو گی، ویسے بھی ہمارے کہنے کی کیا ضرورت ہے، اسے خود معلوم ہے یہ سب، اگر وہ اپنے بیٹے کو بہترین تعلیم اور

ماحول دے سکتا ہے تو بیٹی اور ہونے والی اولاد کو کیوں نہیں دے گا، اس معاملے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، ہم اپنی بیٹی دے رہے ہیں اسے، آپ نہیں کر سکتے تو میں خود کر دوں گی یہ بات۔" مما کی سوئی اسی جگہ پہ اٹکی تھی، پپا تحت نالاں و عاجز نظر آنے وہاں سے اٹھے، مما کچھ سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

"خالہ جانی!" غانیہ کچھ دیر قبل ہی نہا کر نکلی تھی، اب ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی بال سلجھا رہی تھی، اس شگفتہ زندگی سے بھرپور آواز پہ قدرے چونکتے بے اختیار گردن موڑی، بلیو اور پنک گرم اونی سوٹ میں عمر دروازے میں کھڑا مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"خالہ کی جان! آؤ ناں۔" مسکراہٹ بکھیر کر اس نے بے ساختہ جھک کر کھینچے دونوں بازو پھیلا دیے، وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس کے بازوؤں میں سما گیا تھا، پھر بہت پیارے انداز میں چٹا چٹ اس کے گال چومے۔

"بھلا کیا لے کر آیا ہوں میں آپ کے لیے؟" روشن چمکتی شریر آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ سوال داغ رہا تھا، غانیہ نے لاعلمی کے اظہار کے طور پہ شانے اچکا کر مسکراہٹ دبائی، مقصد اسے تنگ کرنا تھا۔

"گیس کریں ناں۔" وہ مچل گیا، غانیہ مصنوعیت کے ناز سمیت آنکھیں پٹپٹانے لگی۔

"سائز کی؟"

"اوں ہوں۔" عمر نے فی الفور رد کیا، غانیہ ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کے سوچنے کی اداکاری کرنے لگی۔

"جینگرز؟"

"لو...... نیور۔" عمر ہنسا اور ہاتھ سے مزید سوچنے کا گیس کرنے کا اشارہ کیا۔

"آہاں...... کمپیوٹر...... ہے ناں؟" وہ چہکی اور اسے گدگدایا، عمر ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

"سائزی اور جینگرز تو مما نے لانے تھے، میں لیپ ٹاپ تو لانا، ہے ناں؟" وہ کتنا خوش تھا، غانیہ نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا، عمر اس کا ہاتھ پکڑے لاؤنج میں سب کے درمیان لے آیا، جہاں فضہ اور عامر بھائی کے علاوہ اسد بھائی بھی موجود تھے، بڑے بڑے سوٹ کیس کھلے ہوئے تھے اور ڈھیروں قیمتی اشیا برآمد ہو رہی تھیں، وہ باری باری سب سے ملی۔

"آتے ہی پھیلاوا بکھیر کر بیٹھ گئیں۔"

"سب تمہاری شادی کی تیاریاں ہیں جناب۔" فضہ نے اسے دیکھ کر آنکھ ماری، وہ بلش ہوئی تھی بے ساختہ۔

"مما خالہ جانی کو پہلے میرا گفٹ دکھائیں، یعنی لیپ ٹاپ۔" عمر نے شور ڈال دیا تھا، پھر وہ کتنے تفاخر سے کمپیوٹر دکھاتے ہوئے اسی وقت اس کی افادیت و آپریٹ کرنے کے طریقے بتانے

گیا۔

"تمہارا بیٹا بڑا ہو کر افلاطون کو بھی مات دے گا دیکھ لینا۔" اسعد بھائی نے ہنستے ہوئے نعد کو چھیڑا۔

"ماشاءاللہ بہت جینئس ہے۔" مما عمر کے واری صدقے ہونے لگیں۔

"مبارک ہو مما! ابا جی! اک پاپا پایا اک دو نواسا مفت میں مل گیا جیسے بنا رہے آپ کو۔" نعد نے اب کی بار غانیہ کو دیکھتے ٹکڑا لگایا، اسنار وغیب کے بیٹے حمدان کی جانب تھا، جہاں غانیہ کے چہرے پہ رنگ اترے وہاں مما کا چہرہ بھی متغیر ہوا تھا۔

"خالہ جانی! آپ کی شادی جن سے ہو رہی ہے وہ انکل کیسے ہیں؟" عمر کو جانے کیا سوجھی سوال داغ دیا، جہاں غانیہ گڑبڑائی وہ نعد کے قہقہے چھت اڑانے لگے۔

"چلو بتاؤ اسے اب، کیسے ہیں وہ حضرت؟" وہ صاف صاف اسے چھیڑ رہی تھی، غانیہ گلابی پڑتی گئی۔

"بتا نہیں نا خالہ، آپ کی طرح ہیں، ہالوگ کیرنگ اینڈ نیس ٹیک؟" عمر کے سوالوں پہ وہ عاجز ہی نہیں جز بز بھی ہونے لگی، سب سے نظریں چرائی وہ اس پل کچھ شرمائی کچھ جھینپی کتنا پیارا روپ سمیٹ لائی تھی۔

"بیٹے شادی پہ آئیں گے نا وہ، آپ تب دیکھ لینا۔" عامر بھائی نے غانیہ کی جان بخشی کرانا چاہی جو ہو کر نہ دی۔

"کیوں؟ خالہ جانی نے انہیں نہیں دیکھا؟ ان کے پاس ان کی فوٹو بھی نہیں ہے؟ بابا مجھے آنٹی کی جب شادی ہونے والی تھی تو ان کے پاس اپنے دولہا کی اتنی ساری اسنیپس بھی تھی اور دولہا ان سے اتنی بار ملنے بھی آئے تھے، کیا خالہ کے دولہا ان سے ملنے نہیں آئے؟ اور ان کی اسنیپس بھی نہیں خالہ کے پاس؟" وہ کتنا حیران ہو کر سوال پہ سوال کر رہا تھا، غانیہ کا چہرہ ایک دم جانے کس کس احساس کے تحت لو دینے لگا، جبکہ نعد نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

"وہ مجیہ آنٹی تھیں اور یہ خالہ ہیں بیٹے، وہ امریکہ جبکہ یہ پاکستان ہے، اتنا فرق تو بنتا ہے نا پھر؟" نعد نے سمجھانا چاہا، مگر وہ الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گیا۔

"نہیں بڑا مما جان، شادی تو شادی ہوتی ہے نا۔" وہ زچ ہوا، نعد نے کاندھے اچکا دیے۔

"تو ٹھیک ہے بیٹے! آپ خالہ سے فرمائش کرو وہ شادی سے پہلے دولہا کو یہاں بلوا لیں تاکہ صاحب بہادر ان کا دیدار خاص کر سکیں۔" نعد نے نعرہ جناور بادہ گویا جان چھڑائی، جبکہ عامر بھائی اور اسعد ہنس دیے، خود غانیہ بھاری دل لئے وہاں سے اٹھ گئی، مما کی خاموش متفکر نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

رنگین نے اسے سڑک کنارے اتارا اور ہارن بجاتی نہر کے پل کو پار کرتی دائیں جانب مڑ گئی، اس نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور اڑے پہ موجود اکڑ نے تانگے پہ آ بیٹھا، اس کے بوجھ سے تانگہ پیچھے کی جانب جھول گیا، گھوڑے کے زور سے ہنہنانے پہ بیں اگلی سیٹ پہ مسافر چڑھا لے

رنگ کا بیوا کوچوان بھی ہڑ بڑا کر نیند سے جاگا۔

"اوہو...... وکیل بابو صاحب۔" کوچوان اسے اچھی طرح پہچانتا تھا، اچھی سلام دعا بھی ہو مگر آج وکیل صاحب کی آنکھوں میں کوئی پہچان کا رنگ نہیں تھا، جبھی اکتایا ہوا سا خاموشی سے کھیتوں میں جھولی سرسوں کو دیکھتا رہا، تانگہ کچے پکے راستوں پہ ہچکولے کھاتا آگے بڑھنے لگا، کھیتوں کے بعد کچے پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اونچی نیچی گلیاں دھول اڑاتے راستے جگالی کرتی گائے بھینسیں، نیم وا آنکھوں سے آنے والوں کو دیکھتی تھیں اور ایک دوسرے بلا بلا کر گھیاں اڑاتی تھیں، گاؤں کا واحد بازار یہاں اسکول چھوٹی چھوٹی دکانیں کو بہ کھوپی ہیرونی دیواروں کی لپائی کرتی عورتیں، چادر و کاٹ کر حقہ سر پہ اٹھائے مرد گھروں کے سامنے چارپائیوں پہ حقہ گڑگڑاتے بوڑھے، گاؤں کا اکلوتا ڈسپنسر اور اس کے سامنے کھڑے بے فکرے نوجوان بیلے بہولیوں کی تازگی باغوں اور کھیتوں کی دلکشی گاؤں کے لیے سے میٹرک کے راستوں میں دھول ہوتی جاتی تھی، وہ جائزہ مکمل کرتا وہ گڑ واہت بھری مسکان لبوں پہ سجا لایا۔

(تو یہ ہے تمہارا انتخاب تمہارا نصیب غانیہ جمال، جس کے حصول کی خاطر مری جاتی ہو تم، اتنے اونچے اونچے دعوے کیے تھے تو مشکل تو کانوں کی وجہ خود اپنا دشمن ہو اس سے کون ہمدردی کرے اور ہمدردی تو مظلوموں سے کی جاتی ہے، مجرم نہیں ہو بہر حال۔)

"وغیب...... ادھر آ۔" گھر میں داخل ہوتے ہی وہ حسب معمول کسی سے کلام کیے بنا سیدھا دوا بنے کمرے کا رخ کر چکا تھا، جب صحن میں دو اڑے کر ٹیوں پہ روشن کرتے چچیرے نے تیل کے سر پہ کھڑے مسلسل تکنتی کرتے جھڑکتے ہوئے تازگی نے اس پہ نگاہ پڑتے ہی اپنے مخصوص رعب دار اور روبیک آواز میں اسے پکارا اور وہ گہرا سانس بھرتا وہیں تھم کر ڈور دیکھنے لگا۔

"وہاں میں تم کے دن رہ گئے ہیں، آخر تو کالے کو کب لے کر آئے گا بیاہ کر؟" ان کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ رہی تھیں، آج کل ان کا مزاج دیسے ہی سوا تیز رہتا تھا، مگر ان سے بات کرتے نحوست مزید کی گمار بڑھ جاتا، وغیب نے بے ساختہ ہونٹوں کو باہم بھینچا، انہیں یہ بتا کر وہ طوفان نہیں اٹھوانا چاہتا تھا کہ اس کا ارادہ بجے کو لانے کا نہیں تھا، باپ کی شادی تما جا شہ ہو بچے کا کوئی کام تھا بھی نہیں، لیکن ان باتوں کو یہ لوگ کہاں سمجھتے خود سمجھ ہی نہ سکے تھے۔

"بولتا نہیں ہے لوٹے تو بچہ؟ باپ کو کیا سمجھا ہوا ہے کہ بھونکتا ہے تو بھونکتا رہے۔" حسب عادت وہ آپے سے باہر ہوتے خود اپنے آپ کو ہی کوسنے لگے، ایک تو یہ وغیب ان روایات سے بہت چڑتا تھا جو ساتھ بزرگ اولاد کو مجبور کرنے یا بلیک میل کرنے کو نشانہ بنا لیا کرتے تھے، کبھی اپنے آپ کو بد دعائیں دے کر تو کبھی خود کو اپنا او بچا کر اولاد کو اپنے حق میں ہموار کرنے والے شاید اولاد کی مجبوریوں کا ان کے دل کے درد کا بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا اور بے بس لاچار کھڑا تھا سہیل نے دور تک بے تحفظے ہاتھوں سے بندش رکھ کر غائبی رشتہ جنوں نگار بھائی پہ ڈالی، وہ جس کے چہرے پہ بے بسی جھلکتی تھی اور مٹی کے تیل کی بوتل کا ڈھکن کھول کر دور کونے میں تیل ملانے لگا، فضا میں تازہ روغن کی بھیگی باس میں مٹی کے تیل کی بو بھی شامل ہونے لگی۔

"ایک ماہ پہلے لے آؤں گا، پڑھائی کا حرج ہو گا اس لئے جلدی نہیں کی۔" ضبط کے گھونٹ

پھر سے اس نے نارمل انداز میں جواب دے کر جان چھڑائی، ورنہ اس سے کچھ بعید نہ تھا اسے مزید ذلیل کر کے رکھ دیتے۔ ابھی ان کا بگڑا موڈ کہاں بحال ہوا تھا جبھی تو پھر بلا جھٹکا ابھرا۔

"ذرا سی گل اپنے بڑھاپے کو افسر پہ خرچ کی؟" انہوں نے چائے لے کر آئی اماں کو مخاطب کر کے تلخی سے کہا۔

"بڑا اس کا نخرہ وڑی سی لگ رہا ہے جو اس کا حرج ہوگا، ارے سارے سے وڑا دے جانتا ہوں میں اس کے، یہ وہاں اس کا بھی دھندا، چاہوں اگر یہ کاکے کو لے کر نہ آیا تو چیخ نہیں نہ دے گی، اس وقت تک۔" اماں سے چائے کی پیالی لے کر چائے کا لمبا سڑکا لگانے نے رنجیدگی آمیز انداز میں گویا منیب کو ہی سنایا تھا انہوں نے، جو کان لپیٹے کمرے میں جا گھسا تھا۔ ابا کی مہربانی سے فائدہ اٹھا کر جو انہوں نے بہرحال اس وقت اپنی آنے والی بہو کے اعزاز میں کی تھی، انجینئر ہاتھ سے نہا کر نکلا تو اماں کو اپنی پھیلائی چیزیں سمیٹتے پا کر شرمسار سا ہوا۔

"چھوڑ دیں اماں، میں خود کر لوں گا۔" اس نے بے اختیار بڑھ کر اماں کے ہاتھ سے اپنے جوتے اور موزے لینے چاہے تو اماں مسکرانے لگیں۔

"چلا ہے تو ری بالکل ہی سینے، بھلا رہی ہے بھی کوئی کم سے کم ہے، پھر تیری صلاح چند دنوں میں تیری دلہن آجائے گی تو وہ آپ ہی خیال رکھ لیا کرے گی تیرا، ایک دری بچھونوں کی نے دوسری گھر لاؤں گی، میرا تو آرام ہی آرام ہے۔" وہ خوش خیال نہیں، مگن تھیں، حالانکہ پہلے ایک بار نہیں دو مرتبہ ڈھی جا چکی تھیں، مگر سادگی کا معصومیت کا وہی عالم تھا۔ منیب کے چہرے پہ گہرا اضطراب چھانے لگا۔

"اتنی خوش فہم کیوں ہیں آخر اماں آپ؟ جبکہ یہ رشتہ ہے بھی نہیں لوگوں کے مزاج میں فرق نظر آتا ہے، اتنی سی بات تو سمجھنی چاہیے آپ کو تا کہ دکھوں میں کچھ تو کمی کا امکان رہے۔" اماں کے سامنے اس نے لہجے کو تلخی و ترشی سے قابو پانے کی بھی کوشش نہیں کی، اماں بچھڑوں کو بہت افسردہ نظر آئیں، اگلے لمحے اس کا چہرہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں لے کر پیار ملتانی نظروں سے اسے دیکھا اور مسکرانے لگیں۔

"کتنی روشن اور چمکتی ہے یہ تیری پیشانی پر، خوش بختی کی علامت نہ سمجھوں تو حماقت ہے، مجھے اللہ سائیں کے انصاف پہ یقین ہے میرے شہزادے، جو ایک دفعہ ہوا، وہ بار بار نہ ہوگا، اگر غائبہ کو بھی طرح نہ سمجھا ہوتا نہ جانا ہوتا تو کبھی تجھ سے اپنے منت نہ کرتی، تو فکر ہی نہ کر اس بار وہی سب چنگا ہوگا میرے شہزادے۔" ان کا یقین کامل تھا، یا سادگی کمال درجے کی تھی، منیب کچھ نہیں کہہ سکا، اس میں ان کا دل توڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

"میں کنزاں سے کہہ آئی ہوں تیری تازی چا کا، بیٹھ تو مجھے گل کرنی ہے ضروری۔" اس کے نم بال سہلاتے ہوئے اماں نے بے حد محبت سے کہتے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا، وہ بچت بڑ چپ سا ہوا، وہ تو جان ہی سکتا تھا اماں کوئی مطالبہ لے کر آئی ہیں، مطالبے کی نوعیت جانے بنا ہی اس کا دل تنگ پڑنے لگا، آج کل ہر معاملہ جو اس کی توجہ کا حامل تھا اس سے گریزاں ہی نہیں وہ بھاگ بھی رہا تھا۔

"اگر پھر اکاکے کو کیوں نہیں لا رہا تو، پھر جب کسی کو خوشی رب نو بھور کہ دے جی، تیرا ابا ہر وقت تیری وجہ سے جلا کڑھتا رہتا ہے، ابا تیرے سے تو کسی کم میں وی حصہ نہیں لیتا، ہنستا مسکراتا تو بڑی رونق ہوندی گل، تیرے ابا کا رعب اور ہر دلے تیری جانب لگا رہتا ہے۔" کہ کہ اماں کا انداز مصالحانہ تھا، اس کے باوجود منیب کا دل غم سے بوجھل ہو کر پھٹنے کے قریب ہونے لگا۔

چند نہیں ہر کوئی اسے ہی کیوں سمجھانے مصالحت پر اکسانے پہ کیوں تلا رہتا تھا آخر، وہ بھی انسان ہے، وہ بھی دل رکھتا ہے، دل بھی زخم خوردہ، وہ کہاں تک، وہ کس حد تک سمجھوتہ کرے، کچھ تو اس پہ اس کا بھی حق تھا، اگر اس نے مجبور اپنوں کی خاطر خود کو وار پہ چڑھا بھی رہا تھا تو اب وہ خوشی کا تاثر دینے کو منہ جاڑ بیٹھا کر لطیفے کیسے لگا لیتا، دل کے زخم چھپا کر خالص مصنوعی کام کر رہا اسے نہیں آتا تھا، ٹوٹے دل کے ساتھ مسکرانا آسان نہیں تھا، وہ کیسے مسکراتا، اسے تو مستقبل کے حوالے سے اٹھائی جانے والی متوقع ہار متوقع ہزیمت ابھی سے کچوکے مارنا شروع کر چکی تھی، وہ ابھی سے جانتا تھا کیا ہوگا آئندہ، اسے معلوم تھا غائبہ اس ماحول اس گھر کو قبول نہیں کر سکتی، مگر یہ بات اس کے سادہ لوح والدین نہیں سمجھ سکتے تھے، کہ ان کی لاڈلی کو محبت ان کے گھر بار سے نہیں ان کے بیٹے کے حسین چہرے سے ہوئی تھی، سجے کمروں سے نہیں چہروں سے ہوتے ہیں، اگر ہوں تو، لیکن یہاں تو ایسا معاملہ بھی نہیں تھا، وہ کوئی دنیا کا آخری حسین مرد تو نہ تھا، اس سے بڑھ کر حسن بکھرا تھا اور حسن کا جادو جہاں سر چڑھ کر بولے وہاں وفاداری کا جذبہ بھی سر اٹھاتا ہے، اکتاہٹ پھر وفاحت جیسے احساس وہاں جاگنے بھی نہیں آتے، وہ جسے محبت سمجھ بیٹھا تھا وہ محبت نہیں تھی، وہ تو عکس تھا، خواہش تھی اور بس...... ایک بار پھر تاریخ اپنا آپ دہرا رہی تھی، اس کا بس چلتا تو اس رخسار کا رخ بدل دیتا، مگر بس ہی تو نہ چلتا تھا، کبھی اسے اپنے خوبرو چہرے سے وحشت ہوتی، اس کے دکھوں کا باعث اگر صرف اس چہرے کو گردانا جاتا تو ایسا کچھ غلط نہ ہوتا، یہی چہرہ ایک بار پھر دل کو داغدار کرنے کا سامان مکمل کر چکا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اسے کچھ کرنے نہیں دیا گیا تھا، وہ کیسے سمجھاتا، وہ خیال کا دوسرا عکس تھی، صرف شکل صورت ہی نہیں انداز و اطوار بھی اس کا پرتو، پھر اس سے الگ طرز عمل کیسے دکھا جاتی، وہ اگر اس کے روبرو ہوتے ہی زہر خند ہو جاتا تھا تو اس میں قصور اس کا نہیں اس لڑکی کا عکس ہوتا تھا، اسے تو اپنا آپ مجروح پرندے جیسا لگنے لگا تھا، جس کے پر کاٹ کر شکاری کے آگے پھینک دیا جائے، اپنی یہی بے بسی اسے وحشت کے الاؤ میں جلاں کر احساس سے دوچار کیا کرتی۔

"کیوں چپ ہو جاتا ہے کمزری، ہنستا بولتا تو بالکل بھول گیا پتر، وہ نگھوڑی خورشیدہ رقعان ہو جاتی کافی نہ تھا، ساتھ تیرے سارے حسین رنگ بھی اڑا کر لے گئی، منیب تیری ہر خوشی اسی کے ساتھ تو نہیں تھی پتر، ہم بھی کچھ لگتے ہیں تیرے، ہمارا بھی حق ہے تجھ پہ۔" اماں روہانسی ہوگئی جانے ہیں اور منیب کو گنج سعتوں میں لگا کسی نے اس کے حلق میں تیز دار خنجر کی نوک چبھو دی ہے، وہ کچھ نہ سکا کہ اس کے سامنے خیال کا تذکرہ نہ کریں وہ نئے سرے سے زخمی ہوتا تھا، اسے اس کا ذکر سننا پسند نہ تھا، اماں محبت کی بات کرتی تھیں، وہ بے قوف خیال سے اتنی نفرت کی یہ نفرت اتنی بڑھ گئی تھی، لیکن زور آور تھی کہ اس کا عکس دکھائی غائبہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گئی تھی۔

"صرف اماں اور بھابھی نہیں اور بھی ہے ہمارے ساتھ۔" کنیز نے عائنہ کے کان میں سرگوشی کی تھی وہ اتنی بلند ضرور تھی کہ ساتھ کھڑے عامر بھائی اور نفیسہ نے بھی سن لی، عائنہ کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا تو رنگت بے تحاشا گلابیاں چھلکانے لگی، وہ جھکی پلکوں کی جھالریں مزید بوجھ سے جھک گئیں۔

"جاؤ اپنی ساس اور جٹھانی کو سلام کر آؤ۔" نفیسہ نے اسے گھورا، کنیز مسکرانے لگی، وہ خود بھی ان لوگوں سے سلام دعا کر رہی تھی۔

"صرف ان سے نہیں، اپنے دولہا سے بھی ملاقات کرنی ہے۔" اس کا انداز شوخی سے بھرپور تھا، عائنہ بے ساختہ سرخ پڑ گئی۔

"کیا واقعی منیب ساتھ ہیں؟" نفیسہ یکدم الرٹ ہوئی، چہرے پہ اشتیاق پھیلا ہوا تھا نظریں یہاں وہاں بھٹکیں۔

"جی وہ ساتھ ہیں مگر ہمیں یہاں چھوڑ کر کسی کام سے گئے ہیں، آتے ہوں گے۔" کنیز نے آخری فقرہ بالخصوص عائنہ کو ہی سنایا تھا، جس کی رنگت کچھ اور دہک اٹھی تھی، تب تک اماں اور بھابھی بھی وہاں پہنچ گئی تھیں، نفیسہ، عامر بھائی اور عائنہ کو تائی اماں نے باری باری ساتھ لگا کر ماتھا چوما، عائنہ کو تو باقاعدہ لپٹا لیا تھا۔

"بہت چنگا ہوا پتر مجھے تو لگی میری دھی، اب اپنی پسند سے گھر سے لے لئے۔" ان کی نظروں میں عائنہ کے لئے کتنی محبت تھی، نفیسہ کو اس محبت و خلوص نے اچھا خاصا مطمئن کیا تھا۔

"آپ گھر آ جاتیں تائی اماں! اکٹھے آ جاتے شاپنگ کر۔" نفیسہ نے بھرپور خلوص کا مظاہرہ کیا، تائی اماں کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزر گیا، اب بھلا انہیں کیا بتاتیں کہ منیب آمادہ نہیں تھا، کیسے دے رہا تھا، ابا جی کے خوف سے ساتھ تو آ گیا تھا مگر مجال ہے جو کسی چیز میں دلچسپی ظاہر کر کے دکھائی ہو۔

"بس پتر کچھ جلدی میں تھے تو......"

"لیں وہ بھی آ گئے ہیں۔" کنیز کے لہجے و انداز میں انوکھا جوش و خروش تھا، فطری سی بات تھی، سب کا یک بیک دھیان ادھر ہوا، منیب اپنے دھیان میں گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہو رہا تھا، بلیک ڈریس میں اس کی بے تحاشا سفید رنگت اور شفاف دیتی والی شخصیت کا طلسمی تاثر گویا پورے ماحول پہ چھا رہا تھا، ہاتھ میں موجود سگریٹ کیس اور لائٹر کوٹ کی جیب میں رکھتے اس نے جیسے ہی نظروں کو اٹھا کر اماں اور کنیز کو کھوجا، اسی سمت متوجہ لاتعداد آنکھوں کی تپش کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا، سب سے پہلی نگاہ اماں کے ساتھ لگی کھڑی عائنہ پہ پڑی اور جیسے اس کے چہرے پہ موجود گمبھیر تاثر میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ہونٹ غیر ارادی طور پہ باہم پیوست ہوئے۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں منیب صاحب؟" عامر بھائی خود اس کی جانب بڑھ کر مصافحہ کرتے اپنا تعارف کروا رہے تھے، ان کے انداز سے منیب کی پذیرائی کے لئے پسندیدگی اور اپنائیت کا احساس بھی جھلکتا صاف نظر آتا تھا، منیب نے چونک کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور کھینچ تان کر ذرا سی مسکراہٹ کسی نہ کسی طرح ہونٹوں کی زینت بنائے اپنا آہنی مضبوط ہاتھ سپاٹ انداز میں ان

کے ہاتھ میں دے دیا۔

عائنہ جو اس کی بے اعتنائی و رکھائی کے ساتھ بیگانگی و نخوت کی عادی ہو چکی تھی، اس وقت سب سے زیادہ اسی بات پہ خائف ہوئی جاتی تھی کہ وہ یقیناً اس کے رشتوں کو بھی مارے گا، مگر اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے منیب کو عامر بھائی سے نارمل انداز میں بات چیت کرتے دیکھا، صرف عامر بھائی سے نہیں نفیسہ سے بھی، چاہے یہ گفتگو کتنی بھی رسمی کیوں نہ ہو، یہ اس کی حیرت ہی تھی کہ جس پہ قابو نہ ہو سکا تھا، جبھی بے احتیاطی ہوئی کہ نگاہیں اس شخص کے چہرے پہ گڑی رہ گئی تھیں، اسے احساس بھلے نہ ہو مگر دوسروں کو ضرور اس بے تابی کا خیال تھا، جبھی شرارت میں کہی مگر کنیز نے اسے ٹوک دیا۔

"کچھ شرم کرو لڑکی! مشرقی دلہن ہو کر جس اشتیاق سے اپنے دولہا کو دیکھ رہی ہو لوگ باتیں بنائیں گے۔" اس کے بازو میں چٹکی بھرتے کنیز کے کلاس لینے پہ وہ عائنہ خفت و خجالت سے گویا زمین میں گڑھنے کے قریب ہوئی فی الفور نگاہیں تو کیا چہرہ بھی جھکا گئی تھی، منیب نے ظاہر بھلے نہ کیا مگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ضرور آ گیا تھا کہ اس پہ ہمیشہ اس کی کڑی نگاہ کا پہرہ غیر شعوری طور پہ رہا کرتا تھا، وجہ اس کی معصومی سے معمولی کمزوری کو بھی پکڑ میں لا کر گرفت میں لینا ہی مقصود تھا۔

"نکا بھی آ گیا ہے، چا لگ گیا ہے اسے کہ تو اپنی بن رہی ہے اس کی، اوڑھی لگا دیا تھا کہ ملا کر لاؤ۔" کنیز کو ایک کے بعد دوسری باور جانی، وہ مسلسل اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے میں مصروف تھی، عائنہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"تو لے آئیں ساتھ، اسی بہانے ہم سب مل لیتے جوان سے۔"

"اتنی جلدی کہاں ہے جن سے ملنا زیادہ ضروری تھا، ان سے تو ملا دیا تمہیں۔" کنیز پہ پھر شرارت سوار ہوئی، اسے آنکھ مار کر بولی، عائنہ جھینپ کر رہ گئی، اسے گھورنا چاہا۔

"ڈولیاں چھوڑ کرنے میں عائنہ کی ہیلپ کر دیں منیب بھائی۔" نفیسہ کا موڈ اچھا خاصا خوشگوار ہو چکا تھا، خوشدلی عروج پہ تھی، منیب جو اپنی ان بہنوں سے راہ سی کا کہہ رہا تھا، اس براہ راست جملے پہ کچھ لمحوں کو ہی سہی مگر کنفیوز ضرور ہو گیا۔

"بہت معذرت ہے، مجھے لیڈیز شاپنگ کا بالکل آئیڈیا نہیں ہے، ویسے بھی جن لوگوں نے پہننے ہیں وہ ساتھ ہیں آپ کے، تو ان کی پسند کا خرید لیں۔" اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ اپنے اندر کتنی سرد مہری سمیٹے ہوئے تھا، عائنہ پہ اٹھنے والی اڑتی سی نگاہ میں کتنی تپش تھی، یہ صرف وہی سمجھ سکتی تھی، جبھی اپنی جگہ پہ ساکن ہو کر رہ گئی، اس کے علاوہ اس حاضر جوابی اور شائستگی کے مظاہرے کو ہر کسی نے پسند کیا، اماں اور کنیز بھی مطمئن نظر آنے لگیں، نفیسہ شکر رو کچھ اور حاسد چاہ کر نہیں بول گیا تھا، حالانکہ اس سے کچھ ایسی امید بھی تھی انہیں، جبھی کچھ ذری سی کھسیا۔

(جاری ہے)

آنکھ سے اک بے بس آنسو فریم میں قید
تصویر کے شیشے پر گرا تو زندگی بے اختیار سسکی۔
درد، کرب، احتجاج و بے بسی رقم تھی اس چہرے پر۔
خاموش لب لیکن سراپا احتجاج۔ حوصلے مجتمع کرتا
بکھرتا وجود آنکھوں کے سامنے وہ تکلیف دیتا
منظر آٹھہرا۔ اس کی بے بسی پہ آنسوؤں نے احتجاجاً
بہنا شروع کر دیا۔

خون سے تر وجود کسی اور کا نہیں اس کے
ماں جائے بھائی کا تھا۔ میں کس سے فریاد کروں؟
کس کو گریبان پکڑوں؟ میں کس کے ہاتھوں پر
اپنے پیارے کا لہو تلاش کروں؟

"بھائی! مجھے معاف کر دو۔ کتنی بے حس ہے
تمہاری بہن؟ تمہارے بہتے خون کا حساب بھی
مانگ نہیں سکتی، تمہیں انصاف دلا نہیں سکتی۔"

"انصاف اور وہ بھی اس سرزمین پر۔" اندر
ابھرتی سسکیاں اس کے اندر شور مچانے لگیں۔

یہ کیسی حشر گری ہے؟ یہ کس مقام پر آ
گئی ہے؟ جہاں نہ قاتل کی پہچان، نہ لہو گرنے
والے کا جرم، یہ آخر کس کی سزا ہمارا مقدر بنی۔ یہ
آخر نفرت کی آگ پر کن زندگیوں نے قدم رکھا۔
یہ بربریت اور ظلم کا شکار کون ہستیاں ہو گئیں۔ یہ
دیس جیسا میرا گھر برباد کیوں ہوا۔ یہ کس کے
بھیانک عمل کے بدلے میرا دیس تشنہ ہے۔ ان
گنت سوالات ذہن کے پردے پر ابھرتے اور
مجبور و ناچار وجود کو بے چین کر جاتے۔

آگاہی کا ادراک تو ٹھیک معنوں میں دو برس
پہلے ہوا تھا۔ وہ تکلیف دہ اذیت بھرا احساس جو
اخبارات کی سرخیاں لکھتے ہوئے بھی نہ ہوا ہو گی
سالوں سے ہر روز وہ اور اس کے ساتھی کولیگ
اخبار کے لئے خبریں لکھتے۔

"کراچی شہر گولیوں کی زد میں، سات افراد
جان کی بازی ہار گئے، متعدد زخمی۔"

مکمل ناول

"کراچی شہر میں فائرنگ کی گونج، خوف و ہراس پھیل گیا۔"

"جمعہ کی نماز کے دوران زوردار دھماکہ، بھگدڑ مچ گئی، نو افراد جاں بحق، متعدد زخمی، زخمیوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور لاشوں کو شناخت کے بعد ورثہ کے حوالے، ذمہ داری سے لاشوں کو ورثہ کے حوالے کرنا بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے، جو ایمان داری سے پوری کر دی گئی، پھر طویل فہرست حکمرانوں، سیاست دانوں، دانش وروں اور زندگی کے مختلف شعبہ ہائے سے متعلق لوگوں کے تعزیتی بیانات نشر اور کہانی ختم، نئے دن کا روشن سویرا اک نئی خبر کے ساتھ، کیا کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ یقیناً نہیں۔"

اس طویل خوفناک کالی رات کے گزرنے کا کوئی حال احوال نہیں وہ رات کس کرب و اذیت سے ہوئی صبح کے روشن اجالوں تک پہنچی ہو گی، اصل کہانی تو وہاں سے شروع ہوئی جہاں لاشیں، خون سے لتھڑے سفید چادروں میں ڈھانپے وجود کو، اس کے ورثہ کے حوالے کیا جاتا ہے، دل خراش مناظر، سسکتے وجود، کہیں چیخیں اور کہیں دبی گھٹی خود پر جبر کرتی آہیں، سسکیاں۔

جانے والے منوں مٹی تلے اور پیچھے رہ جانے والوں کے لئے زندگی کا تھکا دینے والے سفر کا آغاز اور یہ سفر کتنا کٹھن اور دشوار ہوا اس سے کسی کو واسطہ نہیں، کسی کو سروکار نہیں۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی، پورے دو سال بیت چکے تھے اسے اپنے بھائی سے بچھڑے مگر وہ آج بھی اتنا ہی گہرا افسردہ جتنا سال بھر پہلے، گالوں پر بہتے آنسو پونچھ کر اس نے فریم سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھا اور بیڈ پر بکھرے سامان کو سمیٹ کر وہ سونے پر آ بیٹھی، نم آنکھوں سے ایک بار پھر وہ بیڈ سائیڈ پر رکھے فریم کو دیکھنے لگی، بھائی کی ہنستی مسکراتی آنکھیں اسے پھر سے بے چین کر گئیں، تبھی ایک مدھم آواز کمرے کی خاموشی میں ارتعاش کا باعث بنی، اس نے نگاہ سیل فون پر ڈالی، وہ انٹرنیشنل نمبر تھا، یعنی نوریا عثمان کی کال، وہ اس سے اس کا پروگرام کنفرم کرنے کے لئے کال کر رہی ہو گی، سال بھر پہلے اس کے یہاں سے جانے کے بعد بھی وہ دوسرے روز کال کرتی اس کی باقاعدگی سے وہ لگتا جیسے بھائی کے بعد نوریا عثمان کے بے حد قریب کر گئی۔

"السلام علیکم نوریا" حتی الامکان اس نے دبے لہجے کو بشاش رکھنے کی کوشش کی۔

"کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنائیں؟"

"روشانے آج عادل کو ہم سے بچھڑے دو برس بیت گئے۔"

"جی نوریا! میں یہ دن کیسے بھول سکتی ہوں۔"

"کیا تم رو رہی تھی؟"

"جی! نوریا میں تکلیف میں ہوں کیونکہ میرے بھائی کے قاتل زندہ ہیں۔"

"اذیت میں تو میں بھی جی رہی ہوں، آج بھی کسی کا گریبان پکڑ کر پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیوں مارا عادل کو؟" وہ پہلے ہی بے حد اداس تھی اور روشانے کی آواز سے مزید اداس کر گئی۔

"مت رو میری نوریا، میں آپ کی اچھی زندگی کے لئے دعا گو ہوں۔" دو ماہ بعد نوریا اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی تھی، وہ خوش تھی کہ نوریا عثمان کم از کم اس کے بھائی کے غم سے باہر نکل سکے گی۔

"میں نہیں جانتی روشانے، اب میری زندگی عادل کے بنا کیسی ہو گی لیکن میں اپنے پیاروں کو مزید دکھی نہیں کر سکتی، یہ فیصلہ میرے لئے بے حد مشکل اور تکلیف دہ تھا۔"

"نوریا! ہمیں چھوڑ کر جانے والے اپنے پیاروں کے لئے، آپ بے حد خوش قسمت ہیں آپ کے پیارے آپ کے قریب ہیں۔" جواباً وہ بھیگے لہجے میں بولی تو نوریا نے اک کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"روشانے! میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"نوریا! آپ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچیں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے نوریا کی بات ڈسکنیکٹ کر دی۔

نوریا عثمان اسے تھکن سے بھرا لگی تھی، اب یہ اس پر منحصر تھا کہ اسے جانا ہے یا نہیں، اس کی زندگی اک جگہ آ کر ٹھہر گئی تھی، وہ عادل بھائی کی موت کے حصار میں قید تھی، عادل بھائی کی شکست میں گزرے لمحات اس کے ماضی اور حال پر بری طرح قابض ہو چکے تھے۔

☆☆☆

وہ وسط نومبر کی ایک دلکش سرد و یخ بستہ شام تھی اور دریچے سے نکلی جھیلوں کے پار فضا میں اڑتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے وہ سرشاری سے سوچ رہی تھی۔

میرا پاکستان، میرا وطن، اقبال کا خواب، لاکھوں لوگوں کی قربانی کا حاصل، جناح کا پاکستان، کتنے برسوں بعد وہ اس خوبصورت وطن کی سرزمین کو چھونے گی، اس کے خوابوں کا مسکن، وہ روحانی رشتہ اور روایات پر بنی گھر جس کا کونہ کونہ محبت، امن و سکون کے نور سے منور تھا۔

بادلوں کے دریچے پر چند چہرے ابھر آئے تھے، چہروں میں گندمی شبیہیں سمیٹے وہ ماما، بابا کے ساتھ بھی وہاں رہتی تھی۔

اور پھر نجانے کب بابا اپنے وطن کو چھوڑ کر اس پرائے وطن میں آ بسے، کئی بار وہ بے چین سی رہی، عادل کی آمد نے اس کی زندگی کو رونق بخش دی، یہاں کی پر آسائش زندگی کے باوجود بھی وہ دھندلی یادوں کا عکس اپنے دل سے نکال نہ پائی، وقت کی رفتار بڑھی تو پردیس کی اندھیری رات ماما، بابا کو نگل گئی، کریمی نے ان دونوں کی ذمہ داری اٹھائی۔

عادل سے پہلی ملاقات، دوستی میں بدلی محبت تک پہنچی اور چند ماہ کے مختصر عرصے میں دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔

عادل پاکستان میں اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا وہ بس دو ہی بہن بھائی تھے، اس کی بہن روشانے کسی اخبار میں بطور صحافی جاب کرتی تھی۔

نیویارک کی اک سرد شام بڑی سادگی سے ہمارا نکاح ہوا تھا، پھر چند روز بعد وہ عادل کے اصرار پر پاکستان چلی آئی۔

برسوں پہلے اس زمین کی جدائی میرے دل میں واپسی کی خواہش جگا گئی تھی، حالانکہ بابا نے کتنا سمجھایا تھا۔

"نوریا! تم ایڈجسٹ نہیں کر پاؤ گی، یہاں اور وہاں کی ماحول میں بہت فرق ہے، یہ وہ پاکستان نہیں جو ہم اتنے برس پہلے چھوڑ کر آئے تھے۔"

"میری بچپن کی یادوں کا مسکن، میں وہاں بے حد خوش رہوں گی۔" وہ کریمی اور عادل کی باتوں سے ہرگز متفق نہ ہونے والی تھی۔

وہ وہاں جا کر رہنا چاہتی تھی، وہ گھر جہاں اس نے آنکھ کھولی، وہ اسکول جہاں سہیلیوں کے ساتھ کئی بار ٹنگ جاتی رہی، اپنے دادا، دادی کی قبریں، زندہ دلی پر یادیں تازہ کرنے وہ وہاں جانا

چاہتی تھی۔"

وہ بے حد الجھا گئی تھی، عازم اور گریبان نے بالآخر خاموشی اختیار کر لی، اک عجیب کشش اسے کھینچ کر اپنی سرزمین پہ لے آئی، نجانے اسے واپسی جلدی کیوں کی؟ کس چیز نے اسے بے چین کیے رکھا، شاید اس کا نصیب اسے بالآخر یہاں لے ہی آیا، یہیں وہ عادل کی سنگت میں خواب بن کر [illegible] گئے۔ وہ عادل کے ساتھ کراچی اپنے آبائی شہر دیکھنے آئی، سارا دن رات دیر تک وہ [illegible] کہ اس شہر کو دیکھنے میں مگن رہے، رات تو [illegible] کے لیے نکلے، باہر بھاگتی دوڑتی [illegible] وہ عادل سے باتوں میں مگن تھی جب وہ موٹر سائیکل سوار اسی کی مدد سے گاڑی کے سامنے آ مڑے ہوئے اندھا دھند فائرنگ، چیختا چنگھاڑتا، اک قیامت برپا کر گئی، نیم بے ہوشی میں اس نے عادل کے وجود کو محسوس کرنے کی کوشش کی، مگر کر نہ پائی۔

وہ ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم تھا، نہ پیروں تلے زمین رہی نہ سر کے اوپر آسمان، عادل اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا، وہ اپنا اور عادل کا قصور ڈھونڈتی رہی۔

مگر...... اگر...... کاش...... لیکن...... جیسے سب کچھ چھن گیا اور بے بسی، آنسو، درد، تڑپ، سسکیاں، تکلیف رہ گیا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز پہ وہ چونک گئی۔

"کون ہوگا؟" وہ باہر آئی تو فرحانہ بی بی دروازہ کھول چکی تھیں جبکہ آنے والا اندر بھی آ گیا تھا، وہ لاؤنج میں کھڑا تھا، اسے پہچاننے میں ہرگز غلطی نہ ہوئی، وہ عازم عثمان تھا، نوریا عثمان کا بھائی، جو یہاں اپنی بہن کو لینے آیا تھا، وہ نوریا عثمان کی طرح حسین اور ہینڈسم تھا، اسے دیکھ کر اپالو کا خیال ذہن میں ضرور آتا ہوگا۔

"ہیلو۔" اس کی کمرے میں موجودگی محسوس کر کے وہ اپنے انگریزی اسٹائل میں بولا۔

اس سے قبل وہ جواب دیتی نوریا چلی آئی اور اپنے بھائی کے سینے سے لگ کر رو دی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، اپنے آنسو [illegible] دونوں کے ساتھ نوریا کو سنبھالتے [illegible] روشن چہرے کو دیکھا جو اپنی [illegible] ہونٹ چبا کر اسے سنبھالنے [illegible] بھائی ایک دوسرے کو [illegible] کھڑکی کے پار [illegible] کانوں میں نوریا اور عازم [illegible] سسکیاں [illegible] گئیں۔

☆☆☆

"عازم! اب کب تک ہم واپس جائیں گے؟" اس کا دل یہاں سے بھر چکا تھا، وہ جب یہاں اس لہو رنگ سرزمین سے دور جانا چاہتی تھی۔

"میں ٹکٹس کے لیے کوشش کر رہا ہوں جیسے ہی ملیں گی ہم چلے جائیں گے۔" وہ بھی لیپ ٹاپ پہ بیٹھا آن لائن ٹکٹس بک کرنے میں مصروف تھا۔

"عازم! جب ہم چلے جائیں گے تو روشی اکیلی رہ جائے گی۔" عازم نے سر اٹھا کر ذرا کی ذرا دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔

"وہ اکیلے کیوں؟ ان کے رشتہ دار ہیں یہاں پر۔"

"عادل کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔" اچھا سوچوں سے نکل کر وہ عازم کو دیکھنے لگی۔

"نوریا! وہ بچی نہیں ان کو کسی گارڈین کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں؟" کسی خیال کے تحت وہ بولی تو عازم چونک اٹھا، لیپ ٹاپ کو قدرے سائیڈ پہ کرتا وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"نوریا تم کیسی باتیں کر رہی ہو، گریبی کا آپریشن ہے میں ان کو وہاں چھوڑ کر تمہیں لینے آیا ہوں، اتنا پاگل مت کہا اور ویسے بھی ہمارا ان سے اب ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔" عازم نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بڑا تفصیلی جواب دیا تھا۔

"تعلق تو بن جاتا ہے اگر ہم بنانا چاہیں۔"

وہ دوستی سے شناسائی اور کھلے دروازے کے بیچ و بیچ کھڑی روشی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے خیال میں نوریا اکیلی تھی مگر سامنے ہی عازم کو دیکھ کر وہ اندر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنے لگی، جب نوریا کی آواز اس کے قدم جکڑ گئی۔

"مثلاً کیسا تعلق؟"

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے تم اس سے شادی کر لو۔" وہ کیا کہہ رہی تھی، اس کی بات پر وہ دونوں بھونچکا ہو کر رہ گئے، تبھی ان دونوں کی نگاہ روشی سے ٹکرائی۔

"نوریا!" دانت پیستے عازم نے اک بے بسی سے اسے گھورا، عازم کے سامنے اسے اپنی پوزیشن بے حد اکورڈ فیل ہوئی، تیزی سے وہ وہاں سے نکل آئی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پہ وہ اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں مشغول تھی جب نوریا آ گئی۔

"گڈ مارننگ، لگتا ہے رات آپ آرام سے سوئیں؟" وہ کل کی بات کا اثر زائل کرنے کی سعی میں بڑے نارمل انداز میں پوچھ رہی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس موضوع پر اب مزید کوئی بات ہو خواہ وہ معذرت ہی کیوں نہ ہو، نوریا نے اک پھیکی سی مسکراہٹ سجائے سر اثبات میں ہلا دیا اپنے لیے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ بولی۔

"تم یہ اخبار کیوں پڑھتی ہو؟"

"صحافی جو ہوں، اخبار نہ دیکھوں تو بے چینی سی ہوتی ہے۔"

"گڈ مارننگ لیڈیز!" عازم کی آمد پہ وہ دونوں خاموش ہو گئیں، نوریا عازم کی جانب متوجہ ہوئیں تو وہ دوبارہ سے اخبار میں گم ہو گئی، عازم نوریا کے ساتھ موجود کرسی کھول کر بیٹھا تو وہ اس سے کہنے لگی۔

"آج تیاری صبح صبح۔" اس کا حلیہ تیاری باہر جانے کا غماز تھا۔

"نوریا! ہماری ٹکٹس کنفرم ہو گئی ہیں، میں ٹکٹس کو پک کرنے جا رہا ہوں۔"

"کب کی ہیں؟"

"آج رات۔" وہ آہستگی سے بولا تو روشانے نے اخبار سے سر اٹھا کر اس نے سرسری نگاہ عازم پر ڈالی، جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔

"رات کی، اتنی جلدی۔"

"ہوں...... ہوں۔" اس نے کپ ہونٹوں سے لگاتے مختصر ترین جواب دیا، انداز یوں جیسے مزید کوئی بحث نہ ہو، ناشتے کی میز سے وہ سب سے پہلے اٹھا۔

"ٹیکسی؟ یہاں قریب سے کوئی ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔" خدا جانے وہ کس سے مخاطب تھا۔

"تم ٹیکسی سے جاؤ گے؟"

"آف کورس، نیا کوئی اور آپشن ہے میرے پاس۔" اسے نوریا کا سوال انتہائی بچکانہ لگا۔

"آپ چاہیں تو گاڑی لے جا سکتے ہیں۔"

وہ اخبار سائیڈ پر رکھتی وضاحتی لہجے میں بولی۔
"میرے پاس انٹرنیشنل لائسنس نہیں اور یہاں میں ڈرائیو نہیں کر سکتا۔" وہ پہلی بار یہاں آیا تھا یہ جگہ، راستے، سب اس کے لیے اجنبی تھے۔
"ویسے بھی مجھے یہاں کے راستے نہیں آتے۔" اس نے اپنی بات مکمل کی تو وہ کپ میں چمچ ہلاتے ہوئے سر ہلا گئی۔
"اچھا وہ ارکو تو روشی تمہیں لے جاتی ہے۔" لوریا اس کی تعزی پر متحیر ہوتی جلدی سے بولی۔
"ٹیکسی مل جائے تو میں مینج کر لوں گا۔" ایک لمحے کے لیے لوریا کی بات پر اس نے روشانے کے ریسپانس کا انتظار کیا پھر بول اٹھا۔
"میں لے جاتی ہوں لیکن آپ کو دس منٹ ویٹ کرنا ہوگا۔" وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتی آہستگی سے بولی۔
"کوئی پرابلم نہیں، یہ ویٹ کرلے گا، تم ریڈی ہو جاؤ۔" لوریا عجلت سے بولی تو وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی مگر اپنے پیچھے ابھرتی سرگوشی ضرور سنائی دی۔
"میں لیٹ ہونا افورڈ نہیں کر سکتا۔"
دس منٹ پورے ہونے سے پہلے وہ لاؤنج میں آ گئی، لوریا پر اک نرم سی مسکراہٹ ڈالتی وہ عارم کو چلنے کا کہتی مین ڈور کی جانب بڑھی، وہ لوریا کو تیاری مکمل کرنے کی تاکید کرتا اس کے پیچھے باہر آ گیا، گاڑی اسٹارٹ کرکے اس نے برابر والا دروازہ عارم کے لیے کھول دیا، پھر مین روڈ پر آتے ہی وہ بولی۔
"ٹکٹ کہاں سے پک کرنی ہے؟"
"میں آپ کو ایڈریس بتاتا ہوں۔" وہ موبائل میں فیڈ کیا ایڈریس تلاش کرتا بتانے لگا۔
"آل رائٹ، میں سمجھ گئی۔" اس نے گاڑی اس کے بتائے گئے راستے پر ڈال دی، وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی جبکہ اس کے برابر بیٹھا شخص گاڑی کے باہر کے مناظر کو بڑے غور و فکر سے ملاحظہ فرما رہا تھا، تبھی اس کی آواز گونجی۔
"سو افسوس، جیسا سنا تھا بالکل ویسا ہی ہے۔" وہ اس سے انگریزی میں مخاطب تھا، اس کے چہرے کے ساتھ اس کا انداز بھی قدرے جتانے والا تھا۔
"مثلاً کیسا؟" جواباً وہ سنجیدگی سے قیاس کرنے لگی۔
"No laws, No rules, No discipline even no humanity." وہ چہرے پر افسوس زدہ تاثر بھرے گویا ہوا، روشی نے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سے باہر کی زندگی کو اک دکھ سے دیکھا مگر ہنوز خاموش رہی۔
"البتہ یہاں پر luxurious چیزوں کی فراوانی سی ہے، آسمانوں کو چھوتی یہ بلند عمارتیں، بڑی بڑی لگژری گاڑیاں، اعلیٰ شان دار گھر، جدید موبائلز، ایک سائیکل، رکھنے والا موبائلز افورڈ کر سکتا ہے مگر ٹریفک سگنلز پر رک کر قانون کا احترام کرنے کا وقت نہیں اور انسانیت اور اس کے لیے کوئی چیز دکھائی نہ دی، آس پاس گاڑیوں کا ہجوم ہے اور دوسری طرف وہ غریب جو خستہ حال پھٹے کپڑوں کے نت ہاتھ پر سو رہا ہے، نجانے آج کے دن اسے کچھ کھانے کو ملا بھی ہے کہ نہیں۔" بولتے بولتے اس نے سامنے فٹ پاتھ کے ساتھ بنی گرین بیلٹ پر ست سوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔
"بے رحمی، یہ بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے مانگتے گاڑیوں کے نیچے آ کر کہیں مرتے۔" اس

کے لہجے کو بار بار روشانے نے بھانپ لیا۔
"آئی ایم شیور، ضرور مرتے ہوں گے، ان گاڑیوں والوں کو یہ سائن چمکتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تو یہ غریب معصوم بچے کہاں دکھائی دیتے ہوں گے، ویسے بھی تو یہاں موت اتنی عام اور سستی ہو گئی ہے۔" یہاں کا بدر دہشت کا تجربہ تھا جو اس نے اپنی آنکھوں دیکھا حال روشانے کے گوش گزار کیا، جواباً روشانے اس کے الزامات پر اپنا دفاع کرنا چاہتی تھی لیکن کیسے کرتی، تقریباً کئی دن پہلے تو اس نے انسانیت کا پرچار کرتی قوم کے ہاتھوں اپنا بھائی کھویا تھا، روشی نے اس کے بتائے گئے ایڈریس پر گاڑی روک دی۔
"یہاں سے آپ کو ٹکٹس مل جائیں گے۔"
"او شکریہ، آپ چل رہی ہیں؟" وہ اترنے سے پہلے اخلاقاً اس سے پوچھنے لگا۔
"جی۔" گاڑی کو لاک کرکے وہ عارم کے ساتھ اندر آ کھڑی ہوئی۔
ٹریول ایجنٹ کے پاس اچھا خاصا رش تھا، بھی بتاؤں کے خیال سے ادھر ادھر پھیلے اپنی اپنی بولی بولے جا رہے تھے، ایک کاؤنٹر پر کوئی حضرت لڑنے میں مشغول تھے، عارم کی پریشان صورت دیکھ کر وہ اسے قدرے کم رش والے کاؤنٹر پر لے آئی اور تقریباً آدھے گھنٹے کی زحمت جھیلنے کے بعد وہ ٹکٹس لے کر باہر آئے تو روشانے اپنی گاڑی کے پیچھے پارک کی جانے والی کار کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھی، اس نے ارد گرد موجود حضرات سے گاڑی کے والی وارث کے بارے میں پوچھنا چاہا تو جواب "معلوم نہیں" کی صورت میں موصول ہوا، اس نے ادھر ادھر نظر تلاش کرنا چاہا وہ بھی نظر نہ آیا۔
"یہاں ایسا رانگ ہے کہ ایک معصوم سا ڈلفر بھی ٹھک کر بیچ سڑک پہ چلا گیا ہوگا۔" عارم کا مذاق اڑاتا انداز اسے منوں شرمندگی میں ڈبو گیا۔
"کچھ دیر ویٹ کرنا ہوگا؟" ناچار اسے کہنا پڑا۔
"کتنا، میری فلائٹ تو مس ہونے کا چانس تو نہیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا تو روشانے نے بھی ڈھیٹ بنتے ہوئے لاعلمی ظاہر کرتے اپنے کندھے اچکا دیے، عارم گاڑی کو ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تو وہ ارد گرد دیکھتی حضرات کے جلدی آ جانے کی دعا کرنے لگی، بصد شکر کہ زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا، ایک کھسیانی ہنسی ہنستے سوری سوری کرتے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے اور یہ جادو جا، روشانے نے جو انہیں سلواتیں سنانے کے پورے موڈ میں تھی خاموشی کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
واپسی کے سفر پر عارم نے اسے پاکستان میں دیواروں پر لکھے گئے فقرات پڑھ کر سنائے، وہ اردو میں اچھا خاصا کمزور تھا مگر کہیں کہیں انگریزی میں لکھے لفظ سے اشتہاروں کی نوعیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔
"ملتان دواخانہ" اس نے با آواز بلند پڑھا تو روشانے بے اختیار مسکرا دی۔
"اس اے رنگیلی گنڈا آئیڈیا، واٹر کا کوئی تو قاعدہ ہونا چاہیے۔" وہ اب مسکراتے ہوئے دلچسپی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں، کسی کے جانے سے زندگی نہیں رکتی، چلتی رہتی ہے البتہ خوشی، سفر زندگی تو پہلے سے چلے، خوشی کا کیا؟
ٹھک ٹھک تیزی سے چلتا قلم دروازے پر ہونے والی دستک پر رک گیا، اپنے سامنے بکھرے کاغذوں کو اکٹھے کرکے وہ دروازے تک

آئی۔

''آئیں لوریا!'' دروازے پر کھڑی لوریا کو اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک تو، بس کچھ لکھنے کا موڈ ہو رہا تھا، اندر آئیں۔'' انہیں دھیان میں خود کو سے دیکھ کر اس نے دوبارہ اندر آنے کو کہا۔

''آپ کی تیاری ہو گئی؟''

''ہو گئی تیاری، کیا تم مجھے مس کرو گی؟'' لوریا کی آنکھوں میں ٹھہرے پانی پر وہ نگاہ ڈالتی اک ہلکا سا درد بھرا احساس لیتی بولی۔

''کیوں مس نہیں کروں گی اور ہم ایک دوسرے سے رابطہ ضرور رکھیں گے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''مجھے ملنے آؤ گی؟''

''زندگی نے موقع دیا تو آپ کی پرسکون دنیا دیکھنے ضرور آؤں گی۔'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر آہستگی سے سر اثبات میں ہلاتی کہہ رہی تھی۔

''میری دنیا، اگر وہ میری اپنا ہے تو یہ کس کی ہے؟''

''وحشی درندوں کی۔'' وہ خود کلامی کرنے لگی، خود کو بار بار سنبھالنے کے باوجود بھی درد اسے آپ کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔

اور یونہی بار اسے ملنے، بسکنے عادل حسن اور رہنمائے کے دلیس سے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

روشنی انہیں ائیرپورٹ سی آف کرنے آئی تھی، وہ سب خاموش تھے یہ خاموشی آزردگی ان کا مشترکہ درد تھا اور یہ درد میں کی کب ہو کے خبر۔

''رات کافی ہو گئی ہے آپ کو واپس چلے جانا چاہیے۔'' عادم کو روشنی کے چہرے پر بے حد ویرانی محسوس ہوئی، سوائے گھر بھیجنے میں ہی عافیت جانی۔

''میں مزید کچھ دیر لوریا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' تبھی لوریا نے آگے بڑھ کر اس کے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ تھام لیے۔

''روشنی، میں تمہیں تنہا چھوڑ کے جا رہی ہوں۔''

''آپ کو جانا ہی تھا، کب تک رکتیں۔'' تبھی عادم نے آگے بڑھ کر لوریا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے ہولے سے خدا حافظ کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا، پھر نہ اس نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی لوریا کو جیسے دریا بھرے ہجوم میں روشنی تنہا کھڑی رہ گئی۔

''یہ میرا وطن، میری دھرتی، میرا دیس، مجھ سے میرا واحد آخری سہارا چھین کے لے گیا۔'' وہ رو رہی تھی، اس کا دل اس کی روح سب رو رہے تھے۔

وقت کی سوئیاں آگے بڑھیں تو رو دھو کر وہ بھی خود کو اپنی جاب میں گم کرتی بھاگتی دوڑتی زندگی میں سست روی کے ساتھ ہی سہی چلنے لگی۔

☆☆☆

ایکسں اکوزیر۔

ائیرپورٹ کی رونقوں اور گہما گہمی میں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا کتنا عجیب تھا یہ سب، وہ اپنے بھائی کی بیوہ کی شادی اٹینڈ کرنے جا رہی تھی۔

جہاز ائیرپورٹ سے بلند ہوا تو نیچے وہ شہر نظر آنے لگا جو اس کا گھر تھا جہاز کی سلیٹ سے ٹیک لگائے وہ سوچ رہی تھی۔

''نجانے کیسا دیس ہوگا؟ کیسے لوگ ہوں گے وہاں کے؟ اسے جانا بھی چاہیے تھا کہ نہیں۔''

اک الجھن سی گھیرے تھی۔

پچھلے ڈھائی سال سے وہ بے حد خاموش اور کسی حد تک بدمزاج ہو گئی تھی وہ جینے کو دل چاہتا اور نہ کسی سے ملنے کو حالانکہ وہ ایک صحافی تھی، ہر چیز سے دل اچاٹ ہو چکا تھا، اس کے قریبی ساتھیوں کا خیال تھا، ماحول اور جگہ کی تبدیلی اس کی ذہنی زندگی کو قدرے سکون زدہ کنارہ بخشے گی۔

جبرائیل سہی، شاید اس میں اتنی سکت تھی ابھی طویل مسافتوں کو سہنے کی اور بے وجہ بیت جانے کی، تبھی تو لوریا کی پرخلوص دعوت کو قبول کرتی چلی آئی۔

اس نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے جھانکا جہاں اب دشمن شد تھی، سمندر تھا، بحر اوقیانوس، اتنا پانی کہ کہیں سمت دور، سمندر پار، بحر اوقیانوس کے پار نیویارک وہ شہر جہاں اسے جانا تھا۔

ایک بار وہ بار وہ اس نے جہاز کی سلیٹ کو ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور آنکھوں میں تیرتی نمی کو اپنے اندر اتارنے لگی۔

کئی گھنٹوں پر محیط یہ طویل سفر بالآخر گزر ہی گیا، جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائیرپورٹ پر اترنے کو تھا، جہاز کی بلندی جوں جوں کم ہوتی گئی اس کے ساتھ نیچے جزیرے اور رستے دکھائی دے رہے تھے وہ دھیرے دھیرے فوکس میں آنے لگے، اک گہرا اور طویل سانس بھرتے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

جہاز سے باہر آنے کے بعد امریکی امیگریشن افسر کا تفتیشی سوال و جواب پر مبنی انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔

''آپ پاکستان میں کیا جاب کرتی ہیں؟''

''میں صحافی ہوں۔'' وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

''نیویارک میں کہاں قیام کریں گی؟''

''اپنی دوست کے گھر۔'' اسی قسم کے سوال جواب کا سلسلہ پانچ منٹ میں مکمل ہوا، اس لمبے مراحل کو پار کرتے، وہ سامان کی ٹرالی گھسیٹتی متحرک بیلٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، انتظار کے لمحے میں گردن گھما کر ارد گرد نگاہ دوڑا کر دیکھا تو تمام چہرے اجنبی اور خود سے مختلف دکھائی دیے نہایت مہذب باقاعدہ عوام کے افراد۔

یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں آنے کی خواہش بہت سے انسانوں کے دل میں بھی ہے، گہما گہمی کا عالم لیے یہ جگہ اپنی تمام تر زندگی کی لذتوں میں لپٹی تھی اور وہ جو گرد زدہ انسانوں کے ملک سے آئی تھی، نجانے کیوں اس پل، اپنا دیس سناٹوں، خاموشی اور سسکیوں کی زد میں دکھائی دیا، جہاں ماتموں کا رواج عام ہو گیا تھا، جہاں پر خشونت اور غصیلے چہرے عام ہونے لگے تھے، مسکراہٹ اور حقیقی خوشی مانند پڑتی جا رہی تھی، اس شور اور بے خود آزادی اور زندگی سے بھرپور حظ اٹھانے والے لوگوں کے جمگھٹ سے خود کو آزاد کرتی ٹرالی گھسیٹ کر ائیرپورٹ کے بیرونی جانب چلی آئی۔

نیویارک کے جے ایف کینیڈی ائیرپورٹ پہ ایک آسودگی اور راحت سے بھرپور سفر کے باوجود، طویل سفر کی بے پناہ تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی، ائیرپورٹ کے بیرونی احاطہ میں آ کر وہ ٹھہر گئی۔

''گڈ ایوننگ۔'' اپنے دائیں جانب سے آواز سنائی دی تو اس نے سر گھما کر آنے والے کو دیکھا وہ عادم عثمان تھا۔

اک جبری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے سر ہلا یا اور لوریا کو نہ دیکھ کر وہ جھلائی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس کی خیریت پوچھنا

وہ اس سے سامان والی ٹرالی لیتا اس کے ساتھ پارکنگ کی جانب بڑھنے لگا۔

"سفر کیسا رہا؟"

"اچھا۔" اس نے ہولے سے جواب دیا۔

"نوریہ آپ کو لینے آ رہی تھی لیکن میں اسی لیے سیف آ گیا۔" اس کی مسلسل خاموشی کو جانے وہ بھانپ گیا تھا جبھی نوریہ کے نہ آنے کا بتا رہا تھا۔

جواباً اس کی بدستور خاموشی پر وہ خود بھی خاموش ہو گیا۔ جس پر وہ صد شکر کرتی کھڑکی سے باہر آسمانوں سے باتیں کرتی بلند عمارتیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

شیشے کی دیوار نما کھڑکی پر بارش کی بوچھاڑیں جیسے آبی آنسو بہا کر ماتم کر رہی تھیں، دستکیں دے رہی تھیں۔ موسموں کے بدلنے میں آخر ستمبر کو نیویارک میں باقاعدہ خزاں کا آغاز ہو جاتا تھا اور وہ جو خود بھی خزاں کی زردی کی زد میں آئی ہوئی تھی کہ ڈوبتے سورج کی زردی حیات کے منظر کو زرد کر رہی تھی۔ وہ جو خود خزاں تھی اس موسم خزاں کو دل میں اتارتی بے حد رنجیدہ اور دکھی ہو رہی تھی۔ دوسری منزل سے نیچے بارش اور تیز ہواؤں کی زد میں آ کر اپنی ڈالیوں سے بچھڑنے والے بے انت چنار کے پتے پہلے تو زرد جگنوؤں کی طرح ڈولتے اور پھر وہ برستے مینہ میں بھیگنے بھاری ہو کر نیچے سڑک کے پتھریلے فرش پر جا چپکتے۔ اس شیشے کی دیوار نما کھڑکی پر بارش کے بے تحاشا آنسو برستے اسے دھندلاتے تو نیچے فرش سے چپکے زرد پتے اسے ماضی میں لے گئے اور اس کے قریبی ساتھیوں کے خیال میں۔

"آہ، ماحول کی تبدیلی مجھے زندگی کا احساس بخش دے گی، جانے دو کیسے۔" ابھی تک تو اس کے وجود میں ایک بے چین سنسنی تھی جو ایک نامعلوم جنگل میں داخل ہوتے ہوئے گم ہی ہوئی، اسے یہاں آئے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔

نوریہ اس کے ہونے والے شوہر سیف سے، آنٹی سعیکا گریبی اور آرزو وہ ان سب سے مل چکی تھی۔ جس کی خاموشی کو اس کی تھکن سے مشروط کرتے ہوئے نوریہ اسے کمرے میں آرام کرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی اور اب وہ اس شیشہ نما دیوار کے سامنے کھڑی خود کے درمیان ابھی بکھری کھڑی تھی۔

نوریہ اسے محض جا دو دن ہی کمپنی دے سکی، وہ سیف کے ساتھ رخصت ہو کر گئی تو روشنی نے خود کو پرائے دیس میں بالکل ہی اکیلا سمجھنے لگی حالانکہ مصروفیت کے باوجود گریبی اسے وقت دینے کی کوشش کرتی، حازم سے بھی معمولی نوعیت کی ہیلو ہائے ہو ہی جاتی۔ یہاں سب اپنی اپنی زندگی میں بزی تھے، اسے صرف اپنا آپ ہی فارغ لگتا تھا۔

اوائل نومبر کی ایک مدھم شام میں وہ حازم کے ساتھ دنیا میں اپنی من مانی سے راج کرتے ملک کا ایک کبھی نہ سونے والے شہر نیویارک دیکھنے چل دی۔

یہ ملک امریکہ جدید کلچر سے لبریز اتنا بڑا تھا کہ اس میں گم ہوا جا سکتا ہے۔ بلند ترین عمارتیں ہر کونا اور ہر وقت کا جہاں بے حد کشش اپنے اندر رکھے تھا۔

براڈوے سٹریٹ سے نکل کر وہ ٹائم سکوائر جانے والے راستے پر ہو لیے۔

"کوشش کروں گا آپ کو یہ شہر اچھی طرح سے دکھا سکوں اور میری کمپنی آپ کو بور بھی نہ کرے۔" وہ روشنی کی سنجیدگی سے خاصا خائف تھا، گریبی اور نوریہ کا اصرار نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسے بد مزاج مہمان کی میزبانی سرانجام نہ دیتا۔

جواباً اسے وہی خاموشی ملی، وہ بھی بے بس تھی، اسے نہ یہ شہر دیکھنے کی خواہش تھی اور نہ ہی کسی کی اچھی کمپنی کی ضرورت، وہ یہاں کیوں آئی یہ سوال اب تک بنا جواب اس کے دماغ میں اودھم مچائے تھا۔

حازم مین ہاٹن سے کافی دور گاڑی پارک کر کے اسے لیے اس جگہ آ گیا جسے ٹائمز سکوائر کہا جاتا ہے۔ روشنی نے نگاہ گھما کر خوشی سے لبریز اور بے خود مسرت میں بھیگے ہوئے لوگوں کو دیکھا، تبھی اس کے ہمراہ چلتا شخص اسے ایک گائیڈ کی طرح بتانے لگا۔

"1940ء میں یہاں نیویارک ٹائمز اخبار کی یہ بلند عمارت بنی تو اس کی مناسبت سے اسے ٹائمز سکوائر کہا جانے لگا۔" وہ اخلاق میزبانی نبھانے پر مجبور تھا، تبھی اس کی خاموشی اور انداز اطوار کی پروا کیے بنا بولے چلا جا رہا تھا۔

"یہاں لوگوں کو خوش کر کے اپنا رزق کمانے والے بڑے بڑے باکمال لوگ آپ کو نظر آئیں گے۔" روشنی نے اضطرار نظر دوڑا کر دیکھا سٹوروں کے سامنے، فٹ پاتھوں پر اور ادھر سڑک کے عین درمیان میں کیسے کیسے ہنر مند فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیے۔

"نیو ائیر کی آمد پر دنیا کا سب سے بڑا جشن یہاں منعقد ہوتا ہے جس میں لاکھوں لوگ شریک ہوتے ہیں، رات کے پورے بارہ بجے اس کے مرکز سے ایک بہت بڑا گیند روشنیاں بکھیرتا نیچے آتا ہے اور لوگ خوشی سے بے خود ہو کر نعرے لگاتے ہیں۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے گیند والی جگہ دکھا رہا تھا وہ جہاں جہاں اشارے کرتا روشنی بے اختیار چہرے کے ساتھ وہاں دیکھنا شروع کر دیتی۔ بے شک وہ بے حد خوبصورت، زندگی بانٹتا ملک تھا مگر اسے دیکھنے کی چاہ اس کے اندر نہ تھی سوائے اندر کی بے چینی سے مسلسل لڑتی حالت جنگ کی کیفیت میں مبتلا وہ اپنے قریب کھڑے شخص کو سننے کی سعی کر رہی تھی۔

"کیا آپ کو یہ جگہ اچھی نہیں لگی؟" اس کی مسلسل خاموشی پر وہ رک گیا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، یہ جدت تو آپ امریکن قوم کا فخر ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے اندر کی فرسٹریشن باہر لے آئی۔ اس کے جملوں پر لمحہ بھر کو اس نے روشنی کا چہرہ دیکھا۔

"ترقی کرنا، آگے بڑھنا کسے اچھا نہیں لگتا؟" وہ سوال کر رہا تھا یا روشنی کے دماغ میں اضافہ وہ سمجھ نہ سکی۔

"سب کو۔" اس کے لبوں سے ابھرے سے پھسلا۔

"یہ حق سب کو ملنا چاہیے۔" اپنے اندر بڑھتے غبار کو قابو کرتی وہ لفظوں پر زور دیتی طنزیہ مسکرائی۔

"یقیناً یہ حق سب کو حاصل ہونا چاہیے۔" اس کے لہجے کی تلخی کو پہچان چکا تھا جبھی قدرے بیزار ہو کر کہہ رہا تھا۔

"اور اپنا حق مانگنا بھی آنا چاہیے۔" وہ کیا جتانا چاہ رہی تھی اور وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا، وہ بحث نہیں چاہتی تھی سو چپ ہو گئی۔ وہ ٹائم سکوائر کے مرکز میں گھومتے ایک جگہ آ کر رک گئے۔

"بگھی میں بیٹھیں گی؟" روشنی نے سامنے بنی سجی بگھیاں دیکھیں جن کے گھوڑے بھی سجے ہوئے تھے۔

"یہ کچھ منٹ کے لیے ٹائم سکوائر کی سیر کروائے گی اور دوران سفر اس کی تاریخی ثقافتی اہمیت بھی بیان کرے گی۔" وہ اس کی بیزاری اور خشک لہجے کو خاطر میں لائے بنا بتا رہا تھا۔

"آپ کا موڈ خوشگوار کرنے کے لیے ہو سکتا ہے کوئی لوک گیت بھی سنا دے۔" آخر میں

کی جو عادم عثمان کو بولنے پر مجبور کرے وہ ایک مہذب مہمان بن کر رہے گی اور یہی خود کو باور کروائی وہ عادم کے ساتھ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے سامنے موجود تھی، دنیا میں اک بڑی تاریخ رقم کرنے والی جگہ۔

روشنی نے آہنی جالیوں کے اندر سوئے، ایک وحشی اور ویران میدان کو دیکھا جہاں کہیں کہیں گھاس اگ رہی تھی۔

"9/11 کے بعد یہاں نیویارک کے لوگ کم ہی آتے ہیں، وہ جتنا ماتم کر سکتے تھے کر چکے ہیں اب زیادہ تر یہاں صرف غیر ملکی ٹورسٹ آتے ہیں۔" پچھلی باتوں کو نظر انداز کرتا وہ اسے اس جگہ کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہاں، اس ایک کھنڈر کے بدلے میں ہزاروں بستیوں کو کھنڈر کر کے وہ کسی حد تک مطمئن جو ہو چکے ہیں۔" اس نے خود کلامی کی مگر وہ یہ کہہ نہ پائی۔

وہ آہستگی کے ساتھ آویزاں بورڈ پڑھنے لگی جس پر گیارہ ستمبر کے ہر لمحے کی تفصیل با تصویر اور لمحہ بہ لمحہ درج تھا۔ اس کی نگاہ اس سے اگلے بورڈ پر گئی جس پر ان لوگوں کے نام درج تھے جو ٹریڈ سینٹر میں جل کر راکھ ہوئے، روشنی کی نگاہ ان تین ناموں پر رک گئی جو یا تو اس کے ہم وطن تھے یا ہم مذہب۔

"آپ یہاں رکنا چاہیں گی؟" اسے تفصیل سے بورڈ پڑھتے دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں چلتے ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر عادم کی جانب دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ زرد چہرہ جو ضبط کرب سے زرد ہو چکا تھا بے اختیار اک بے چینی سی اس کے اندر اترنے لگی۔

پیرس، یا نیویارک کا خوبصورت شمالی شہر کی وہ پر رونق جگہ جسے انہوں نے اپنی زندگی کا مسکن بنا کر تاریخ کے بڑے بڑے فیصلے کیے، ہزاروں بستیوں کو ایسا ہی راکھ کا ڈھیر بنا کر کامیابی کے سنہرے ستونوں پر سجانے فخر سے مزید ترقی کی منزلیں پا رہے ہیں، وہ ایک بار پھر اس ماحول، جگہ سے کٹ کر اپنی سوچوں میں الجھ گئی تھی۔

"زندہ قومیں، اگر یہ زندہ قومیں ہیں تو ہم کون ہیں؟"

ان گنت، بے گناہ معصوم لاشوں کا بوجھ لئے، جینے والے ہم کس مہذب معاشرے مہذب مذہب اور قوم کے افراد ہیں، کیا زندہ قومیں اتنی ہی بے حس ہوتی ہیں؟ زندہ قومیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے یہاں کوئی سو لوگ مر جاتے ہیں تو وہ باقی دنیا کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔ اور ہم جیسی قوم جو روز کئی بے گناہ لاشوں کے بدلے صرف مذمت بھرے الفاظ بول کر پر سکون ہو جاتے ہیں۔

میں کیوں اس مہذب معاشرے کا موازنہ اپنے بے ضمیر معاشرے سے کر رہی ہوں۔

"کیا ہم گھر واپس جا سکتے ہیں؟" اک جہاں کا درد بھرے وہ بولی تو، عادم گئی دیر تک اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگاتا رہا پھر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

☆☆☆

دروازہ کھول کر عادم نے اسے اندر داخل ہونے کو کہا پھر پوچھنے لگا۔

"آپ کچھ کھانا چاہیں گی؟"

"نہیں، میں صرف سونا چاہتی ہوں۔"

اسے مزید سنے بغیر وہ کمرے میں چلی آئی، بیڈ پر خود کو گرا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میرا بھائی، کیوں؟ آخر کیوں؟" وہ کس سے گلہ کرتی، کس سے شکوہ، اپنے آپ کو لاکھ سنبھالنے سنبھالنے کے باوجود بھی وہ اجنبی لوگوں پر آشکار ہونے لگی تھی۔

وہ اپنی سوچ کو خود ہی احتسابی کٹہرے میں کھڑا کیے خود ہی سوال خود ہی جواب دینے لگی۔

اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی، وہ بھی وہی عام سی سوچ رکھنے والی شہری تھی جو اپنی غلطیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں، اپنی اصلاح کی بجائے دوسروں کی اصلاح کے خواہش مند۔

ایک علیحدہ وطن قومی زبان، لباس اور اپنی شناخت کے خوبصورت الفاظ کی قلعی اب نظر سے اتر چکی ہے اور اصل حقائق منہ چڑانے محسوس ہونے لگے ہیں کہ الگ وطن مگر کس کا پنجابیوں کا، سندھیوں کا، بلوچوں یا پھر پختونوں کا، وہ رو دھو چکی تو کاغذ قلم لے کر اپنے اندر ابھرتے طوفان کو لفظوں میں روشنی کاغذ پر ثبت کرنے لگی اور کمرے سے باہر عادم عثمان کھڑا تھا۔

"پھر بھی یہ کون سا قومی لباس، کون سی شناخت، اپنی تہذیب و ثقافت؟ لباس تہذیب و ثقافت سے لے کر کلچر تک یہ ہندوستان کے مرہون منت ہیں تو مذہب کے معاملے میں سعودی عرب کے ہمیشہ زیر اثر اور کرچی عرصے کی بات کرو قومی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی نادی میں قومی خزانہ۔"

کیا وہ درست نہیں کہہ رہا تھا؟ اصل پہچان تو آج بھی کہیں ادھر ادھر سے پکڑ کر اپنا لیبل لگا دیا، جعلی شناخت، چھیاسٹھ سال آزادی جو بے جا جانوں کی خون کی ندیاں بہا کر حاصل کی گئی، وہ تو کبھی ہم تک پہنچی ہی نہیں ہم اک منافق ہجوم کا نام جو نقلی آزادی کے نام کے ایک بھیانک قفس میں قید چاروں اطراف سے مظالم کی لڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنے تمام تر انسانی حقوق سے محروم جنگلی جانوروں سے بدتر زندگیاں گزار رہے آزاد و خود مختار قوم، عادم عثمان تو یہ بھی کہہ رہا تھا۔

"چھیاسٹھ سال بعد بھی آپ پاکستانیوں کو ان کے مذہبی و انسانی حقوق سے محرومی کیوں؟" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔

روشنی نے ہاتھ میں پکڑے قلم کی نوک کو سامنے رکھے سفید کاغذ کے قریب کیا، اک جھنجلاہٹ، بے بسی، تلخ سچائی اور حقیقت پر مبنی آواز۔

"گزشتہ 66 برسوں سے آزادی تو آج بھی آپ کے لئے ایک سراب کی مانند ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان جس میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں، اسلام کی تعلیمات سے دور دور کا واسطہ نہیں اور اخلاقی غلاظت کے اس ڈھیر کو آزادی کا دھوکہ سمجھے اپنی ہی کتنا موت کا سودا کر چکے ہو۔"

"ہندوؤں کے ہاتھوں شہید تھے اور اب مرنے والے شہید تو مارنے والے مجاہد ہیں، واہ ست خود مختاری، آزادی، فخر کہتے ہیں۔"

وہ جا چکا تھا اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا اب صرف روشنی تھی اس کے سامنے اس کے کاغذات پر ادھوری تحریر، دل میں درد، آنکھوں میں نمی اور سوچ، تلخ سچائی، ہاتھوں میں پکڑے قلم میں جنبش ہوئی اور وہ اپنی منتشر ہوئی سوچوں کو حقیقت سے روشناس کرنے لگی۔

اگر قفس کا نام بدل لینے کا ہی نام آزادی ہے تو پھر میرے ہم وطنو سب کو یہ آزادی مبارک، اگر ہندوؤں کی غلامی سے انگریزوں کی دربانی میں چلے آنے کا نام ہی آزادی ہے تو پھر یہ آزادی ہم سب کو مبارک ہو، بم دھماکوں سے گرتی روزانہ کی سینکڑوں لاشوں، کراچی میں ہوتی روزانہ کی بے نام اموات، صاف پانی کی

قلب، بجلی اور بیماریات، مذہبی و لسانی منافرت کا شکار ہوئی ہزاروں جانوں کو ایک بدنصیب پاکستانی کی زندگی مبارک۔

بجلی، پانی اور خوراک کے بحران میں جینے والوں، ایک خوددار قوم کا [illegible] مبارک، آئیں منائیں جشن اپنی بدنصیبی پر، اپنی بے بسی پر کہ ہم خود مختار آزاد قوم، باکردار، باوقار شہری، ان کے مفہوم سے بھی واقف نہیں کیا ہے کہ ہم تو یہ تک نہیں جانتے کہ یہ آزادی اور اس کی اصل روح کیا ہے؟

آہ! آزادی کب سے ادھوری پڑی تحریر مکمل ہونے لگی تھی اس کا قلم یہ کیا لکھنے لگا تھا، یہ کاغذات کن حقیقتوں سے بھرنے لگے تھے، یہ اس کی سوچوں کا دھارا کس جانب رخ ہوا کر چکا تھا۔

☆☆☆

"نوریہ! میں ایک مسلسل اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہوں، میں اس معاشرے کی فرد ہوں جہاں موت دنیا کی تمام تر چیزوں سے سستی اور بے وقعت ہے۔"

"میں اپنے بھائی کے قاتلوں کا گریبان پکڑ کر ان کا قصور پوچھنا چاہتی ہوں، میرا ضبط یہاں آ کر مزید ٹوٹ رہا ہے، میں وہاں واپس جانے سے خوف زدہ ہوں، نوریہ جانتی ہو میرے ہم وطنوں، حکمرانوں کے لیے میرے بھائی کی موت کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو، اک معمولی سی بات ہو، مگر میرے جینے کا واحد سہارا مجھ سے چھین لیا گیا، مجھے نہ زندوں میں چھوڑا نہ مردوں میں۔" وہ ایک بار پھر تڑپ تڑپ کر رو دی، اک بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے نوریہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تمہاری تکلیف، تمہارے درد کو میں محسوس کر سکتی ہوں۔" ایسے ہی الفاظ جو نوریہ حرف تسلی کے لیے اسے کہہ رہی تھی، کوریڈور سے گزرتے عارم کے قدم سست روی سے بڑھنے لگے۔

"تمہارا کرب، تمہارا درد تمام عمر تمہیں یونہی رلائے گا جب جب تم اپنے بھائی کو یاد کرو گی تمہیں اپنی بے بسی پہ رونا آئے گا۔" نگاہوں کے بادل اس کے سراپے سے کہہ رہا تھا۔

"وردشا نے حسن تم یقین کرو یا نہ کرو، اس پوری دنیا میں تمہارے سوا ایک دل اور بھی تمہارے درد پہ دھڑکتا رہے گا، جب جب تم درد کی وہ انہی کرب سے گزرو گی۔" اس کے چہرے پر بکھرے درد میں ڈوبے نظروں کو صاف کر لی نوریہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور عارم حسن نے ان دونوں کو رونے دیا تھا، شاید یہ آنسو ان کا غم کم کر سکیں۔

☆☆☆

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، امریکی دنیا کا دار السلطنت نیویارک تھا تو نیویارک کا دار السلطنت ایمپائر بلڈنگ، وہ اور نوریہ بلڈنگ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئیں تو نوریہ اس سے کہنے لگی۔

"عارم اور آرزہ ہمیں یہیں ملیں گے، کچھ دیر ان کا انتظار کرنا ہوگا۔" نوریہ کے آنے کے بعد اس کی ملاقات عارم سے نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور جتنا اچھا گائیڈ تھا وردشا نے اتنی ہی بری سیاح، آخری ملاقات پہ اپنی امریکہ کے لیے نفرت وہ اس پہ دوبارہ شو نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس کی آمد کی خبر اسے ذرا بھی اچھی نہ لگی، اک عجیب سی تنگی سی سرایت ہوتی جا رہی تھی، خود کو پرسکون کرنے کے لیے وہ اردگرد پھیلی خوبصورتی اور نفاست دیکھنے لگی، عین سامنے بلند چھت سنگ مرمر سے آراستہ ایک راستہ تھا، اک لابی جس کے سامنے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی ایک شبیہہ تھی، اس کی آخری منزل کے گرد ایک ہالہ جو روشنی کی زد میں ایک مسیحا سا معلوم ہوتا۔

"ویری سوری، ہم لیٹ ہو گئے۔" وہ خیالوں میں گم تھی جب اپنے پیچھے ابھرتی آواز نے اس کی توجہ کھینچی، بے ساختہ گردن گھما کر اس نے دیکھا، آرزہ کے برابر وہ اپنی تمام تر وجاہت اور زندہ دلی کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے بے اختیار نگاہ ہٹا لی، وہ مختلف آپس میں گفتگو کرتے پھر وہ رہبر بنے اس شاندار شبیہہ کی جانب بڑھنے لگے، مختلف راہداریوں سے گزرتے، سیاحوں کے جھمیلے میں سے وہ دوسری منزل پر آپہنچے، عارم نے رک کر ٹکٹ خریدے، قطار میں کھڑے وہ لفٹ تک آ ٹھہرے۔

"اس کی شہرت سے تو آپ یقیناً واقف ہوں گی۔" اس کے مقابل ایک بار پھر اپنے گائیڈ والے فرائض سنبھالے وہ اس کے سر پر سوار تھا، وردشا نے ہلکے سے سر گھما کر عارم کی جانب دیکھا، اس کا طرز انداز اسے مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا جبکہ آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر دکھائی نہ دیا، بے ساختہ ہونٹ بھینچے اس نے نفی میں سر ہلا دیا، ذرا آگے نوریہ اور آرزہ ایک دوسرے سے باتیں کرتیں چلتی جا رہی تھیں۔

بلڈنگ کی 86 منزل پہ پہنچ کر وہ لفٹ سے باہر آئے، سامنے ہی ایک ریسٹورانٹ اور کھانے پینے کے سٹالز دکھائی دیے، وہ ان سے گزرتے کھلی فضا میں تیز ہوا کے شور میں آگئے، آس پاس کچھ نہیں تھا، کوئی عمارت نہیں سب کچھ نیچے بہت پیچھے رہ گیا یہاں تک کہ پرندے بھی۔

"یہ عمارت صرف ایک سال اور 45 دنوں میں تعمیر ہوئی تھی۔" وہ اپنے ملک کے شاندار تاریخی کارنامے دہرانے لگا۔

اس نے نیچے دیکھنا چاہا، پورا نیویارک قدموں کا بسیرا سا لگا، شہر کا شور یہاں آتے آتے دم توڑ چکا تھا صرف سناٹا سا تھا ویسا، بالکل ویسا جیسا اس کے اندر تھا، تیز ہوا اور حیرت کا یہ شکار اسے اپنی گرفت میں لپیٹنے لگا، آس پاس دیکھنے میں سے نیچے جھانکتے ہوئے اس کی نظر نیویارک شہر کو دیکھنے لگی جو کسی کھلونے ماڈل سے کم محسوس نہ ہوا۔

سر گھومنے، وہ دیکھنے کی حد تک بلندی پہ خود کو پا کر وہ چکرائی جیسے اک نرم ہاتھ نے بڑی نرمی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے پیچھے کھینچ لیا۔

"زیادہ نیچے دیکھنے سے اجتناب برتیے۔" بڑے سادہ انداز میں بولتا وہ چہرے سے مسکرایا، اس کا بازو اب تک عارم کے ہاتھ کی گرفت میں تھا، وہ اب سامنے آسمان کو دیکھ رہا تھا، اس نے ہلکے سے سر گھما کر نوریہ کو دیکھنا چاہا تو نگاہ شعلے ابھرتی نگاہوں سے ٹکرا گئیں، نجانے آرزہ کیا سمجھ رہی ہو گی، اس نے ہلکے سے اپنا بازو ان مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے نکالنا چاہا جبکہ دوسری جانب بھی بنا کسی مزاحمت کے چھوڑ دیا گیا، پھر وہ آخری منزل تک آئے، اب آرزہ عارم کا ہاتھ تھامے اس کے اور نوریہ کے آگے چل رہی تھی، اس نے عارم کو وردشا کی جانب متوجہ نہ ہونے دیا، اک ضدی بچے کی طرح اسے تھامے وہ چلے جا رہی تھی، وہ نوریہ کے ہمراہ چلتے انسانی شاہکار کی خوبصورتی دیکھتی رہی یہاں تک کے دھوپ کی کچھ زردہ غروب کی منتظر کرنیں رہ گئیں اور تب رم شام اتر آئی، سو یہاں سے لوگوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

واپسی کا سفر بڑا عجیب سا تھا، وہ چاروں ایک انڈین فوڈ کورٹ میں آبیٹھے، عارم آرڈر کے لیے کاؤنٹر کی جانب بڑھا تو آرزہ، وردشا سے

پوچھنے لگی۔

"آپ کی واپسی کب ہے؟" بظاہر اس کا لہجہ اس لمحے نارمل تھا جبکہ حساسیت میں لپٹی روشنی کو عجیب ضرور محسوس ہوا۔

"شاید ابھی کچھ دن اور رکے گی۔" اس کی جگہ جواب فوریہ نے دیا۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا ملک؟" اب کی بار انداز ذرا مغرورانہ اور نخوت بھرا ضرور تھا اور روشنی نے آنزہ کی جانب دیکھا جبکہ عادم جواب آیا۔

"اب تو آپ کو یقین آ گیا ہو گا ہم ایک بڑی اور عظیم قوم ہیں، ہمیں دنیا کی واحد سپر پاور کہا جاتا ہے، ہم آپ سے ترقی میں بے حد آگے ہیں، اتنا بڑا رقبہ رکھنے پر پھیلا ملک، آپ جیسے کئی چھوٹے چھوٹے ملک اس میں سما جاتے ہیں۔" عادم نے لب کاٹی روشنی کے چہرے کو دیکھا جہاں تاریکی سمیت کیا کچھ نہیں تھا۔

"دنیا میں ایک ہی سپر پاور ہے اور وہ ہم ہیں کوئی دوسرا ملک ہماری برابری نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بکاؤ قومیں تو بالکل ہی نہیں۔" اب کی بار اس کا لب و لہجہ روشنی نہ تھا، مسکراہٹ بھرا انداز، مغرور جملوں پر بھی اسے ایک جھٹکے سے زمین پر پھینک گیا۔

"یہ سپر پاور کا لیبل بھی تو آپ نے خود کو خود ہی دیا ہے۔" بولنا نہیں چاہتی تھی مگر کیا کرتی اپنے ملک کے خود غرض اقتدار اعلیٰ کی طرح نہ تھی۔

"اور بکاؤ قوم کا لیبل بھی تو آپ نے خود اپنے پر لگوایا ہے۔" ہاتھ میں تھمے چھری کانٹوں سے کھیلتی بولی تو فوریہ کو مداخلت کرنی پڑی۔

"آنزہ! دنیا کی ہر قوم اپنے ہونے پر فخر کرتی ہے۔"

"کرتی ہے فخر ہونا بھی چاہیے مگر کسی ملک کا سودا کرنے والے اور دوسری قوم کی بربادی میں حصہ ڈالنے والے کس منہ سے فخر کر سکتے ہیں؟ سکون ہم کر آپ کا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جو معمولی نوعیت کے ذاتی مسئلے بھی حل نہیں کر پاتا ہے جہاں زمینوں کے قائل اپنے لوگوں کو جو جیتے صاف پانی کی کمی اور پیاس سے اور اگلے چھ ماہ وجہ مر جاتا ہے مگر زعیم نہیں بتاتے ایسی قوم غیرت اور عزت کی باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں۔"

اس کے اندر بڑی نفرت اور حقارت دکھائی دیتے رہی تھی، روشنی کے چہرے پر ندامت پھیلی تھی اور کیوں نہ پھیلتی وہ سب کچھ فراموش کر کے حقیقت سے آنکھیں بند کیے چلتی رہتی، اس کے چہرے پر شرمندگی کے احساس نے فوریہ اور عادم کو موضوع تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا، تیتروں کی گفتگو تھی جبکہ وہ اب بھی اس کرب میں تھی وہ ان کے ساتھ ہو کر بھی، کراچی میں جلتے شعلوں میں آ کھڑی ہوئی وہ معصوم بم دھماکوں سے مرنے والی لاشوں پر ماتم کرتی اس پرسکون، زندگی بخشنے والے ماحول سے دور تھی۔

واپسی کا سفر بڑی خاموشی سے کٹا، فوریہ اور آنزہ کو ان کی منزل پر اتارنے کے بعد وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے، بلڈنگ کی لفٹ تک سفر انتہائی سست روی سے پار کرتے عادم نے روشنی کے تاریکی میں اور بے سراپے کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری، آنزہ کو ایسا رویہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" لفٹ کا بٹن پریس کرتے وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"نہیں، میں ان کی باتوں کا برا کیوں مانوں گی۔" انکار افسردگی سے غیاب کر رہی تھی، حالانکہ آنزہ کی باتیں اس کے اندر ایک قیامت برپا کر چکی تھیں، خود پر جبر کے سوا کوئی راہ نہ دکھائی دی تو خود کو سنبھالنا پڑا مگر یہ عادم۔

"روشانے، اگر آپ مجھے غلط نہ سمجھیں تو ایک بات کروں؟" وہ عادم جیسے کسی پر جود رہا تھا۔

"اتنی حساسیت آپ کے لیے نقصان دہ ہے، اپنے ارد گرد پھیلے حالات کو اپنے جیسے تمام لوگوں کی طرح قبول کر لیجیے، خوشیاں جھولی میں گرتی نہیں انہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔" اس کا نرم لہجہ نارمل نہیں تھا کہ بے ساختہ وہ بول اٹھی۔

"میرا سب کچھ چھین گیا میں اپنی خوشیوں کو آگ لگانے والوں سے احتجاج بھی نہ کروں۔"

"روشانے احتجاج آپ کا حق ہے، ضرور کیجیے لیکن ارد گرد پھیلی حقیقتوں کو فراموش مت کیجیے، ہم کمزور تھے کرتیں خود کی بنیاد اس کو طاقت ور بنا کر برابری کیجیے۔" وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو وہ غلط لوگوں کو قصور وار ٹھہرا رہی ہے۔

"جی بالکل آپ کی برتری کا میں کیا کہوں، وہ تو کل عالم میں رہیت نام، اسرائیل، عراق، افغانستان اور وزیرستان میں نظر آتی رہتی ہے، اپنے کسی مارے جانے والے ساتھی کی لاش تک دیران پر نہیں رکھاتے کہ یہ انسانی حقوق کا معاملہ ہے اور ڈرون حملوں سے مرنے والے بے گناہ معصوم لوگ، یہ سب دہشت گرد۔" آنزہ کی اذیت ناک باتیں اس کے اندر اٹھتے لاوے کو باہر نکال لائیں، روشنی کا لہجہ دکھائی لیے ہوئے تھا، رات کے اس پہر وہ دونوں لفٹ کے اندر کھڑے تھے۔

سکینڈ فلور پر لفٹ رکی تو وہ دونوں دائیں بائیں بنے فلیٹس کے درمیان کوریڈور میں رک گئے۔

"یا آپ اپنی کمزوریوں کو ہم پر کیوں تھوپ رہی ہیں؟" وہ کہتا ہوا اس کے بالکل سامنے آ گیا۔

"اس حقیقت کو قبول کیجیے کہ آپ کے بھائی کو آپ کے اپنے شہریوں نے مارا ہے بالفرض اگر نہیں تو آپ کی ریاست کا کمزور کھوکھلا نظام انہیں تحفظ نہیں دے سکا، آپ کا ملک اپنے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت میں ناکام ہو چکا ہے، سرحدوں پر بیٹھے شہیدوں کی موت کی آرزو کرنے والے دشمنوں سے بچانے والے اپنے ملک کے لوگوں کو اندرونی سازشوں اور طاقتوں سے نہیں بچا پا رہے۔" الفاظ تھے کہ نشتر جو اس کے وجود کے آر پار ہوتے اسے ذلت و رسوائی کے گڑھے میں پھینک گئے، اک کرب سے اس نے آنکھیں میچ لیں، جبکہ عادم مسلسل بولے جا رہا تھا۔

"سرحدوں پر اتنی حفاظت کیوں؟ کیا صرف زمین کے ٹکڑے کو بچانا مقصود ہے ان زندگیوں کی کوئی اہمیت نہیں جنہیں بے دردی سے قتل کیا جا رہا ہے، دس لاکھ سے زائد فوجی طاقت رکھنے والا خود کو ایٹمی میزائل سے بالا مال سمجھنے والا وطن، اپنے ہی ملک کے شہریوں کو تحفظ نہیں دے پا رہا اور آپ جیسے جھوٹی خودداری تسلیوں اور خوابوں میں جی رہے ہیں۔"

روشنی نے ڈبڈباتی نظروں سے اسے دیکھا، اس کے دیکھنے ہی وہ اچانک چپ ہو گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جیسے اس کی بچی کچھی عزت پر ماتم کر رہے ہوں، عادم کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے اس نے دوبارہ سامنے دیکھا وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا، عجیب سے احساس نے اس کی دل کی دھڑکن یک دم تیز کر دی تو وہ نظریں جھکا کر بے ساختہ پیچھے کھسکنے لگی، جب ہی اسے فون بیل کی آواز سنائی دی تو عادم چونک اٹھا، عادم کا سیل فون بج رہا تھا، اس نے بٹن پریس کر کے ریسیو کیا اور اب فون پر بات کر رہا تھا۔

"آپ جانیں۔" اسے یونہی کھڑا دیکھ کر، وہ فون پر بات کرتے کرتے ذرا دیر کو رکا پھر دوبارہ فون کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اسے اس شخص کی پل پل بدلتی کیفیت پر حیرانگی ہوئی، وہ پلٹ کر کچن کی جانب بڑھ گئی، چند قدم اٹھائے تھے کہ دروازہ کھلا، روشنی نے سر گھما کر دیکھا، وہ اب بھی فون پر بات کر رہا تھا۔

ان دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا، وہ نظریں چرا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی کمرے میں آ کر وہ کتنی دیر تک عادم کی خود پر جمی نظریں یاد کر کے الجھتی رہی، جبکہ عادم ہونٹ دانتوں تلے دبائے اپنی بے خودی پر اک سرد سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

خزاں اب صرف درختوں اور ان کے پتوں پر نہیں اتری، دلوں میں بھی اتری ہے اور بدن کو زردی سے بھر دیتی ہے۔

نوریا کی سنگت میں اس نے نیویارک کے بیشتر مقامات دیکھے، میٹروپولیٹن کے میوزیم جو اپنے اندر گہری تاریخ رقم کیے تھے، نیویارک کا دل کہلانے والا وال اسٹریٹ اور بلند و بالا عمارتوں کا مجموعہ سنہری مجسمے کے گرد [illegible] کرتی روشنیں اور مسکراتی مچلتے مقام، ہر وہ مقام جو دنیا میں اپنی شہرت رقم کرتا تھا، جہاں کے حسین اور خوش لباس لوگ، جو زندہ رہنے کا حق رکھتے تھے ان کے چہروں پر روشن زندگی کے رنگ دیکھیں شاید ان کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہو کر اسے زندگی کے قریب لے جاتی اور وہ اپنا دکھ بھول جاتی، وہ اس ملک کا موازنہ اپنی سرزمین سے نہیں کر سکتی تھی، یہ وہ ملک تھا جہاں ایک معذور شخص کے اشارے پر نیویارک کی ہر بس رک جاتی تھی چاہے سٹاپ ہو یا نہ ہو، وہ سڑک پار کرنا چاہتا تو ٹریفک تھم جاتی، سفر پر [illegible] تو ایک فون کال پر خصوصی وین آ جاتی ہے جو قوم انسانیت کا تحفظ کرنے والی بھی اپنے ملک کے افراد کے لیے کیوں نہ ہوا، وہم [illegible] جو صرف اپنے لیے سوچ سکتے تھے سربراہ ملک سے لے کر ایک عام آدمی تک ہم صرف اپنے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں، انسانیت سے دور تک کوئی واسطہ نہیں رکھنے والے شہری بے حس شہری، غفلت میں جیتی قومیں ایسے ہی معذور کی حق دار ہوتی ہیں۔

☆☆☆

صبح وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، اس کا انداز تھکا تھکا سا تھا، آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے آنکھوں کے سامنے اچانک لرزتی پلکیں اور بھیگا چہرہ لہرانے لگا۔

"روشانے!" بے اختیار اس کے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا تھا، دل نے جو دیکھا نظریں بھی اب وہ دیکھ سکتی تھیں، محسوس کر رہی تھیں، اس کے بے آواز آنسو سسکیوں میں بدلنے لگے۔

اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکان آئی تھی وہ آئینے میں اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا، وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گیا، ناشتے کے لیے گھر سے نکلنے کا سوچا جب کچن کے پاس سے آتی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔

"بریک فاسٹ؟" کرسٹی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں" وہ کچن میں آ گیا، اس نے فریج سے دودھ نکالا اور اپنے لیے نکالنے جانے لگا، کرسٹی اپنا بریک فاسٹ لیے لاؤنج کی جانب چل دی [illegible] جا کر اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔

گو یہ ایک بے اختیاری میں ہوا تھا مگر اس پل جب وہ خود کو ایک دم تر و تازہ محسوس کرنے لگا،

پھر وہ اپنے اندر کی آوازوں، اس شور سے گھبرایا تھا۔

رات کے اس پہر دل کیوں چاہا تھا کہ وہ اس کے آنسو صاف کرے اس سے کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں رو رہی ہو، میں تمہیں کبھی کوئی تکلیف، کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔

نیویارک کی گلیوں میں پھرتے پھرتے وہ نم آنسو والی لڑکی اس کی سوچوں میں آ کر ٹھہر گئی تھی، اپنے اندر ابھرتے اس شور نے اسے اکتا دیا کر کال ختم کر کے وہ فلیٹ سے نکل آیا۔

☆☆☆

پھر کئی دن بیت گئے وہ عادم کا سامنا کرنے سے کترانے لگی، نوریا اور کرسٹی کے ساتھ ہی زیادہ وقت گزارنے لگی، عادم بھی گھر پہ کم دکھائی دیتا۔

پورے چاند کی روشنی میں یہ روشنیوں کا شہر اور بھی خوبصورت لگتا تھا، آج کل وہ ڈائری کو پھر سے کچھ لکھنے لگی تھی، لکھنے کا عمل اسے سکون بخشتا تو وہ خود کو بہتر محسوس کرتی۔

ابھی بھی لکھتے لکھتے تھک گئی تو اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی، سڑکوں پر بھاگتی زندگی کو دیکھ کر وہ کیا مزید لکھے سوچنے لگی۔

تبھی عادم کے کمرے سے ہلکے میوزک کی آواز ابھری، وہ بڑی مدھم سی آواز میں گنگنا رہا تھا کوئی نغمہ گا رہا تھا، ذرا غور سے سننے پر رات کے اس پہر الفاظ واضح ہونے لگے۔

Ugly sounds are overhead
And the streets are
colourid red
Your live lost every day.
It,s always been that way
But we believe one day
we,ll ser,
A world at prace, in
hasmony,
And that is why we say
No was will stop us singing
Our voice will stay strong.

وہ نوریا کے ساتھ فیری کی واقفیت کے لیے پہنچی تو عادم سمیت سب انہی کے منتظر تھے، عادم، آئزہ اور نوریا کے کچھ قریبی ساتھی ان سے کافی خوشدلی سے ملے جبکہ آئزہ نے اسے اگنور کیا تھا، عادم نے بھی قصداً اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی آمد کا نوٹس لیے بغیر وہ نوریا سے محو گفتگو تھا، جانے کیوں اسے تکلیف ہوئی تھی، آج سے کچھ عرصے پہلے وہ اسے یوں نظر انداز کرتا تو وہ پروا بھی نہ کرتی لیکن آج وہ بے کلی سے پہلو بدلتی اردگرد موجود خوبصورتی کو دیکھنے لگی۔

فیری کے سفر پہ وہ سب گروپ کی شکل میں لطف اندوز ہو رہے تھے، جبکہ وہ نوریا کے ساتھ فیری کے آخری سرے پر کھڑی سمندر کی یخ بستہ ہوا کو محسوس کر رہی تھیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

"میں نکاح کے بعد عادل کے ساتھ یہاں آئی تھی؟" نوریا کی رنجیدہ آواز اسے اس سحر زدہ ماحول سے باہر لے آئی، گردن گھما کر اس نے نوریا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں آج بھی اس کے بھائی کی جدائی کا درد چھلک رہا تھا۔

"ہم عمر بھر ساتھ نہ رہے مگر اتنی جلدی عادل چلا جائے گا ایسا تو میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔" وہ دور سمندر کی ابھرتی لہروں پر نگاہیں جمائے کسی خیال میں گم بول رہی تھی، اس کا لہجہ

اس کے بھائی کے غم میں بھیگا تھا، عادل بھائی آج بھی نوریا کے لئے اہم تھے چاہے درد کی صورت میں ہی وہ اس کے بھائی، سیاہ سمندر بارشوں میں بھیگے سوئے ہوئے کے لئے اداس اور دل گرفتہ تھیں۔

نوریا نے سر جھٹک کر خود کو ماضی کی یادوں سے آزاد کرواتے ہوئے روشنی کو مسکرا کر دیکھا۔

"بہت خطرناک ہے گہرا سمندر، دکھوں کو کم کرنے! یوں کہوں دکھوں کو چھپانے کی پناہ گاہ ہے۔" جواباً وہ دھیرے سے مسکرا دی تبھی عادم نوریا کو پکارتا ان کے قریب چلا آیا۔

"نوریا آنٹی، عادم۔"

"کافی پینے چلیں؟"

"آپ جائیے، میں کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی۔" اس نے آہستگی سے چلنے سے انکار کیا، وہ کچھ دیر اور یونہی کھڑے رو کر اپنے دکھ ان لہروں کو نذر کرنا چاہتی تھی، سمندر کی وسعت کا صحیح اندازہ اسے یہاں آ کر ہوا تھا، نوریا جا چکی تھی اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ چلا گیا تھا یا وہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا، وہ ساکت کھڑی سمندر میں شور مچاتے پانی کو دیکھتی رہی، جبکہ عادم اسے چپ چاپ کتنی دیر دیکھتا رہا، پھر بالآخر چند قدم گھسیٹ کر اس کے نزدیک آیا اور اس کے بالکل مقابل کھڑا ہو گیا۔

"یہ سمندر بھی بہت خونی ہے جانے اپنے اندر کتنے بے گناہوں کو چھپائے بیٹھا ہے، اسی لئے اپنے دکھوں اور آنسوؤں کو اس سفاک کے سپرد کرنا بھی زیادتی ہوگی۔"

"بس کس کس زیادتی کا حساب لے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"اوہ" جواباً وہ اک لمبا سانس ہی بھر سکا۔

"آپ بہت اچھا گنگناتے ہیں No one was will stop us singing" اس نے اک لائن دہرائی۔

"روشانے میری بات غور سے سنیں۔" وہ اسے مزید بولنے سے ٹوک گیا اور قدرے اکھڑے انداز میں کہنے لگا۔

"Suffer صرف آپ اکیلی نہیں، لاکھوں اور بھی ہیں، آنسو بہانے اور غم زدہ رہنے سے حالات نہیں بدل سکتے، دوسروں کے درد کو اپنا سمجھ کر دیکھیں گی تو زندگی کا مقصد بھی مل جائے گا اور اپنا غم بھی کم ہو جائے گا، میں آپ کے سکون کے لئے ہمیشہ دعاگو رہوں گا۔" وہ اسے دیکھے بنا مڑ کر اندر چلا گیا اور وہ، وہیں سمندر کے درمیان تن تنہا کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ اٹھ کر باہر آئی تو گریٹی کو بریک فاسٹ بناتے پایا۔

"لائیں گریٹی آج بریک فاسٹ میں آپ کے لئے بناتی ہوں۔" وہ کاؤنٹر کراس کر کے اوون کے قریب کھڑی گریٹی کے پاس چلی آئی۔

"بریک فاسٹ تو میں بنا لوں گی ہاں تمہاری ہیلپ ضرور لوں گی۔" بڑی محبت سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔

گریٹی کے ساتھ وہ بریک فاسٹ تیار کرنے لگی، ابھی دکھ ہی رہی تھی جب گنز بار تک کا الاپ تا وہ چلا آیا، روشنی نے اسے دیکھنے کی ذرا کوشش نہ کی۔

"جوائن کرو ہمیں۔" گریٹی نے اسے ناشتے میں شامل ہونے کی آفر کی تو "شیور" کہتا وہ اسٹول گھسیٹ کر عین اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"آج ناشتہ روشانے نے بنایا ہے۔" جانے کپ میں اٹھتے دھوئیں کو دیکھتا وہ ذرا سا لب مسکرا دیا۔

روشانے نے اک سرسری نگاہ ڈالی اور ناشتہ کرنے لگی۔

"تم بہت اچھی بچی ہو، خدا تمہیں خوش رکھے، یونہی مسکراتی آباد رہو، اتنی جلدی جانے کا فیصلہ کر لیا کچھ دن اور رکتی۔" گریٹی نے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اس کی واپسی کی اطلاع دی تو عادم چونک اٹھا۔

پچھلے ایک ماہ سے وہ اسے لئے اپنا شیڈول متاثر کرتا گھوم رہا تھا اور وہ اسے اپنے جانے کی خبر بھی نہیں کر سکی، غصہ تو بہت آیا مگر خود کو کنٹرول کرتا وہ لاپرواہ بنا بیٹھا رہا۔

"مجھے یہاں آئے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے اور میری چھٹیاں بھی ختم ہونے والی ہیں۔"

"یہ کمی بھی رہتا جب تک یہ ظلم اپنی طاقت دکھاتا رہے گا امید کا دیا ضرور روشن رہے گا۔"

"گریٹی، ظلم کی طاقت میں ملاوٹ کا عنصر زیادہ ہے، سب بیکار باتیں ہیں کئی ماتم زدہ چہرے، جانے کس کا کیا اصل ہو۔" وہ بڑے سخت لہجے میں بولا اور یہ تلخی اور کھردرا پن اس کے چہرے پر بھی آ گیا تھا۔

روشنی کا چہرہ تپ گیا مگر خاموشی میں ہی عافیت جانی لیکن سامنے والا اس کے تاثرات بخوبی سمجھ گیا تھا۔

"آپ معاف کیجئے، میرا اشارہ آپ کی جانب نہیں، گریٹی کو اصل حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔" تب فوراً ہی اپنی ٹون نارمل کر کے اپنے سخت جملے کا اثر زائل کرنے کے لئے بولا، وہ مزید بحث اب نہیں چاہتی تھی، یونہی ہنوز خاموش رہی، جبھی گریٹی بجتا فون سننے اٹھیں تو وہ دونوں رہ گئے، وہ بھی اس کو دیکھے بغیر اٹھ گیا تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے چلی آئی، قدموں کی آواز پر وہ پیچھے مڑا اسے دیکھ کر وہ ایک پل کے لئے حیران ہوا تھا۔

"میں آپ سے اپنے رویے کی معافی مانگنا چاہتی ہوں جو میں نے کہا وہ صحیح ہو یا غلط نہ ہو مگر میں کسی کا دل دکھا کر اس گلٹ کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"معذرت تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے، پچھلی کچھ ملاقاتوں میں، میں شاید اوور ری ایکٹ کر گیا تھا، مجھے کوئی حق نہیں تھا، میں آپ کو وہ سب کہتا، آپ اپنی سوچ اپنے تجربے کے حساب سے رکھتی ہیں، جہاں تک معافی کی بات ہے تو اس کی ضرورت نہیں، میں نے آپ کو غلط سمجھا نہیں جو آپ نے کہا اور میں نے کہا وہ ایک لاحاصل بحث ہے کبھی نہ بدلنے والے حالات والی بحث جیسے ٹی وی ٹاک شوز میں ہوتی ہے، ٹاک شو ختم سب ختم بھول جائیں۔" وہ کہہ کر چلا گیا لیکن وہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی، اس کے لفظوں کے ساتھ اس کا لہجہ بھی کتنا بے گانہ تھا، اس نے دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا آہستہ آہستہ سامنے کا منظر دھندلاتا گیا، اگلے پل وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ قریبی دوستوں کے لئے تحائف خریدنے نوریا کے ساتھ مال آئی تھی، نوریا ہی چیزیں پسند کر کے اس کے سامنے رکھتی گئی اور وہ خاموشی سے اٹھاتی جاتی۔

"تم کچھ پریشان ہو۔" شاپنگ ختم ہونے کے بعد نوریا نے اسے ایک بڑا احساس ہوئے آ گئی، اس کی غائب دماغی کو، وہ مسلسل نوٹ کیے تھی سو اس کا اظہار بالآخر کر ڈالا۔

"نہیں، میں پریشان نہیں ہوں۔"

"روشانے، کوئی دکھ ہے تو شیئر کرو۔" وہ

اسکرین سفید کرتی اور وائپر کے مسلسل حرکت کرنے باوجود اسے صاف کر برے کرنے جاتے اور راستہ دکھائی دینے لگتا۔

جہاں سڑک وسیع ہوتی وہاں تیز ہوا کا شور کار کی بند کھڑکیوں میں سے اندر آنے لگتا، خاموشی سے گرتی برف ہوا کے زور سے بے بس ہو گئی اور راہ میں آنے والے برابر کے قدیم جنگلوں کے جھنڈ خزاں رسیدہ پتے جو اپنی ڈالیوں سے جدا ہوئے اور ان کی زردی برف کی سفیدی پر حاوی ہو گئی، راستہ دیکھنا مشکل ہو گیا برف گرتو کار کے وائپر سمیٹ سکتے تھے لیکن بے زرد پتوں کا جھرمٹ ان کی پہنچ سے باہر تھا، عادم نے سائیڈ پر کار روک کے ونڈ اسکرین صاف کرنا شروع کی، وہ اتر کر اس کے ساتھ پتے سمیٹنے لگی۔

"آپ اندر بیٹھیں ہوا کافی تیز ہے۔"

"تو کیا ہوا اڑ تو نہیں جاؤں گی۔" جواباً وہ ہنس کر بولی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا، سمٹے پتوں کو ہوا میں اچھالا اس کا بازو تھام کر رخ اپنی جانب کرتا بونٹ پر بیٹھ گیا، اس کی اس حرکت پر وہ دنگ رہ گئی، وہ اب بھی مسکرا رہا تھا، بڑی پرشوخ نرم دلربا مسکراہٹ تھی اس کے اندر دھڑکن مچل مچل جانے لگی، اس کے ہاتھوں میں تھمے زرد پتے لے کر اس نے وہ بھی ہوا میں اچھال دیے۔

"میں ہرگز آپ کو اڑنے نہیں دوں گا۔"

بڑی مدھم مگر گہری آواز میں وہ گویا ہوا، لرزتی آنکھیں اپنے سامنے روشن چہرے پر ٹھہر گئیں۔

برف باری کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا، وہ عادم کی آنکھوں میں ابھرنے تاثرات کو سمجھنا سمجھنے کے مرحلے سے گزرتی پلکے سے جھپک رہی، وہ ہاتھ میں تھمی برف میں ہواؤں میں بھیگ رہے تھے ہوا کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

رات کے اس پہر جاڑوں اور خاموشی میں ہوا کے شور نے ساتھ اس کے اپنے دل کا شور بھی ہوا اور بڑھتی آواز اس تک پہنچی وہ پلٹ کر گاڑی کی جانب بڑھ گئی، اس نے عادم کو خود سامنے دیکھنے سے خود کو روکا، وہ ونڈ اسکرین کلیئر کر چکا تھا وہاں اب یوں تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، چند سیکنڈ بعد وہ کار میں آ بیٹھا اور باہر بڑھتی سردی محسوس کرتے ہوئے اس نے ہیٹر آن کر دیا، پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ سامنے دیکھنے لگا، جانے کیوں روشنی کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنی اس حرکت پر مضطرب ہو، اس نے خود کو کھڑکی سے باہر دیکھنے میں متوجہ کر لیا، ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہونے تک گاڑی میں صرف خاموشی چھائی رہی پھر لاؤنج میں پہنچ کر وہ اپنا بیگ تھامتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"مجھے برداشت کرنے کا شکریہ۔" اک دبی مسکراہٹ عادم کے لبوں پر ٹھہر گئی، وہ پلٹی۔

"روشانے پھر کب آئیں گی؟" لاؤنج کی جانب بڑھتے قدم عادم کی آواز نے روک دیے، دھیرے سے گردن گھما کر اس نے دیکھا، وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"کبھی نہیں۔" وہ اس کے قریب آ کر رکا تو نفی میں سر ہلاتی وہ گویا ہوئی۔

"کیوں؟" اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے اس نے قیاس کیا۔

"آپ وہاں آنا نہیں چاہتے تو پھر میں کیوں آؤں۔" وہ جانتا تھا وہ اسے لندن سے جانے والے انداز میں بول رہی ہے۔

"کس لیے آؤں؟" وہ بولا تو اسے حیران کر گیا، چند ثانیے وہ اس کے پوچھے گئے سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی جب خود ہی مزید گویا ہوا۔

"کیا آپ اس سوکالڈ امریکن سے انگوٹھی

پہننے کی۔

"کیا آپ اس نیچرل پاکستانی لڑکی کے ساتھ رہ سکیں گے؟" پل بھر کو وہ گڑبڑایا پھر چہرے پر بغیر شرمندگی کا کوئی تاثر لائے اسی سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے یقین ہے اک دن تمہارا یقین جیت جائے گا اور یہ لہو کا کھیل ختم ہو جائے گا، وہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مسکرائے گی تم اس قوم کی بیٹی ہو جس کی ایک عظیم ماں نے محمد علی جناح جیسے باکردار شخص کو پیدا کر کے دنیا کے نقشے پر تمہارے دیس کا نام رقم کر دیا۔" بھیگی نم آنکھیں تشکر سے مسکرا دیں۔

"ہے آپ کی۔" اس نے روشنی کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر انگوٹھی پہنانے کے لئے اس کا ہاتھ تھامنے کی اجازت چاہی اور نرمی سے ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

جہاز سمندری حدود میں داخل ہوا تو کھڑکی سے نیچے دور نیلے پانی کو دیکھتی وہ سوچنے لگی۔

"میرے بے گناہ بھائی، خدا کسی سے اس کا واحد سہارا نہ چھینے اے ظالم قاتلوں، جن کی خاطر ہم نے اپنا قبلہ بدلا انہوں سے بیگانہ بن گئے لہو اور آگ کا کھیل کھیلا، اپنے اقتدار اور اختیار کی خاطر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو زندہ درگور کیا، جب وقت کی گرفت میں آؤ گے تو کیا پاؤ گے، زندگی جس کے ایک پل کا یقین نہیں، اس کے بعد جس عدالت میں دو بدو ہو گے وہاں ہر وہ شخص انصاف کا طلب گار ہو گا اور اس عدالت کی سزا سے کیسے بچو گے، میں ماتھوں کی اپنے بھائی کا انصاف تب تمہیں کوئی بچا نہ سکے گا، تم سب اس لہو میں ڈوب گے، اے مولا! مجھے ہمت دے کے میرے لفظ بولیں سچائی پہنچتی رہیں اور میرا ضمیر زندہ آمین۔" دعا مانگ کر روشانے نے آنکھیں موند لیں بہت سے خوش آئند خواب پلکوں پر دستک دینے کے لئے بیتاب تھے۔

☆☆☆

مہ رخ بخاری

آسمان گہرے سرمئی اور کالے بادلوں سے کچھ یوں گھرا تھا کہ پانی بس ان سے چھلک پڑنے کو تیار کھڑا تھا، یوں تو ایسے مواقع ارما ہرگز نہیں گنوایا کرتی تھی، بارش کی ایک ایک بوند سے لطف اٹھانے کا تو مزا ہی الگ تھا لیکن فی الوقت جذبات پر قابو پانا بھی بہت ضروری تھا، آخر کو وہ اپنی ماں کی فرمانبردار لڑکی تھی اور ماں کی خدمت ہر طرح سے مقدم تھی۔

فہد اسے تھوڑی دیر پہلے نانو کے ہاں چھوڑ گیا تھا، یہاں آتے ہی پتہ چلا کہ ان کی دوائیں ختم ہو گئی ہیں، اب آگے اتنی لمبی رات آ رہی تھی، ابھی چند منٹ پہلے ہی انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اگلی صبح دوا کے لینے کا رسک ارما نہیں لینا چاہتی تھی، ڈرائیور بھی سہ پہر کو اپنے گھر چلا گیا

ناولٹ

تھا، نانو امی اس سے دوائیں منگوانا بھول گئی تھیں، اس بات پر بھی ارما کو کافی غصہ آیا کیونکہ نانو دوا وغیرہ کے معاملات میں بالکل بچوں کی طرح لاپرواہ تھیں اور شدید تپ چڑھی اس نے مہمان پر، مطلب منصور ولا میں آنے والا مہمان، ماموں کی گاڑی لے کر جو گیا تھا تو شام ہونے کو آئی واپس آنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور اس کا نام بھی ارما نے کوری۔

”اللہ جانے نام کیا ہے، یعنی حد ہو گئی ہے بھی کوئی شرافت ہے، نانو امی نے اپنے گھر رہنے کی اجازت کیا دی، ہاتھ پاؤں پسار کر لیٹ ہی ہو گیا۔“ اس نے ایک ان دیکھے، انجانے شخص پر دل ہی دل میں غصہ نکالا جس کے متعلق فریال نے فون پر بتایا تھا، پرس میں لسٹ اور پیسے ڈال کر وہ گیٹ سے باہر نکل آئی، عقیدت بوا اور نانو پکارتی رہ گئیں کہ موسم خراب ہے اکیلی مت جاؤ، لیکن اس نے ایک نہیں سنی تھی۔

یوں تو نادیہ دیکھی بھالی تھی اور راستہ بھی

مختصر تھا لیکن پیدل اکیلے جانے کا اتفاق آج پہلی مرتبہ ہو رہا تھا، اب اللہ جانے یہ پہلی مرتبہ پیدل جانے کا اثر تھا یا موسم کی ہولناکی کہ اسے ہرگز راستہ مختصر نہیں لگ رہا تھا۔ ابھی چوراہے تک پہنچا تھا کہ وہاں سے دائیں مڑنے پر قالبا اٹھارویں یا بیسویں دکان تھی، جونہی وہ چوراہے سے مڑی تیز تر بارش کا جیسے شاور کھل گیا، وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی گئی اور تادیبی خالی کر کے دم لیا، مطلوبہ دوا ایک ہی جگہ سے مل گئی لیکن بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، وہ بار بار دکان کی سیڑھیاں اتر کر لیکن بارش کا زور دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔

"تھوڑا سا انتظار کر لیں بی بی، بارش ابھی رک جائے گی۔" شاپ والا لڑکا سنجیدگی سے مشورہ دے کر شرافت سے رجسٹر پر جھک گیا، رابعہ سر ہلا کر باہر دیکھنے لگی، بارش کی تیزی میں تو واقعی کمی آگئی تھی لیکن اندھیرا اچھا خاصا بڑھ گیا تھا، رابعہ کو دور تک سڑک بھی ویران لگنے لگی تھی، شہر بھر کے رکشے ٹیکسیاں بھی نہ جانے کہاں جا چھپے تھے، پیدل جانے کا رسک اب وہ نہیں لے سکتی تھی، بارش دوبارہ تیز ہو سکتی تھی، وہ سیڑھیاں اتر کر اب سڑک کنارے آ کھڑی ہوئی اور ہاتھ کا چھجا بنا کر کوئی رکشہ ٹیکسی دیکھنے لگی، تبھی ایک تیز ہیڈ لائٹ سیدھی آنکھوں میں پڑی اور کوئی گاڑی عین اس کے سر پر آ کر رکی، رابعہ نے تیز روشنی کی وجہ سے بے ساختہ آنکھیں بند کر لیں، ٹھک کر کے گاڑی کا دروازہ کھلا اور قدموں کی چاپ۔

"ایکسکیوزمی، آپ رابعہ ہیں؟" کان کے قریب ایک بھاری مردانہ آواز گونجی تو اس نے پلکیں اٹھائیں، سیاہ کالی آنکھوں اور کھڑی ناک والا اونچا لمبا وجیہہ سا لڑکا یقیناً اسی سے مخاطب تھا۔

"آپ رابعہ ہیں تو پلیز [illegible]" عاجزی سے درخواست کی گئی۔

"آ...... آ...... آپ...... کون۔" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

"میں مبین علی ہوں، مجھے آپ کی نانی امی مطلب خدیجہ آنٹی نے بھیجا ہے بشرطیکہ آپ رابعہ ہی ہوں۔" لڑکے نے اطمینان سے وضاحت کی۔

"تو یہ ہے وہ نیا مہمان۔" رابعہ بنا کچھ بولے گاڑی کی طرف بڑھ گئی، مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ منصور ماموں کی گاڑی وہ پہچان گئی تھی۔

"آپ کچھ دیر ویٹ کر لیتیں تو میں خود یہ دوائیں لے آتا، ناحق آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" ماتھے پر بل ڈالے وہ باہر دیکھنے لگی۔

مسکراہٹ دبا کر مبین نے ایک نظر اس کے بالوں سے گرتے پانی کے قطروں پر ڈالی اور مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر کے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆

"چلیں مام...... آئی ایم ریڈی۔" وہ موبائل فون اور گاڑی کی چابیاں جینز کی جیبوں میں ٹھونستا تیزی سے سیڑھیاں اترا تو رابعہ نے بے ساختہ محسن کی طرف دیکھا۔

"وہ سعد بیٹا! ابھی تمہارے ابا نے فون کر کے اعظم بھائی سے آنے کی معذرت کر لی ہے۔"

"او رئیلی۔" سعد نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

"باہر موسم بہت خراب ہے بیٹا، بارش بھی ابھی خاصی تیز ہو گئی ہے اب ایسے میں نکلنا کافی عجیب سا لگے گا۔" اعظم بھائی بھی سمجھ رہے تھے اس کی بات کو انہوں نے بالکل برا نہیں مانا، کہہ رہے تھے آپ کا اپنا گھر ہے جب دل چاہے آ جائیں۔" محسن نے نرم لہجے میں وضاحت دی۔

"لیکن بارش میں ڈرائیو کر کے جانے کا تو اپنا ہی مزا ہے، یقیناً آپ نے منع کیا ہوگا۔" اس نے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا تو رابعہ جھینپ گئیں، وہ دونوں باپ بیٹا خوب جانتے تھے کہ بادلوں کی گھن گرج اور برستی بارش سے اسے کتنی گھبراہٹ ہوتی تھی۔

"اوکے، کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں، میں ابھی چینج کر لیتا ہوں، مجھے نئے چینلز کی ڈاکومنٹریز دیکھنی تھیں، وہ چیک کر لیتا ہوں، مام آپ ایک کافی بھیج دیں میرے روم میں۔" وہ فوراً ہی مایوس سا واپس پلٹ گیا۔

"کتنا خوش تھا آج سعد۔" محسن نے محبت سے جاتے ہوئے سعد کی پشت کو دیکھا۔

"کیوں نہ ہو، آج برسوں بعد وہ پہلی مرتبہ اپنوں سے ملنے جا رہا تھا، ساری زندگی اس نے رشتوں سے محرومی میں گزاری ہے، جانے کتنی شدید خواہش ہوگی اس کے دل میں اپنوں کے قریب جانے کی۔" رابعہ نے حسرت سے آہ بھری۔

"اچھا کوئی بات نہیں، آج ہمارا وہاں جانا شاید نصیب میں نہیں تھا، پھر بات اب آج بالکل کی ہے تو کہاں، اصل بات تو یہ ہے کہ اعظم بھائی نے اپنے دل اور گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے ہم پر کھول دیے ہیں، محض ایک سال پہلے تک جب ابا جی زندہ تھے ہم یہ بات سوچ بھی کہاں سکتے تھے، یہ تو اعظم بھائی کا بڑا پن ہے جنہوں نے اتنا مختصر وقت لیا فیصلے میں اور ابا جی کی خواہش کے برخلاف ہمیں نہ صرف معاف کر دیا بلکہ رابطہ کرنے میں پہل بھی کی، میں ان کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔" محسن خود کلامی کے انداز میں کہتے چلے گئے اور رابعہ خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔

☆☆☆

مبین نے شرٹ کے بٹن بند کیے اور کف لنکس لگاتے کمرے سے نکل کر بالکنی میں آیا، رات کی بارش کا اثر تھا کہ صبح بہت دھلی دھلی اور حسین لگ رہی تھی، بالکنی کے عین نیچے لان تھا، سبزے اور رنگ رنگ کے پھولوں کے بیچ سب سے خوبصورت منظر وہ تھا جسے دیکھتے ہی مبین ٹھٹک کر رک سا گیا، وہ رات والی لڑکی نیلے رنگ کے لباس میں اپنے کھلے لمبے بال دائیں شانے پر ڈال کر پھول چننے میں مگن تھی، گلابی رنگت، دھوپ کی تمازت سے سنہری جھلکی سی لگنے لگی تھی۔

"کیا بھلا سا نام تھا؟" وہ ذہن پر زور دینے لگا۔

"ولی، نہالہ، عمارہ، اور ہاں رابعہ۔" مبین نے ہلکے سروں میں شرٹ کی سیٹی بجائی اور اپنا ضروری سامان جلدی جلدی ہاتھوں میں لے کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا، دل و دماغ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ پارکنگ پہنچنے تک کہیں وہ لان سے چلی نہ جائے، اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش اس وقت ہر بات، ہر کام پر حاوی تھی، لیکن اس جذبے کا دورانیہ نہایت مختصر ثابت ہوا، آخری سیڑھی تک پہنچتے سوچ کے دھارے نے جیسے اسے گہری نیند سے جگایا اور یک لخت اس کے پیروں کو بریک لگ گئی، فطری شرمیلی سوچ ایکدم عود کر آئی، وہ یہاں جس مقصد کے تحت آیا تھا اس میں کہیں ایسی خوشیوں کی گنجائش نہیں تھی، اس نے تھوڑی دیر پہلے کی جذباتیت کو

خود ہی سلانے کی سعی کی اور قدرے سست روی سے پورچ میں آیا۔ لان کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"ایکسکیوزمی۔" باریک نرم آواز پر سبتین نے چونک کر سر اٹھایا وہ لان کی چار فٹ اونچی باڑھ کے پیچھے کھڑی یقیناً اسی سے مخاطب تھی کیونکہ وہ بھی ادھر دیکھ رہی تھی، وہ بنا کچھ بولے رک گیا اور وہ تقریباً بھاگتے ہوئے لان سے نکل کر پورچ میں آگئی۔

"آپ اسی گاڑی میں آفس جائیں گے۔" پھولی سانسوں پر اس نے بمشکل قابو پایا تھا۔

"وہ تو ہے ہی تھا لیکن ایسا کچھ ضروری بھی نہیں۔"

"وہ...... دراصل آج فریال اور میں نے مارکیٹ جانا ہے، اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو......"

"جی...... جی بالکل، مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔" اس نے فوراً چابی اورنا کی طرف بڑھائی جو قدرے جھجکتے ہوئے اس نے لے لی اور سبتین نے قدم گیٹ کی طرف بڑھائے۔

"بات سنیں۔" اورنا نے ہچکچاتے ہوئے دوبارہ مخاطب کیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"وہ نانو امی کو پتہ چلا تو مجھے بہت ڈانٹ پڑے گی۔"

"اوہ۔" سبتین بے ساختہ ہنسا۔

"نہیں پڑے گی، میرا ایک دوست اکثر مجھے یہاں سے پک کرلیا کرتا ہے، میں کہہ دوں گا اسی کے ساتھ گیا تھا، آپ بے فکر رہیں۔"

"تھینک یو۔" وہ خوشی سے کھنکتی ہوئی اندر دوڑ گئی اور سبتین جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچھ دیر بلاوجہ ہی اس داخلی دروازے کو تکتا رہا جہاں سے ابھی ابھی اورنا اندر گئی تھی۔

"کیا وہ جذبہ واقعی محض ناپسندیدگی تھا۔" ذہن نے سوال اٹھایا تو وہ سر جھٹک کر گیٹ کی طرف مڑ گیا، بنا اپنے دل کو جواب کی مہلت دیئے۔

☆☆☆

"وہ براؤن سوٹ زیادہ اچھا تھا ہے ناں۔" ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکوڑ کر فریال نے کافی پرسوچ نظر سامنے پڑے سرمئی سوٹ پر ڈالی۔

"تم بھی کتنا کنفیوز واقع ہوئی ہو، گھر سے نکلتے وقت کہہ رہی تھیں، برسوں سے گرے سوٹ نہیں بنایا اور اب مطلوبہ رنگ سامنے پڑا ہے تو براؤن پر سوئی اٹک گئی۔" اورنا نے ناراض لہجے میں شاپنگ سمیٹی۔

"میں تو نانو امی کو ابھی شاپنگ دکھانے جا رہی ہوں، تم نے اگر یہ سوٹ چینج کرنا ہے تو نانو کو دکھانے کی غلطی مت کرنا وہ دوسری مرتبہ ہرگز مارکیٹ نہیں جانے دیں گی۔"

پچھلے ایک ماہ سے اورنا اور فریال کی ایک ہی دھن تھی کہ نانی امی کا خیال رکھنا، خدیجہ حباب کو مہینہ بھر پہلے ہارٹ اٹیک آیا تھا اور بروقت طبی امداد کی بدولت ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی اب ان کی انجیو گرافی ہو چکی تھی اور وہ بیڈ ریسٹ پر تھیں، شروع شروع کے دنوں میں ان کی دونوں بیٹیوں آمنہ اور نفیسہ نے خود ان کا خیال رکھا، اکلوتا بیٹا منصور بھی جہلم سے چھٹی لے کر اسلام آباد آ گیا تھا، لیکن جہاں منصور کو ایک ہفتے بعد دوبارہ ڈیوٹی جوائن کرنا پڑی وہیں آمنہ اور نفیسہ کو بھی گھر بار کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنے اپنے گھر رخصت ہونا پڑا لیکن جانتی تھیں کہ اماں کو اتنے بڑے منصور ولا میں محض ملازمہ اور ڈرائیور فرید کے حوالے کر کے چلے جانا وہ بھی ان حالات میں، اب قطعاً مناسب نہیں تھا، اماں

کی طرح نہیں ہوئیں کہ وہ ان دونوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کے ہاں آ ٹھہریں لیکن خدیجہ حباب کے لئے اپنے گھر اپنی جگہ کو چھوڑ کر جانا ہارٹ اٹیک سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا، تبھی آمنہ نے اورنا کو اور نفیسہ نے فریال کو ان کی دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا، وہ دونوں بی ایس سی کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھیں، تبھی دونوں ایک ساتھ نانی کے ہاں رہ جائیں تو بھی تین تین دن دور کی بارہ باں دکھ جاتیں، یوں بھی منصور ولا ان کے لئے ایک گھر کم اور ڈریم لینڈ زیادہ تھا، جہاں آ کر وہ اور نانو امی کے ساتھ وقت گزارنا بچپن سے گھٹی میں پڑا ہوا تھا، اورنا کو نانو امی کے ہارٹ اٹیک پر شدید ذہنی دھچکا لگا تھا، اس نے بچپن سے نانو امی کو سارے کام خود کرتے دیکھا تھا، نواسے نواسیوں کی آمد پر ان کے لئے کھانے پکانا، ساتھ مل کر لڈو کیرم کھیلنا، منصور کی شادی کے پلان ترتیب دینا تحمل والی دلہن کی تلاش، بھی کچھ جوشیلے جذبے سے ڈسکس کرنا، نانو امی کے یوں بستر پر آ پڑنے کا منظر اورنا کے لئے خاصا جاں گسل تھا، نانی کی بیٹی تو خدمت کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ وہ جلد از جلد پہلے جیسی ایکٹیو اور صحت مند دکھائی دیں اور یہ انہی دو کی خدمتوں کا صلہ تھا کہ خدیجہ بیگم اب خود کو پہلے سے کافی بہتر محسوس کرتی تھیں۔

سبتین علی کی منصور ولا آمد کا سبب بھی کچھ ان کی طبیعت ہی بنی تھی، سبتین علی، منصور کے جگری دوست عمیر کا چھوٹا بھائی تھا، وہ اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا، اسے ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹس منیجر کی جاب ملی تھی، کمپنی کی طرف سے رہائش کا بندوبست بھی تھا لیکن منصور اور عمیر دونوں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اسلام آباد رہنے کے لئے جا ہی رہا ہے تو بہتر ہے کہ منصور ولا میں قیام کرے تاکہ گھر میں مرد کی عدم موجودگی کا خلا پُر ہو سکے۔

منصور خود ریٹائرڈ آفیسر تھا، دو سال پہلے اس کی ٹرانسفر جہلم ہوئی تو عمیر کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، وہ دونوں کالج کے دوست تھے اور دونوں کے برسوں پرانے گھریلو تعلقات تھے، اورنا عمیر سے تو خوب واقف تھی کیونکہ نانو امی کے گھر بے شمار مرتبہ اس سے مل چکی تھی بلکہ منصور ماموں کے دوست کی حیثیت سے اسے بھی عمیر ماموں کا درجہ دے دیا تھا، لیکن سبتین علی یہاں سب کے لئے ایک نیا چہرا تھا سوائے خدیجہ حباب کے کیونکہ وہ منصور کے ساتھ جہلم آتی جاتی رہتی تھیں۔

اورنا کو زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ ان کی خدمتوں میں ایسی کیا کمی رہ گئی تھی جو منصور ماموں نے سبتین صاحب کی خدمات کا تو کر کے بھی منصور ولا میں بھیج دیا، فریال سے اس کا فسی غدائی دیکھ کر وہ مزید چڑ جاتی کہ بھلا کیا ضرورت ہے ایک اجنبی کو سر چڑھانے کی۔

"سبتین بھائی یہ...... سبتین بھائی وہ......

ہونہہ۔" وہ منہ ہی منہ میں تلملائی اب جبکہ آپ یہاں مکین رہتی تاکہ زیادہ سامنا ہو اور نہ بات چیت کرنا پڑے، سبتین سب دیکھ سمجھ رہا تھا لیکن سمجھ کر بھی اسے اپنی شرارتی مسکراہٹ دبانا پڑ جاتی کیونکہ محترمہ کو اس کی مسکراہٹ سے اللہ واسطے کا بیر تھا، اب سادہ بات کر اورنا کا مسلسل گریز سبتین کو اس پتھر کے صنم کے مزید قریب لا رہا تھا، وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خود کو کوستا۔

"سبتین علی! اس دل کی دشواریاں اچھے اچھوں کو خون رلا دیتی ہیں اور وہ، پھول جسے محبت کہتے ہیں اس تک پہنچنے کا راستہ خار زار ہے کہ تو دامن میں صرف بھید باقی رہ جاتے ہیں۔"

پھر یہ بات بھی کون مانے گا کہ پہلی نظر کی محبت کو محض فلمی اور افسانوی سمجھنے والے کا خود پہلی نظر میں ایسا حال ہو جائے گا۔"

خدیجہ آنٹی نے جب برتھ ڈے پارٹی میں اسے اپنی نواسی اربا جو تب تک یمین کے لیے ایک ان دیکھی شخصیت تھی کو ڈھونڈنے بھیجا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پچھواڑے کا موڑ مڑتے ہی زندگی بھی ایک نیا موڑ کاٹنے والی ہے، سڑک کنارے دواؤں کے تھیلے کو مضبوطی سے تھامے سرخ سوٹ میں بھیگی اور گھبرائی سی لڑکی پر جب گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹ پڑی تو یمین کا دل یکبارگی دھڑکا اور ایک خواہش جو شدت سے مچل کر باہر آئی وہ یہی تھی کہ کچھ دیر وہ یونہی اسے بیٹھا دیکھتا رہے جس نے تیز روشنی پڑنے پر بے ساختہ آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن برتھ ڈے پارٹی میں چونکہ یہ خواہش بڑی حماقت تھی سو وہ نیچے اتر آیا اور دشمن جاں سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کیا۔

☆☆☆

"بیزی تو نہیں ہو؟" سریلی کھنکدار آواز ہاتھ میں ابھری تو ایک بڑی دل آویز مسکراہٹ سعد کے لبوں کو چھو گئی۔

"برائے آپ نہیں ہوں بزی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کھلی فائلیں بند کر دیں۔

"لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے، کہو تو آ جاؤں؟" وہ شوخی سے ہنسی۔

"تو ڈنر کی کشش کافی کم ہو جائے گی، ہینڈل کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔" سعد نے فوراً اس کا خیال رد کیا۔

"خیریت؟ کوئی ٹیم وغیرہ وزٹ پر آئی ہے کیا۔" رمشہ کو یاد آیا چند ہفتے پہلے اچانک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے چند لوگ میڈیسن وغیرہ کی چیکنگ کے لیے آ گئے تھے تب بھی وہ دونوں لنچ کے لیے نکلنے والے تھے۔

"اونہیں، ان کو ہینڈل کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں، ایزی گو کر سعد اللہ ایسے معاملات میں یکسر صاف رہتا ہے۔" اپنی تعریف کا موقع اس نے ضائع نہیں جانے دیا۔

"دیٹ لو.... دین پرابلم کیا ہے؟"

"یار وہ میرے نانا جی نے کچھ دیر پہلے فون کیا وہ مجھ سے ملنے ہاسپٹل آ رہے ہیں۔"

"یہاں؟" رمشہ حیران ہوئی، پروگرام بگڑتا دیکھ کر موڈ بھی آف ہو گیا۔

"نہیں تمہیں بتایا تھا ناں، کچھ دن پہلے ہم نے پہلی مرتبہ ان لاز کے ہاں جانا تھا لیکن بارش کی وجہ سے پروگرام کینسل ہو گیا تھا، شاید دوبارہ اپوائنٹ کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"واہ بڑے کیئرنگ ہیں۔" رمشہ نے رشک سے بھنویں اچکائیں۔

"اپوائنٹ تو فون پر بھی کیا جا سکتا تھا، ان فیکٹ انہیں ڈائریکٹ انکل آنٹی سے کہنا چاہیے لیکن لگتا ہے معاملہ تمہیں خصوصی اہمیت دینے کا ہے۔"

"ہوں کافی اسمارٹ ہو۔" سعد نے مسکرا کر ایزی چیئر سے پشت لگائی۔

"ہاں بھئی امیر سسر جس بھتیجے کو کہاں ادھر دل کے لیے چھوڑتا ہے وہ بھی اکلوتا لیکن ڈیئر تم کیوں اتنے ایکسائٹڈ ہو، وہ ملنے کیا آ رہے ہیں، تم تو سارے کام دھندے چھوڑ کر بیٹھ گئے۔" وہ قدرے خفا سی ہو گئی۔

"ضروری ہے مائی سویٹ فرینڈ، بہت ضروری۔" سعد کی آنکھوں کی چمک کچھ اچانک ہی بڑھ گئی۔

"کیا ضروری ہے۔" رمشہ کا لہجہ بدلا۔

"کیا اچھا بنتا؟" اس نے قدرے جتاتے کے لہجے میں کہا تو سعد مبہم انداز میں مسکرایا۔

"یہی سمجھو۔"

"اور ہمارا لنچ؟"

"لنچ کو ڈنر میں تبدیل کر لیتے ہیں، تمہاری آج نائٹ نہیں ہے ناں تو آٹھ بجے اٹھتے ہیں یہاں سے نکلیں گے، ڈنر کے بعد تمہیں گھر بھی ڈراپ کر دوں گا، اگری؟"

"آف کورس، اگریڈ۔" وہ خوشی سے چہکی تو سعد نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

"نانو امی نے ناشتہ کر لیا؟" کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ ادھر چلی آئی۔

"نہیں بیٹا، میں نے کمرے میں جھانکا تو سو رہی تھیں، میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ابھی تک سو رہی ہیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور قدرے پریشان سی ان کے کمرے میں آئی، ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو لگے کو ان کی آنکھیں سسکیا گئیں۔

"اربا۔" انتہائی کم آواز میں شدید نقاہت زدہ لہجے میں فقط اتنا کہا اور ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن اٹھا نہیں پائیں، ان کا آدھا اوپر اٹھا ہاتھ لڑکھڑا کر دوبارہ گرا تو اربا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، وہ ٹھیک نہیں تھیں، اربا بھاگ کر کچن میں آئی، بوا کو ان کی طبیعت کا بتا کر اندر بھیجا اور خود فرید کو بلانے باہر دوڑ گئی، وہ سامنے گیٹ پر ہی کھڑا تھا، ہاتھ ہلا کر اسے اندر بلایا اور واپس نانو کی طرف آ گئی، بوا کی مدد سے انہیں اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا تبھی فرید کے ساتھ یمین بھی اندر داخل ہوا، شاید اسے فرید نے بتایا تھا۔

"تم لوگ نانی کو گاڑی میں بٹھاؤ میں اوپر سے کچھ ضروری چیزیں لے لوں پھر خود ہی انہیں ہاسپٹل لے جاؤں گا۔" وہ فرید کو ہدایات دیتا واپس اوپر چلا گیا، اربا نے قدرے سکون محسوس کیا وہ بھی یہی چاہ رہی تھی کہ یمین ساتھ جائے، فرید اور بوا نانو امی کو گاڑی کی طرف لے گئے اور وہ فون کی طرف بڑھی تاکہ امی کو ان کی طبیعت کے بارے میں بتا سکے لیکن اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتی کسی نے ریسیور پہ ہاتھ رکھا، اربا نے چونک کر سر اٹھایا تو یمین نے نفی میں سر ہلا کر اسے منع کیا۔

"ابھی کسی کو پریشان نہ کریں، ہم سنبھال لیں گے، ان شاء اللہ۔" نرمی سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

خدیجہ حیات کو دل کے عارضے کے علاوہ شوگر کا بھی مسئلہ تھا، اس روز بھی شوگر لیول انتہائی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ نڈھال ہو گئی تھیں، ہسپتال میں یہاں سے وہاں اربا نے جانے کتنے چکر کاٹ ڈالے تھے، یمین نے آ کر رپورٹس کے متعلق بتایا تو وہ حیرت اور خوشی سے بلاوجہ اسے دیکھے گئی۔

"کیا ہوا؟" یمین کو سمجھ نہیں آئی کہ اربا خوش ہے یا پریشان۔

"کچھ نہیں۔" وہ جھینپ کر قریبی بینچ پر بیٹھ گئی۔

"میں سمجھی شاید پھر سے خدانخواستہ دل میں تکلیف اٹھی ہے۔"

"ہاں ڈر تو میں بھی گیا تھا لیکن شکر ہے مسئلہ صرف لو بلڈ پہ شوگر کا تھا۔" وہ رومال سے پیشانی صاف کرتا ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔

"نانی کب تک یہاں رہیں گی؟"

"انہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے اندازاً دس پندرہ منٹ اور ہیں، پھر سب ساتھ ہی نکلتے ہیں۔" یمین نے جواب دیتے ہوئے موبائل جیب سے نکالا۔

"چاہیں تو اب گھر والوں کو بتا دیں۔"

"جی امی کو بتا دیتی ہوں۔" ارما نے نمبر ملا کر امی سے بات کی اور انہیں بجائے ہسپتال آنے کے نانی کے گھر پہنچنے کا کہا، موبائل فون سیکن کی طرف بڑھاتے ہوئے ارما نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"شکریہ آپ نے آج ہیلپ کی، اتنا تعاون کیا اور......"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں، اگر میں اتنا بھی نہیں کر سکتا تو میرے یہاں رہنے کا فائدہ نہیں ہے اور شکریہ ادا کر کے مجھے یہ ثابت مت کریں کہ وہ آپ کی زیادہ لگتی ہیں۔" آخری جملہ سیکن نے مسکرا کر کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی، سیکن اٹھ کر دور چلا گیا وہ بے دھیانی میں اسے دیکھتی رہی، ناگواری کا ایک تاثر جو بلاوجہ ہی سیکن کے لئے پیدا ہو گیا تھا یک لخت اس میں کمی کا احساس ہوا، رزے کا خود ساختہ خول بھی کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوا، شاید نانی کے حوالے اس کا فکر مندانہ رویہ دیکھ کر۔

☆☆☆

"جلدی کرو بھئی، دو مرتبہ بلاوا آ چکا ہے، ابھی نانو خود آ گئیں ناں، بہت مزا آئے گا تم سب کو۔" ارما نے جھٹ پٹ جیولری پہن کر بالوں میں برش پھیرا اور ان تینوں کو متنبہ کرتی باہر نکل آئی، ان دونوں کی مشترکہ دوست مصباح کی شادی تھی، پچھلی شام سے ہی وہ نانی کے ہاں تھیں، نارا اور صبا کچھ دیر پہلے پہنچی تھیں، ان سب کی تیاری تو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی اور ارما اسی خیال سے نانو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ پوچھے انہوں نے کب اور کس کے ساتھ نکلنا ہے۔ باہر نکلی تو خزاں کی خنک ہواؤں نے بال بکھیر کر اس کا استقبال کیا، وہ چہرے پر آئی لٹوں کو ہٹاتی

چند قدم آگے آئی تو نظر سیکن پر پڑی جو برآمدے کے کونے پر لان کی طرف منہ کیے کھڑا تھا، آہٹ پر گردن موڑی تو ارما سے آنکھیں چار ہو گئیں، جانے کیا تھا اس کی سوئی سوئی نگاہوں میں، وہ جھجک کر آگے بڑھ گئی۔

سیکن نے ایک گہرا سانس لیا اور وہ اسٹیپ پھلانگ کر قدم لان میں رکھے، آج جانے کیوں طبیعت بہت بھاری سی ہو رہی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ ایسا صبح سے نہیں تھا بلکہ پانچ بجے جب وہ آفس سے لوٹا تو خدیجہ آنٹی نے کہا کہ ارما اور فریال وغیرہ کی دوست کی شادی ہے اور اسے انہیں ڈراپ کرنا ہو گا، پھر کمرے تک جاتے جاتے اس کی کیفیت عجیب ہونا شروع ہو گئی تھی، سیکن نے بہت سوچا کہ شاید آفس کے کسی معاملے کی وجہ سے اس کی طبیعت بوجھل ہے، لیکن اب تو یقین ہو گیا کہ ایسا کچھ نہیں تھا، چند لمحے پہلے ارما سے نظریں کیا چار ہوئیں سیکن کے بھاری اعصاب پر گویا کسی نے دو چار مزید پتھر رکھ دیئے تھے، گہرے مونگیا سوٹ کے ساتھ کرسٹل وائٹ جیولری پہنے وہ بلاشبہ بہت حسین لگ رہی تھی، پر جانے کیوں اچانک ہی ایک بے کار سی سوچ نے سیکن کے وجود کا احاطہ کیا اور اس کا دل چاہا ابھی ارما کو روک کر کہہ دے کہ ہو سکے تو وہ شادی میں نہ جائے لیکن سوچنے اور کہنے میں بہت فرق ہوتا ہے، نہ ہی اسے یہ حق حاصل تھا اور نہ ہی روکنے کا کوئی جواز، آج وہ رہ رہ کر اسے امی کی یاد آ رہی تھی، وہ کہا کرتیں سیکن مجھے تمہاری چھٹی حس سے بڑا ڈر لگتا ہے، کسی وہم یا خیال کا تمہارے دل میں جگہ پالینا مجھے بہت اپ سیٹ کر دیتا ہے، سیکن کے دھیان کی تیزی انہوں نے اس کے بچپن میں ہی محسوس کر لی تھی، جبکہ آنے والے کسی برے یا منفی عمل سے پہلے وہ ایکدم

نہایت خاموش، سست اور ڈھیلا سا ہو جاتا، جاننے کے باوجود وہ اپنی کیفیت میں تبدیلی پیدا نہ کر سکتا اور کبھی بلاوجہ بہت ایکٹیو، پرجوش اور شوخ نظر آتا اور اس کی یہ خوشی جلد ہی ماحول میں کسی خوش آئند خبر کی صورت میں ظاہر ہو جاتی۔

وہ تھکا سا برآمدے اور لان کی درمیانی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا، تبھی ارما لاؤنج سے نکل کر واپس برآمدے میں آئی، سیکن کو یوں بیٹھا دیکھ کر وہ رکی، اس کی حیثیت یہاں گھر کے فرد جیسی تھی، ایسے ڈرائیوروں کی طرح اس کا انتظار میں بیٹھنا نہ تو اچھا لگ رہا تھا نہ ہی کوئی مناسب رویہ تھا، فریال اور نارا وغیرہ پر بھی سخت غصہ آیا جنہیں ذرا کسی بات کا احساس نہیں تھا، کچھ سوچ کر چند قدم آگے آئی۔

"سوری آپ کو زحمت ہو رہی ہے، میں سب کو بلا لاتی ہوں۔"

"بات سنیں۔" عجلت میں اندر جاتی ارما کو خاصی غائب دماغی سے وہ پکار بیٹھا تھا۔

"جی......؟" وہ رکی لیکن چند لمحے انتظار کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا اور پھر اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ نہیں، آپ پلیز سب کو بلا لیں میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔" بنا اس کی طرف دیکھے وہ جلدی سے کہتا آگے بڑھ گیا اور وہ حیرت سے اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔

"جانے کیا کہنا چاہ رہا تھا، عجیب ہے یہ بھی۔" وہ آہستہ روی سے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شادی والے گھر کے آگے گاڑی رکی تو فریال نے اسے دو گھنٹے بعد واپس آنے کا کہا، اندر داخل ہونے سے پہلے ارما نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا، جانے کیوں وہ اسے کافی پریشان اور الجھا الجھا سا لگا تھا۔

"ارے سنو ارما، یہاں تو سعد بھائی بھی ہیں۔" وہ چند پرانی کلاس فیلوز سے مل رہی تھی جب صبا اس کے کان میں گھسی۔

"اچھا...... کہاں ہے؟" وہ اشتیاق سے مڑی، صبا نے دائیں جانب اشارہ کیا تو ذرا فاصلے پر وہ دکھائی دے گیا، پچھلے دنوں بھابھی کے گھر تصویروں میں اسے دیکھا تھا، لائٹ گرے کلر سوٹ میں بلاشبہ وہ کافی جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا، کسی سے بات کرتے اچانک اس کی نظر صبا پر پڑی تو فوراً پہچان گیا کیونکہ صبا سے اس کی دو مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی، اس نے ہاتھ ہلایا تو وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔

"کیسی ہو صبا؟"

"بالکل ٹھیک، سعد بھائی، آپ یہاں کیسے؟" وہ خاصی پرجوش لگ رہی تھی۔

"دولہا صاحب کے بیسٹ فرینڈ ہونے کا شرف حاصل ہے۔" بات کے دوران ہی اس نے باری باری ان تینوں کو دیکھا جو مکمل اسی کی طرف متوجہ تھیں، صبا کو فوراً تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"ان سے ملیں سعد بھائی، یہ ارما ہیں۔"

"او...... تو یہ ہیں ڈینجر کزن جو ہم سے اتنی دور دور رہتی ہیں۔" وہ اسے گہری نگاہ کے حصار میں لے کر خوشدلی سے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ ایکدم شرمندہ ہو گئی۔

"دونوں مرتبہ اتفاق ہی ایسا ہوا کہ آپ لوگ آئے لیکن میں اپنی امی کے ہاں تھی، دراصل وہ بیمار ہیں تو اس لئے میں اور فریال آج کل وہاں ہوتی ہیں۔" ارما کے اشارہ کرنے پر سعد نے فریال کی طرف دیکھا۔

"سوری۔" اس کی حیرت دیکھ کر ہیمن نے لہجے کی بے تکلفی پر قابو پایا۔

"تمہیں بتا وجہ پہ شک ہو گیا۔" حیرت انگیز طور پر دونوں ہی ابھی تک برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہیمن نے اندر کی طرف پیش قدمی کی تھی اور نہ ہی ارما آگے بڑھی تھی۔

"پریشان تو آپ بھی تھے جانے سے پہلے اور کچھ کہنا بھی چاہ رہے تھے۔" ارما کو یاد آیا۔

"ہاں مگر۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"ایک الجھن ہے جو سلجھ نہیں رہی آپ اپنی پریشانی کی وجہ بتا دیں تو شاید سلجھ بھی جائے۔"

"جی؟" کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی، اب اس کی پریشانی نے ہیمن کا ذہن کچھ لپیٹ دیا تھا۔

"میرا خیال ہے اندر چلتے ہیں۔" ہلکا سا مسکرا کر اس نے اندر کی جانب اشارہ کیا۔ اچانک ہی دماغ کی تنبیہ نے بھٹکتے دل کو مٹھی میں لیا تھا، یہاں تو خود کو سنبھالنا ایک امتحان ہو گیا تھا، کیسے ایک سادہ دل معصوم سی لڑکی کو سمندروں سے گہرے جذبوں کی کھوج پر لگا دیتا، وہ...... جو اس کی آنکھوں کی گہرائی سے بھی خائف رہتی تھی، ذرا کی ذرا نظر کیا اٹھا دیتا، گڑبڑا کر دائیں بائیں ہونے لگتی تھی، اس وقت بھی حیرت آنکھوں میں سموئے اس کے لفظوں پر غور کر رہی تھی جب اچانک نارا دروازے میں آئی۔

"انگوٹھی تمہیں مل گیا؟" وہ دور سے چلائی۔

"ہاں مل گئی۔" وہ تیزی سے اندر روانہ ہوئی۔

"کافی مشکل سے ملی ہے۔" دیر ہو جانے کا سیدھا سا جواز بنا کسی کے ماتھے فراہم کرتی نکلے بھر کو ہیمن کے ہونٹوں پر ہنسی چھوڑ گئی، وہ پیچھے ہاتھ باندھے لبوں کی ہنسی فوراً معدوم ہوئی اور دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اٹھا، جو وہ جیسی چاہ رہا تھا اگر ویسے ہونے جا رہا تھا اور سراسر قصور وار بھی وہ خود تھا، تنگشن سے واپسی پر نادانستگی میں وہ دو یا تین مرتبہ اسے بہکے دیکھ کر مسکرا دینے کی غلطی کر بیٹھا تھا جسے ارما نے فوری طور پر محسوس کیا تھا بھی تو جو بھی اس کی نظر مڑ کر جانب اٹھتی تھی اسی لمحے ارما بھی بے ساختہ اسے دیکھتی، شاید اس شدت، اس تپش کی وجہ سے جو ہیمن کی آنکھوں سے سیدھی ارما کے دل تک پہنچی تھی۔

☆☆☆

"صبح محسن بھائی کا فون آیا تھا، عمو نے آج انہیں ڈنر پہ انوائیٹ کیا ہے۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اعظم نے آمنہ کو دیکھا۔

"جی اچھا میں انتظام کر لوں گی۔" وہ بیڈ پہ بکھری نائٹیں سمیٹنے لگیں۔

"ارما ہے گھر پہ؟" دروازے کا ہینڈل دباتے اچانک انہیں خیال آیا۔

"جی وہ تو اماں کے گھر گئی تھی ناں آج صبح ہی۔"

"تیسری مرتبہ وہ لوگ آ رہے ہیں اور ارما گھر پہ نہیں ہوتی کیا سوچیں گے۔"

"میں نے محسن بھائی اور رابعہ کو اماں جی کی طبیعت کے بارے میں بتایا تھا پچھلی مرتبہ" "انہیں پتہ ہے کہ ارما نانی کا خیال رکھتی ہے۔" آمنہ نے صفائی دینے کی کوشش کی، جانے کیوں اعظم کی تیوری کا ایک بھی بل اسے اندر تک سہما دیتا تھا۔

"آج سعد اللہ بھی آ رہا ہے، بہتر ہوگا کہ تم ارما کو بلوا لو۔" آرڈر کے انداز میں کہتے وہ واش روم چلے گئے، وہ ڈوک رویہ ان کی فطرت کا حصہ تھا۔

تفصیلات بتانے کی نہ انہیں عادت تھی نہ ضرورت، آدھی سے زیادہ باتوں کے مطلب آمنہ خود ہی سمجھ جایا کرتی تھی، یہ بھی بائیس سالہ رفاقت کا کمال تھا کہ اب ہر بات کا مطلب پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، باہر آ کر اس نے جلدی سے اماں کا نمبر ملایا، فون اتفاق سے ارما نے ہی اٹینڈ کیا۔

"ہو سکے تو ابھی چلی آؤ ارما، تمہارے چچا وغیرہ آج آ رہے ہیں، سعد بھی ہوگا، تمہارے ابو چاہتے ہیں آج تم انہیں گھر پہ ملو۔"

"پلیز امی، کل ہی تو آئی ہوں اور میرا بالکل موڈ نہیں واپس آنے کا۔" اس نے منہ بسورا۔

"ضد مت کرو ارما، تمہارے ابو ناراض ہو جائیں گے، میں نفیسہ آپا سے کہتی ہوں کہ نانا یا نریال کو اماں کے پاس بھیج دیں۔" آمنہ نے اسے مزید بحث کا موقع نہیں دیا۔

"اور ہاں تم فرید کے ساتھ آ جاؤ، تمہارے ابو تو ابھی آفس سے آئے ہیں کھانا کھا کر ریسٹ کریں گے اور فہد آج یونیورسٹی ٹرپ پہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے شاید شام تک واپسی ہو۔"

"جی اچھا۔" ماں کے قطعی انداز پہ وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی، لیکن جب نانو سے پتا چلا کہ فرید آج چھٹی پہ ہے تو خوشی سے اچھل پڑی۔

"چلو شکر ہے، اب مجھے نہیں جانا پڑے گا۔"

"صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو، ہوں ماں کے بارے میں کون سوچے گا؟" خدیجہ بیگم نے مسکرا کر اس کی ٹھوڑی اونچی کی اور...... اور سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں تو ارما جھینپ گئی۔

"ہائے امی اتنا ڈرتی کیوں ہیں ابو سے، آپ بھی نانا سے اتنا ڈرتی تھیں۔"

"تمہارے نانا تو نہایت حلیم اور نیک دل طبیعت کے تھے، ہمیشہ چہرے پہ مسکراہٹ سجی رہتی تھی، بس ہوتا ہے ہر ایک کا اپنا مزاج، تمہارے ابو جانے کن حالات اور کیسے ماحول میں پلے ہوں گے، اپنے غصے پہ شاید ان کا بھی اختیار نہ ہو، بس ہم لوگ سمجھداری کا ثبوت دیا کرو اور تم تو میری سب سے پیاری اور فرمانبردار بچی ہو۔" انہوں نے پیار سے ارما کو اپنے ساتھ لگایا تو اس نے لاڈ سے ان کے کندھے پہ سر ٹکایا۔

"تو پھر نانو میں کیسے جاؤں گی؟"

"ہیمن آفس سے آ چکا ہوگا اسے کہتی ہوں وہ چھوڑ آئے گا۔"

"ہیمن!" دل نجانے کو عجیب دھڑکنوں میں اور بیچ ہوا، اگلے ہی پل اس نے خود کو اس سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت سے نکالا۔

کمرے میں آ کر اس نے اپنا ضروری سامان سمیٹنا شروع کیا، بہت اداسی سی سنجیدگی اور منتشر سی تھیں، گھر میں مختلف نوعیت کی دعوتیں، پارٹیز آئے دن ہوا ہی کرتی تھیں لیکن ابو کی طرف سے ایسا فرمان نامہ پہلے بھی جاری نہیں ہوا تھا اور سعد کی آمد پر بطور خاص اس کی موجودگی پہ زور دینا، اوپر سے سعد کی نظر التفات و عنایت، مطلب تو ایک ہی نکلتا تھا، کوئی ہفتہ بھر پہلے وہ سب بھی محسن چچا کے گھر گئے تھے، عصمہ کی شادی کے بعد یہ اس کی سعد سے دوسری ملاقات تھی، اس کے بے باک انداز اور مہربان رویے میں ارما نے مزید اضافہ محسوس کیا تھا، گھر دکھانے کے بہانے وہ اسے اکیلے ہی اپنے ساتھ لے گیا تھا، وہ تو پہلے ہی اس کی چبھتی نگاہوں سے گھبرائی سی رہتی تھی اب تو معنی خیز جملے بازی بھی شروع ہو گئی تھی، حالانکہ دل ہی دل میں اکثر اسے یہ سوچ کر ہنسی آتا تھا کہ بڑوں کی لڑائی کی وجہ سے بلاوجہ

اس بے چارے کو دشمنوں کی محرومی سمجھا بیٹھی تھی، لیکن اب جس زاویے پر سعد سوچنے لگا تھا اس سے ادما کو کوفت محسوس ہوئی، دراصل محسن رضا نے اپنے والد ضمیر الحسن کی مرضی کے خلاف رابعہ سے محبت کی شادی کی تھی، وہ خود ایک ڈاکٹر تھے اور رابعہ ان کے ہاسپٹل میں نرس تھی، حالانکہ اعظم اور محسن کا رشتہ والد کی پسند سے طے ہو چکا تھا اور دونوں کی شادی ایک ساتھ ہونا قرار پائی تھی لیکن عین شادی سے ہفتہ پہلے محسن نے والد کی پسند کو ٹھکرا کر رابعہ سے بیاہ رچا لیا، ضمیر الحسن کی عزت پر ایسا بھرپور تازیانہ پڑا کہ انہوں نے علی الاعلان محسن کو عاق کر دیا اور زندگی بھر کوئی تعلق نہ رکھنے کا عہد بھی، رابعہ کی محبت کے نشے میں چور محسن نے ہمیشہ کے لئے باپ کا گھر چھوڑ دیا اور اپنی ایک الگ آزاد دنیا بسا لی، وہ ایک کامیاب ڈاکٹر تھے دولت کی کوئی کمی نہ تھی، ایک خوشحال کامیاب زندگی کا آغاز ہو گیا اللہ نے اولاد بھی عطا کر دی، پہلی مرتبہ وہ ننھے منے سعد اللہ کو ہاتھوں پر لئے باپ سے معافی مانگنے اور انہیں ان کا پوتا دکھانے لے آئے، لیکن ضمیر صاحب نے اپنا عہد نہ توڑا اور محسن مایوس لوٹ گیا، لیکن اس کے بعد وہ تواتر سے عید بقر عید وغیرہ پر باپ کو منانے کے لئے آنے لگا لیکن نہ تو انہوں نے اپنی ضد چھوڑی اور نہ ہی محسن نے اپنا وطیرہ ترک کیا، البتہ سعد صرف بچپن میں ہی اپنے باپ کے ساتھ آتا رہا، گزرے دس بارہ سالوں میں وہ پھر کبھی باپ کے ساتھ نہیں آیا۔

دو سال بھر پہلے جب ضمیر الحسن صاحب کا انتقال ہوا تو اس کے چند ماہ بعد اعظم خود بھائی کے پاس گیا اور اسے اپنی طرف سے تعلقات کی بحالی کی نوید سنائی، یوں قریب دو ماہ سے دونوں گھرانوں کا آپس میں باقاعدہ میل جول شروع ہو چکا تھا، خود تعلقات بھی بہت جلدی قائم ہونے کے بعد لیکن سعد کی سوچ نے اسے ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی، کیونکہ ابھی تو ٹھیک سے ایک دوسرے کو دیکھا سمجھا بھی نہیں تھا، بلکہ جتنا دیکھ اور سمجھ لیا تھا وہ تو سراسر غیر تسلی بخش تھا، سعد کی بے تکلفی بے تابی اسے بہت مصنوعی اور اظہار نہایت بناوٹی لگتا، وہ بظاہر بے حد مضبوط لیکن انداز بہت کھوکھلے سے تھے۔

تعلقات کی بحالی بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی تھی فی الحال کچھ عرصہ اسی خوشی کو انجوائے کرنا ہی بہت کافی تھا، لیکن چچا کی فیملی کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی اور بس اسی بات سے ادما کو سخت گلہ تھا، لیکن کہتی کس سے، جب اپنے ابو ہی سب سے زیادہ پر جوش نظر آ رہے تھے۔

"آ جاؤ بیٹا، بی بی بلا رہی ہیں، مبین نے کھانا کھا لیا ہے وہ تمہیں لے جانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔"

"جی بوا، ابھی آئی۔" اس نے جلدی سے چیزیں سمیٹ کر رکھ دیں اور خود کو آئینے میں دیکھا، بیک کومبنگ کچھ ٹھیک نہیں رہی تھی اس نے کیچر سے بال آزاد کر کے الٹی مانگ نکالی، کچھ چھوٹی لٹیں چھوڑ کر باقی کے بال کان کے پیچھے اڑس لئے آنکھوں کے نیچے پھیلے کاجل کو ٹشو پیپر سے صاف کیا اور آئی برو انگلیوں سے درست کیا، آئینے میں خود سے آنکھیں چار ہوئیں تو شرمندگی محسوس ہوئی۔

"حد ہوتی ہے خوش گمانی، خود فریبی کی بھی، یا شاید نہیں ہوتی۔" اپنی ہی سوچ پر ندامت محسوس کرتی وہ باہر آ گئی۔ نانو اسی لاؤنج میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"میں کل ہی واپس آ جاؤں گی نانو، فہد صبح

پھر دوبارہ آنے کا تو اسی کے ساتھ آ جاؤں گی، ہم واپسی ایک ساتھ ہی کریں گے ان شاء اللہ، پھر مل کر لان میں نئے پودے لگائیں گے، صبح کا اخبار بھی میں ہی آپ کو پڑھ کر سناؤں گی۔"

اچانک آ پڑنے والے جدائی کے وقفے نے اسے اچھا خاصا افسردہ کیا تھا، وہ کچھ یوں خدا حافظ کہہ رہی تھی جیسے پردیس جانے والے ایئر پورٹ پر اپنے پیاروں سے ملتے ہیں، خدیجہ بیگم نے خوب انجوائے کیا۔

"اچھا اب جاؤ، آمنہ انتظار کر رہی ہوگی۔"

"دیکھنا نانو، ان چچا چچی کو ایسی جلی روٹیاں کھلاؤں گی کہ آئندہ کبھی دعوت کا نام نہیں لیں گے۔" اس نے دانت کچکچا کر غصہ نکالا تو عظمت بوا نے ہاتھ منہ پر رکھ کر قہقہہ لگایا۔

"جاؤ بھاگو اب۔" خدیجہ بیگم نے ہنستے ہوئے اسے زبردستی دھکیلا، مبین نے گاڑی اسٹارٹ کی تو ساتھ ہی پلیئر بھی آن ہو گیا۔

میں تو تم سنگ نین ملا کے
ہار گئی سجناں ہار گئی سجناں

لتا کی مدھر آواز میں شاید پچاس کی دہائی کا گانا بجا تھا، ادما کو کافی سناسا لگا، بول ہی عجب سانسوں طاری کر رہے تھے، اس نے بے ساختہ مبین کو دیکھا جس کی مکمل توجہ جیسے گیٹ کی طرف تھی، وہ بیک ویو مرر سے گیٹ کی طرف ریورس میں گاڑی چلا رہا تھا، اس لئے سارا دھیان اسی جانب تھا جبکہ ادما کا گانے کی طرف، جس کے بول اور دھن بری طرح حواسوں پر چھا رہی تھی۔

نہ جتنیں بن ہے الجھاں
جگنا نہ جاتا دل بھی نہ رہتا
کاش کسی سے پیار نہ ہوتا
میں تو تم ....

کٹ کی آواز آئی اور گانا بند، ادما نے چونک کر دیکھا، گاڑی گیٹ سے نکال کر سڑک پر لاتے ہی مبین نے پلیئر آف کر دیا تھا، وہ باہر دیکھنے لگی۔

"اتنا اچھا گانا تھا، بدتمیز بدذوق۔"

تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا لیکن وہ خاموشی سے محض گاڑی چلانے میں مصروف تھا، پتہ نہیں کیوں ادما کو اس کی سنجیدگی سے الجھن خاصی بیکی محسوس ہو رہی تھی۔

"اس سے اچھا تھا فریحہ کے ساتھ چلی آتی، لیکن نانو کو بھی سوائے اس کے کسی پر بھروسا نہیں ہوتا اور یہ...... کبھی تو کتنے دوستانہ طریقے سے بات کرتا ہے اور کبھی ایسا بدتمیز اور بدمزاج، لیکن مجھے کیا، میری بلا سے ساری زندگی بات نہ کرے۔" وہ پوری طرح کھڑکی کے پار متوجہ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

"لیکن یہ ایسا کیوں فیل کر رہا ہے، آنکھوں پر کالا چشمہ لگا کر اور بھی اجنبی لگ رہا ہے، جب چہرے کی آنکھیں نظر نہیں آتیں، کیسی بے گانگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں تو اف، کتنا بولتی ہیں، کیوں ایسے دیکھتا ہے جیسے برسوں سے آشنا ہو، کوئی پرانا ہمدم اور دوست، دل کے ہر تار سے آگاہ وہ سب کچھ معلوم ہونے کا دعویٰ کرتی مبہم مسکراہٹ اور بھرپور اپنائیت کا اظہار کرتیں گہری بادامی آنکھیں۔" وہ ایک بے نام خلش مسلسل اس سے دل ہی دل میں ہمکلام تھی۔

"مجھے آپ کا گھر نہیں معلوم، سوری۔" وہ بالکل ہی اچانک بولا تھا، ادما نے بوکھلا کر سر گھمایا۔

"جی......؟"

"خدیجہ آنٹی نے کہا تھا آپ سیکٹر ایف میں رہتی ہیں جو کہ غالباً شروع ہو چکا ہے۔"

"او اچھا۔" ادما سیدھی ہوئی۔

"فی الحال سامنے ہی جانا ہے، آگے میں بتاتی رہوں گی۔" وہ ڈانٹ ڈپٹ دھارے کو نارمل کرنے میں قدرے کامیاب ہوگئی تھی۔

"گاڑی تو آپ بھی چلا لیتی ہیں ناں؟" پہلا باقاعدہ، اضافی جملہ جو اس پورے سفر میں ہمین کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔ لیکن ارما کو یہ بے عزتی معلوم ہوا، یعنی تو زور کر کہا گیا کہ جب خود ڈرائیو کر سکتی ہو تو مجھے کیوں تکلیف میں ڈالا۔

"گاڑی چلانا تو آتی ہے لیکن ابو اور نانو وغیرہ اکیلے کہیں آنا جانا الاؤ نہیں کرتے، ویسے میں تو فرید بھائی کے ساتھ آنا جا رہی تھی لیکن آج وہ چھٹی پر ہیں۔" لگے ہاتھوں وضاحت بھی کر دی، ہمین مسکراہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہا لیکن شکر ہے وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی، بیشتر وہ اس کے رویے پر ہو بہو خوب خفا تھی، یہ نا معلوم رو کھا پن اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن ہمین مجبور تھا، خود پر عائد کی پابندیاں اتنی سخت نہیں کر لاکھ چاہنے پر بھی وہ اس خوبصورت ارادے سے نہ خود محفوظ ہو سکا اور نہ ارما کی جلتی بجھتی امید کی لو کو بڑھا سکا، بے دردی سے بس بجھ جاتی رہا۔

"کاش آج یہ ناامیدی مکمل مایوسی میں تبدیل ہو جائے اور ارما اس کی طرف کھنچے اپنے دل کو بے اختیار ہونے سے بچا لے۔"

پہلا الیکٹ ٹرن لینے پر جلد ہی اس کا گھر آ گیا، گاڑی سلور گیٹ کے سامنے رکی تو ارما نے ازراہ مروت سے اسے دیکھا۔

"آپ بھی آ جائیے۔"

"جی نہیں شکریہ، گھر جا کر آرام کروں گا۔"

وہ بلاوجہ ہی ذرا سا جھنجھلے لگا۔

"بے وقت زحمت دینے پر معذرت چاہتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے ارما۔ اس اوکے۔"

"ضرورت تو ہے ناں۔" ارما نے گہری سنجیدگی سے کہا تو پہلی مرتبہ ہمین نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

"آپ نانو کے ہاں مہمان ہیں، یہ زحمت سراسر زیادتی ہی تو ہے۔" وہ یہ جواب دے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور ہمین نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی، بلیئر ایک مرتبہ پھر خود بخود آن ہو گیا۔

کیوں	جھوٹے	سے	بہت لگائی
کیوں	جھلے	کو	میت بتایا
کیوں	آندھی	میں	دیپ جلایا
میں تو تم سنگ	نین	ملا کر	ہار گئی سجناں

☆☆☆

"ابو کو اتنا مہربان بھی نہیں ہونا چاہیے، آخر کو دادا ابا ان سے خفا ہو کر دنیا سے گئے ہیں۔" ارما نے پاس بیٹھی صبا سے سرگوشی کی۔

"ہاں لیکن اب تو صلح ہو گئی ہے۔" صبا کو اس کا اعتراض پسند نہیں آیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابو کچھ ایسے شو کر رہے ہیں جیسے ہم صلح کرنے کے لیے مرے جا رہے تھے، بھئی ایک فاصلہ قائم رہنا چاہیے کم از کم شروع شروع میں۔" ارما کی سوئی ابھی بھی ان بے جا نازنخروں پر، ابھی شام کو ہی محسن چچا، رابعہ چچی اور سعد ان کے ہاں آئے تھے، وہ تو اچھا ہوا کہ وہ اسے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لے گیا تھا اور ذرا دیر کو نجات مل گئی تھی ورنہ شوق لگانی گا ہوں ہے، جو سراسر اسے الجھن اور کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔

گھر میں کچھ دنوں سے اس کی اور سعد کی شادی کی باتیں ہونے لگی تھیں، جنہیں سن کر وہ خوب چڑ جاتی تھی، اس رات بھی مہمانوں کے

جانے کے بعد صبا نے باقاعدہ سعد کا نام لے کر اسے چھیڑا تو وہ بری طرح خفا ہو گئی، آمنہ نے دونوں کو بحث کرتے ہوئے تو قریب آ گئیں۔

"اتنا غصہ اچھا نہیں ہے ارما، کیا برائی ہے سعد میں؟"

"امی مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے، نہ ہی میں نے اس انداز میں کبھی سوچا ہے سعد کے بارے میں۔"

"تو اب سوچ لو چندا، تمہارے ابو سعد سے تمہاری شادی کا پکا ارادہ کر چکے ہیں، شاید انہیں تمہارا انکار پسند نہ آئے۔"

"تو کیا وہ میری رائے کو اہمیت نہیں دے گے۔"

"شاید نہیں۔" آمنہ نے دو ٹوک جواب دینا مناسب سمجھا۔

"تمہارے چچا کا بزنس ہم سے کہیں اونچا ہے، پھر سعد کا عہدہ، نام، میں نے دیکھ لیا ہے، تمہارے باپ کو آج کل سوائے سعد کے کچھ بھائی نہیں دے رہا لیکن خیر...... اگر وہ ایسا سوچتا ہے تو تمہارا ہی اس میں بھلا ہے، بچوں کے اچھے مستقبل کی فکر کرنا ہر ماں باپ کا فرض ہے، پھر ایسی بھی کیا برائی ہے سعد میں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں اس پر ہر پہلو واضح کر گئیں۔

"لیکن امی اور، کچھ عجیب سا ہے، کوئی بات ہے جو مجھے کھٹکتی ہے۔" اسے کچھ یاد آنے لگا۔

"بس زیادہ مت سوچو، اللہ پاک اچھا ہی کرے گا انشاء اللہ۔" وہ اسے تسلی دیتی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

"ارے واہ بوا، بڑی خوشبو آ رہی ہے، آج کچھ خاص اہتمام ہے ناشتے میں؟" وہ فریش ہو کر سیدھی کچن میں آ گئی۔

"اٹھ گئیں بیٹا!" بوا نے اپنی پر شفقت مسکراہٹ سے نوازا۔

"منصور آیا ہے ناں اس لیے۔"

"اچھا...... ماموں آئے ہیں۔" وہ چونکی۔

"کس وقت پہنچے، ابھی کہاں ہیں؟"

"رات کافی لیٹ پہنچا تھا، تم شاید سو چکی تھیں، ابھی جاگا ہے تو بی بی نے کہا ناشتہ بنانا شروع کر دوں۔"

"لائیں میں بھی آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔" وہ فوراً آگے بڑھی، بوا اچھے خاصے اہتمام کے موڈ میں تھیں، اکیلے کام نمٹانا بہت مشکل تھا۔

"پھر وہ دن کے لیے آئے ہو، اتنی ساری لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں آمنہ اور نغمہ نے، جانے کب کوئی فائنل ہو گی۔" خدیجہ بیگم نے شکوہ بھری نگاہ منصور پر ڈالی، اور ناشتہ پاس رکھ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

"آپ بھی ناں اماں۔" وہ بری طرح جھینپ گیا۔

"اتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں آپ جسے چاہیں پسند کر لیں، مجھے منظور ہو گا، لیکن پلیز مجھ پر نہ ڈالا کریں۔"

"جس طرح دو ملاؤں میں مرغی حلال نہیں ہوتی، یہی حال تمہاری بہنوں کا ہے، ایک لڑکی آمنہ کو پسند آتی ہے تو نغمہ بیگم منہ بنانے لگتی ہیں اور جو اسے اچھی لگتی ہے اس پر آمنہ کو اعتراض ہوتا ہے، اچھا ہو کہ تم خود کسی کو فائنل کر دو، کم از کم کہیں بات تو طے ہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے نرمی سے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"آج تو آپ کو چیک اپ کے لیے لے جانا ہے ناں، کل دیکھتے ہیں انشاء اللہ۔"

"ہاں بس غور تا لئے رہو اسی طرح۔" وہ خفا خفا سی پلیٹ پر جھک گئی۔

"آپ فکر نہ کریں نانو، اس مرتبہ میں اور فریال بھی میدان میں اتر آئی ہیں، فریال کہتی ہے ہماری ماؤں سے کچھ ہونے والا نہیں، اب ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔"

"ہاں بس تمہاری ہی کمی تھی۔" منصور نے چڑایا تو وہ ہنس پڑی۔

"یمین کہاں ہے اماں، ہمارے ساتھ ناشتے میں شامل ہوتا۔" منصور کو اچانک خیال آیا۔

"ارے بہت لاپرواہ ہے کھانے کے معاملے میں، کچن میں کھڑے کھڑے دو گھونٹ چائے پی کر چل پڑتا ہے، ابھی نیچے آنے والا ہے تم ہی سمجھاؤ ذرا۔" وہ اسے بتانے لگیں اور ارا اپنا کپ لئے وہاں سے اٹھ گئی، جانے کیوں یمین کے نام پر محسوسات بہت عجیب ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

"اف میرے خدا، جانے کیا سوچتی رہتی ہے یہ لڑکی، سر پر دھوپ پڑ رہی ہے لیکن اسے کچھ ہوش ہی نہیں۔" تھوڑی دیر پہلے ہی منصور سے فون پر اس کی بات ہوئی تھی، وہ خدیجہ جان کو لے کر ہاسپٹل گئے ہوئے تھے، یمین کو معلوم تھا کہ گھر پر اس وقت ارا اور بوا اکیلی ہیں، لیکن پہلی حیرت اسے کھلا گیٹ دیکھ کر ہوئی، اس نے گیٹ بند کیا تب بھی ارا کو خبر نہیں ہوئی، یمین نے ہاتھ میں پکڑی فائلز پورچ میں رکھے ہوئے گملے کے کنارے پر ٹکائیں اور لان میں داخل ہو گیا مگر وہ تب بھی بے خبر تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے قدرے جھک کر بات کا آغاز کیا تو ارا حقیقتاً بوکھلا کر اٹھی۔

"جی... جی... السلام علیکم!" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"وعلیکم السلام! منصور بھائی وغیرہ تو کافی دیر ہوئی چلے گئے ہیں، آپ نے گیٹ بھی بند نہیں کیا۔"

"بس خیال نہیں آیا۔" وہ شرمندہ سی بیٹھے دیکھنے لگی، یمین نے سنجیدگی سے کچھ دیر بغور اس کی کیفیت کا جائزہ لیا۔

"بیٹھ جائیں۔" وہ بے تکلفی سے کہہ کر خود بھی سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گیا، ارا بھی کسی معمول کی طرح سامنے ٹک گئی۔

"سوچ بچار شروع سے آپ کی عادت ہے یا آج کل ذرا زیادہ؟" وہ ہلکی مسکراہٹ سے مسکرایا لیکن ارا خاموش رہی، اس کی جھجک بجا تھی لیکن یمین کا سوال بھی غلط نہیں تھا، پہلے وہ اس سے بے تکلف نہیں تھا بلکہ کچھ دنوں سے تکلف کی اس دیوار کو مزید اونچا کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن اگر وہ واقعی پریشان تھی تو یہ بھی یمین کی برداشت سے باہر کی بات تھی کہ چپکے چپکے اسے جلتے کڑھتے دیکھتا، پھر وجہ بھی نامعلوم۔

"ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مگن رہنے والی چلبلی سی لڑکی اب جانے خلاؤں میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔" یمین نے بہت سنبھل کر جملے کا انتخاب کیا۔

"آپ کسی الجھن میں لگتی ہیں، برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کیوں پریشان ہیں؟"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وہ چونک گئی۔

"آپ کے چہرے پہ لکھا ہے۔"

"آپ کو چہرے پڑھنا آتا ہے؟" اب کے اس نے حیرت سے دیکھا۔

"پتہ نہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے۔" وہ رکا۔

"جیسے آپ کنفیوژ ہیں۔"

"اچھا۔" وہ پھیکا سا ہنسی اب اور کہتی بھی کیا۔

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اپنی سوچوں کو آزاد چھوڑ دیں، ذہن پرسکون ہوگا تو حل خود بخود دکھنے آئیں گے۔" وہ روانی سے بولے گیا تو ارا ایک بار پھر حیران ہو گئی۔

"تو کیا آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ میں کیوں پریشان ہوں۔"

"او نہیں۔" یمین بے ساختہ ہنسا۔

"پتہ ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا، ویسے بھی مجھے تو لگتا ہے ابھی آپ پر بھی یہ واضح نہیں کہ آپ کیوں الجھن میں ہیں، پہلے آپ تو سمجھیں اپنے دل کی بات مجھ تک پہنچتے تو وقت لگے گا۔" اس بار یمین نے سنجیدگی سے وضاحت کی تو جانے کیوں ارا کی آنکھیں پانی سے بوجھل ہو گئیں، سامنے بیٹھا شخص اسے یوں اس کے بارے میں بتا رہا تھا جیسے کتاب کھلی ہو، اس نے بہت بے بسی محسوس کی جبکہ یمین اس کی بھیگی پلکیں دیکھ کر ازحد گھبرا گیا۔

"سوری، اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہو، میں تو صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ......" الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے، ارا ہتھیلیوں میں چہرا دے کر اور بھی شدت سے رونے لگی۔

"ارے پلیز...... رو نہیں تو مت۔" یمین نے چہرے پر رکھے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سے ہٹانا چاہا تو وہ جھٹ پیچھے کو ہوئی اور خود ہی اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں، اس کی عجلت پر یمین کو ہنسی آ گئی۔

"چلو، اگر اس برسات کو روکنے کا یہی طریقہ تھا تو میں پہلے ہی ہاتھ بڑھا دیتا۔" جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھوڑی واک کر لیں؟" یمین نے تائید چاہی لیکن وہ چپ کی چپ بیٹھی رہی۔

"آ نہیں بھئی۔" بالکل ہی بے ساختہ اس نے ہاتھ آگے کیا اور ارا فوراً کھڑی ہو گئی۔

"آپ سے بات منوانا تو بڑا ہی آسان ہے، یعنی جب بھی آپ بات نہ مانیں تو آپ کی طرف ہاتھ بڑھا دوں۔" وہ ہنسے ہی گیا اور اس بار ارا بھی دھیمی ہنسی ہنس دی، یمین کا مقصد بھی اس کی ذہنی رو تبدیل کرنا تھا اور دونوں کچھ دور تک خاموشی سے چلتے گئے۔

"تو...... موسم کی بات کریں؟" یمین نے خاموشی توڑی۔

"سنا ہے جب بولنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تو بندہ موسم کی بات کرتا ہے۔" ارا نے ہلکا سا طنز کیا تو یمین نے ہنس کر تائید کی۔

"تو ایک سنجیدہ بات پوچھوں؟" اس نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو جواباً وہ چپ ہی رہی۔

"ابھی روئی کیوں تھیں آپ......؟"

"وہ تو......" ارا گڑبڑا گئی۔

"بس آپ مجھے میرے بارے میں ایسے بتانے لگے جیسے سب جانتے ہوں تو۔"

"تو آپ کو رونا آ گیا۔" اس نے شرارت سے جملہ جوڑا تو ارا کو ہنسی آ گئی۔

"نہیں، مجھے ویسے ہی رونا ذرا جلدی آتا ہے۔"

"بڑی ہی لڑکیوں والی عادت ہے۔" وہ بے ساختہ بولا تو ارا مسکرا دی۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔"

"جی کیجیے ہاں پوچھیں۔"

"آپ اس رات کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے جب ہم شادی پر جا رہے تھے۔"

"اوہ!" یسین کچھ سوچنے کے لئے رکا۔

"ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی مجھے بھی اب ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔" اس نے صاف ٹالنے کی کوشش کی۔

"پھر تو موسم کافی ٹھیک تھا۔" اربا نے رکھائی سے کہا تو یسین سمجھ گیا وہ برا مان گئی ہے۔

"اربا یہ جو ہم اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، آپس میں باتیں کر رہے ہیں، یہ اسی اعتماد اور بھروسے کا ثبوت ہے جو آپ کی فیملی والے مجھ پر کرتے ہیں، پھر بھی میں مانتا ہوں مجھ سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں جنہیں سدھارنے کی میں پوری کوشش کر رہا ہوں، میرا مشورہ ہے اگر کچھ باتیں دل میں رہ جائیں تو بہتر ہوگا۔"

"یعنی کوئی بات تو ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ بیٹھی۔

"آپ جانتی ہیں یا جاننا چاہتی ہیں۔" یسین مسکرایا تو اربا لاجواب ہو گئی کیونکہ وہ جانتی بھی تھی اور جاننا چاہتی بھی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے، آپ کچھ پوچھنا چاہتی ہیں تو آپ کو اجازت ہے، میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ میری وجہ سے کسی پریشانی کا شکار رہیں، اگر آپ میری وجہ سے آج روئی ہیں تو میرے لئے بہت تکلیف کی بات ہے۔"

"نہیں میرے رونے کا تعلق آپ سے نہیں ہے، بس آج کل میرے حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں۔" وہ صدمے سے بولی تو یسین کے دل کو کچھ ہوا تھا، اربا ضرور کسی بڑی الجھن میں تھی اور وہ جانے کیا کچھ بول گیا تھا۔

"آپ بات مکمل کریں، شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں، کبھی کبھی الجھنوں کی نسبت کسی غیر سے مشورہ کر لینا زیادہ بہتر ہوتا ہے، آپ یقیناً مجھے ایک مخلص دوست پائیں گی۔" اس نے سادگی سے مشورہ دیا وہ اسے غیر تو ہرگز نہیں لگا، دل جانے کیا کچھ کہنے کو مچل اٹھا لیکن ہوا تو بس یہ کہ اس نے معاملے کے ایک پہلو یعنی آدھی بات پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی الجھن شیئر کرنے کا فیصلہ کیا اور یسین تو ہمہ تن گوش تھا۔

"میرے چچا زاد ہیں سعد اللہ، نعیم و مرجان ہیں، ان لوگوں سے ہمارے تعلقات کئی سالوں بعد اب بحال ہوئے ہیں، اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو صورت سے بھی نہیں پہچانتے تھے، میرے دادا ابو نے محسن چچا کو پسند کی شادی کی وجہ سے عاق کیا تھا اور مرتے دم تک معاف نہیں کیا، اس لئے بڑا ہونے تک ہم کبھی آپس میں ملے نہیں تھے لیکن ابھی سال بھر پہلے دادا ابا کی وفات کے بعد ابو اور چچا میں صلح ہو گئی اور ہمارا آنا جانا شروع ہو گیا۔" وہ ذرا دیر کو رکی۔

"ہوں..... ہوں۔" وہ پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

"وہ لوگ دو مرتبہ ہمارے گھر آئے لیکن میں چونکہ یہاں تھی تو ان سب سے مل نہیں پائی، اس روز میری دوست عصمہ کی شادی میں میرا پہلی بار سعد اللہ سے ملنا ہوا۔"

"وہی دوست جس کی شادی میں آپ میرے ساتھ گئی تھیں۔" وہ چونکا۔

"جی اسی رات کی بات ہے، میرے لئے اس روز کی اتفاقی ملاقات بہت خاص تھی، ہمارے گھرانے برسوں ایک دوسرے سے دور رہے ہیں، باقی سب کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ ہمارے گھروں کا آپس میں ملنا جلنا پھر سے شروع ہو جائے، میں سعد سے پہلے

تعارف کے لئے بہت بے چین تھی، لیکن مجھے حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سعد بھی مجھ سے ملنا چاہتا تھا، اس کی طرف سے جو رسپانس مجھے ملا وہ میری توقع سے بڑھ کر تھا۔" وہ ذرا دیر کو رکی اور دھیان سے اس کی بات سنتے یسین کو لگا کہ اربا کی الجھن حل ہوتے شاید اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے والا ہے۔

"کیا اس رات کے بعد دوبارہ ان سے ملنا ہوا۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جی دو تین مرتبہ ہم پھر بھی ملے ہیں اور۔" وہ اٹک کر رکی۔

"اور.....؟"

"اور ہر مرتبہ اس کی بے تابی میں اضافہ ہی دیکھا۔" بالآخر اس نے کہہ دیا۔

"تو آپ پریشان کیوں ہیں، ان سب باتوں سے تو آپ کے لئے خوشی کے پہلو نکلتے ہیں۔" اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"میں بھی خوش تو بہت ہوں لیکن......" الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے، کیونکہ یسین کا موبائل فون بجنے لگا تھا، وہ کال اٹینڈ کر کے معذرت کرتا تھوڑا دور چلا گیا اور جب تک وہ واپس آیا بوا چائے لے کر لان میں آ گئی تھیں، یسین خاموشی سے اپنا کپ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا اور وہ اپنے کپ سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے یہی سوچتی رہ گئی کہ جو کہنا تھا وہ تو دل میں رہ گیا اور جو کہہ دیا وہ اپنے معنی اور مفہوم کے حوالے سے یقیناً کچھ سے کچھ ہو گیا تھا، یسین اب سعد کے لئے اس کے جذبات کے متعلق کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا۔

☆☆☆

"چلو۔" وہ ریموٹ لے کر چینل تبدیل کرنے بیٹھی ہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔

"اوہو تو سویٹ کزن آج گھر پہ ہیں۔" بے تکلف شوخ لہجے پہ پہلے تو اربا خوب چونکی لیکن پھر سمجھ گئی کہ مخاطب کون ہے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام، بھئی بڑا نیک شگون ہے، اب تو میری آواز بھی پہچاننے لگی ہو۔" سعد نے بھی بھرپور شوخی سے کہا۔

"آپ نے مجھے کزن کہا، اس لئے پہچان گئی، ہمارے بس چند ہی گنے چنے کزنز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اتنا فرینک نہیں۔" اربا نے صاف گوئی سے واضح کیا۔

"چلو خیر، یہ بتاؤ، آج شام کو ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ڈنر.....؟" اربا نے زیر لب دہرایا۔

"باقی سب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔"

"باقی سب کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ صرف تم اور میں چلیں گے۔"

"جی.....؟" اربا حقیقی حیرت سے چلائی۔

"آہستہ یار، ڈنر پر ہی لے جا رہا ہوں، کے ٹو پر تو نہیں۔" وہ اس کی حیرت پہ بھرپور انداز میں ہنسا۔

"خیر تم سات بجے ریڈی رہنا، میں تمہیں گھر سے پک کروں گا۔"

"لیکن ایسے کیسے۔" وہ بوکھلا گئی۔

"مجھے سب سے پوچھ لینے دیں، ابو کیا سوچیں گے۔"

"ابو جو سوچیں گے مجھے پہلے سے پتہ ہے۔" وہ عجیب انداز میں ہنسا اور فون بند کر دیا۔

اربا نے امی کو بتایا اور ساتھ ہی اس کے نہ جانے کا عندیہ بھی دے دیا، وہ تو چپ ہو گئیں لیکن اعظم حسن نے گھر آتے ہی آمنہ سے کہا کہ شام کو اربا تیار رہے، سعد اسے باہر لے جائے گا۔

آمنہ نے کہنے کی کوشش بھی کی کہ دونوں کا اکیلے جانا مناسب نہیں لگتا لیکن اعظم نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ وہ ان دونوں کی شادی کے لیے صبر لیے ہیں۔

"اچھا ہے اگر پہلے تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔" اروما نے سنا تو بہت ناراض ہوئی لیکن آمنہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے چپ رہنے کا کہا۔

"پلیز آج اتنا دست کرو، پھر تمہارا کزن ہی تو ہے، ڈنر کر لینے میں کیا حرج ہے، شادی کی بحث کو ابھی رہنے دو پلیز۔" انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا تو اروما نے اثبات میں سر ہلا کر ماں کے دونوں ہاتھ تھامے۔

"اوکے آپ پریشان نہ ہوں، میں تیار ہوتی ہوں۔" وہ جانتی تھی کہ مزید ضد کی تو ابو اسی سے جھگڑا کریں گے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے بلاوجہ ان کو اہمیت ملتی چلی جائے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بے مقصد سڑکوں پر گاڑی گھماتے سعد اللہ نے ڈھیروں ڈھیر باتیں کی تھیں، اروما کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بنا اس کے رسپانس کی پرواہ کیے نہایت روانی گفتگو کیے جا رہا تھا، حالانکہ صاف دیکھ رہا تھا کہ اروما ہرگز اس کی طرف ملتفت نہیں ہے، پھر بھی اس کی بے تکی اور مضحکہ خیز جملے بازی جاری تھی۔

ویلنٹائن ڈے تک اروما نے ٹھان لیا کہ اب چپ رہ کر سعد اللہ کو مزید بڑھاوا نہیں دے گی، اس لیے خود ہی بولنا شروع کر دیا، کھانے کے دوران اس نے سعد اللہ کے پروفیشن سے لے کر سیاست تک ہر موضوع تک پہ مسلسل اس کا سر کھایا اور سعد اللہ کے پاس سوائے اس کے سوالوں کے جواب دینے کے کوئی راستہ نہیں چھوڑا، واپسی کے سفر میں بھی وہی بولتی رہی، بالآخر سعد نے کہہ ہی دیا۔

"تم اپنی عمر سے کئی سال بڑوں والی گفتگو کرتی ہو، ذرا اپنے مزاج میں شوخی اور دلچسپی پیدا کرو، جیسے باقی لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

"او تو آپ کو ایسی لڑکیاں پسند ہیں۔" اروما نے بھنویں اچکائیں۔

"بھئی لڑکیاں تو شرارتی، لاپروا اور چنچل ہی اچھی لگتی ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"چلیں اللہ کرے آپ کو آپ کی پسند کے مطابق ایسی ہی پارٹنر ملے۔" اروما نے گاڑی کے دروازے کھولتے ہوئے دعا کے انداز میں کہا۔

"محبت بھی تو کروں گا۔" وہ ایک ادا سے بولا۔

"یعنی جذباتی بلیک میلنگ۔" اروما نے بے ساختہ کہہ کر بغور اس کی طرف دیکھا تو سعد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تمہیں ابھی لگے گی یہ جذباتی بلیک میلنگ۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔" وہ ایک دم نروس ہو گئی اور بنا مزید کچھ کہے باہر نکل آئی۔

"یہ تو بہت بدتمیز ہے۔" وہ تیز دھڑکنوں پہ قابو پاتے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

گھر والے جتنا اسے سعد کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے خصوصاً ابو، وہ اتنا اس سے دور بھاگ رہی تھی اور جتنا زیادہ وہ ان دنوں ہمین کے متعلق سوچ رہی تھی اتنا وہ زیرد ہو رہا تھا، وہ دو دن پہلے اس نے ماں جی سے بات کرنے کے لیے فون کیا تو کال ہمین نے اٹینڈ کی، اروما نے کافی خوشدلی سے سلام دعا کا آغاز کیا، ہمین نے آگے سے صرف اتنا کہا۔

"ایک منٹ میں ابھی آنٹی کو بلاتا ہوں۔" اروما حیرت سے ریسیور کو دیکھے گئی۔

"ہو سکتا ہے مصروف ہو، یا کہیں جانے کی

جلدی ہو، لیکن وہ ابا تو نہیں کر سکتا تھا۔" وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ جب بانو ای آ گئیں، اروما نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ تین دو دن تک چکر لگائے گی۔

☆☆☆

"السلام علیکم بانو ای!"

"آؤ بھئی وعلیکم السلام! صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔" ماں جی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم کر پاس بٹھایا۔

"ابھی تمہاری بات شفقت سے کر رہی تھی کہ ان دونوں نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں اب تم کو قربان نہ ہوں گھر میں تو مجھے مزا نہیں آتا۔"

"کھانا لگاؤں اروما جی!" بوا اٹھتے لگیں۔

"نہیں بوا! اتنی جلدی تو بالکل نہیں، ابھی تو لاؤنج پینے کا موڈ ہے اور میں خود ہی بناؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ دونوں بھی لیں گی ناں؟"

"ہاں بنا لو، کھانا ہم بھی لیٹ ہی کھائیں گے، نی الحال نماز پڑھ لیں۔" بوا نے دو جائے نماز سامنے بچھائیں، اروما کچن میں آ گئی، ابھی کیتلی چولہے پر رکھی ہی تھی کہ گھر مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔

"اوہ۔" اروما نے ہونٹ بھینچے۔

یقیناً لائٹ کافی دیر سے نہیں تھی اور یو پی ایس کام کر رہا تھا اور اب وہ بھی کام چھوڑ گیا تھا، اس نے ماچس جلا کر ایمرجنسی لائٹ چیک کی لیکن وہ بھی چارج نہیں تھی، اروما نے موم بتی جلا کر پہلے بانو کے کمرے میں رکھی اور واپس آ کر دوسری اپنے لیے جلائی، اسی وقت ہمین کچن کے دروازے میں آیا، اروما نے سیدھا ہوتے ہوئے سلام جھاڑا۔

"وعلیکم السلام! ایک کینڈل چاہیے اگر ہو تو۔" عجلت بھرا سنجیدہ لہجہ۔

"جی ہے۔" اروما نے فوراً ماچس اور کینڈل اس کی طرف بڑھائے۔

"آپ چائے بنائیں گی؟" اس نے مڑ کر جاتے ہمین سے سوال کیا۔

"ہوں۔" ہمین نے کچھ دیر سوچا۔

"سب کے لیے بن رہی ہے تو ٹھیک ہے۔"

"اوکے پھر میں اوپر ہی لے آتی ہوں، بس پانچ منٹ۔"

"اوپر آنے کی زحمت نہ اٹھائیں، پانچ منٹ کی بات ہے تو میں باہر ویٹ کر لیتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گیا اور اروما اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"تو جناب رینہ رو ہی نہیں ناراض بھی ہیں، خود کو ٹراپی اینگل کا تیسرا کونا سمجھ کر پکچر سے نکلنے کی عملی کوشش کر رہے ہیں۔" اروما جان گئی کہ اس روز کی ملاقات میں آخری جملے سے ہمین نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہو گا، جس کا مظاہرہ اس کے سرد رویے سے صاف جھلک رہا تھا، اس کا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا، ہنسی روک کر وہ چند قدم آگے آ گئی۔

"باہر کافی اندھیرا ہے آپ یہاں اندر بیٹھ جائیں۔"

"ہوں۔" وہ بنا مزید کچھ کہے اندر کی چھوٹی ٹیبل کے ساتھ بیٹھ گیا، چائے تیار تھی اروما نے پہلے دو کپ بانو اور بوا کے لیے ٹرے میں رکھے اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"میں بس ابھی آ گئی۔"

ان دونوں کی چائے کمرے میں رکھ کر وہ فوراً واپس پلٹی، اروما نہیں چاہتی تھی کہ نماز سے فارغ ہو کر بوا اس کے پیچھے کچن میں آ جائیں،

لالن کی ادھوری بات کو پورا کرنے کا یہی سب سے مناسب موقع تھا جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، ارما اپنا اور یمین کا کپ لے کر نشل کے قریب آگئی، وہ سامنے رکھی کینڈل کے پگھلتے قطروں سے کھیل رہا تھا۔

"آپ کو اعتراض نہ ہو تو کیا ہم یہیں بیٹھ کر چائے پی سکتے ہیں؟" ارما نے اجازت طلب انداز میں پوچھا تو یمین نے محض سر ہلا دیا، ارما نے اس کے سامنے رکھی اور چیئر پر بیٹھ گئی، یمین نے خاموشی سے کپ لبوں سے لگایا، ارما نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا جو بالکل اس کی جانب متوجہ نہیں تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چہرہ پڑھنے کے لئے کینڈل کی روشنی کافی ہوگی؟"

"جی؟" یمین نے چونک کر سر اٹھایا۔

"جاننا چاہتی ہوں اب وہ کنفیوژن دور ہوئی۔"

"میرے کہنے کا اتنا یقین ہے آپ کو؟" اس نے نظریں ہنوز کپ پر جمار کھی تھیں۔

"چہرہ پڑھنے کی حد تک تو ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"یعنی؟" وہ قطعاً نہیں سمجھا۔

"میرا خیال ہے چہرے تو آپ ٹھیک ٹھاک پڑھ لیتے ہیں لیکن اندازے لگانے میں غلطی کر جاتے ہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" وہ حیران ہوا۔

"چلیں اس پر بعد میں بحث کریں گے، پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں جو میں نے اپنی کنفیوژن کے حوالے سے پوچھا تھا۔" وہ اس وقت کافی ایزی سچویشن میں بیٹھی تھی یہ اعتماد ہی یمین کو چونکانے کے لئے بہت کافی تھا، اس

فیصلہ کن انداز کے پیچھے اس کی وہی کوئی محرک تو ہرگز کارفرما نہیں تھی، تو کیا سعد کے حوالے سے اسے کچھ وہم لاحق ہوا تھا، شاید یہ اسی کا دیا اعتبار ہے، وہ سوچوں سے باہر نکلا۔

"لگتا تو ہے کہ آپ کی الجھن اب قدرے ذہنی سکون میں تبدیل ہو چکی ہے، کیا کچھ طے پا گیا ہے؟"

"میں نے ٹھیک سمجھا تھا آپ اندازے لگانے میں واقعی غلطی کر جاتے ہیں۔" وہ مدھم انداز میں ہنسی، یمین اس شوخی کا مفہوم سمجھنے سے اب بھی قاصر تھا۔

"آپ چاہیں تو اس روز کی بات آج مکمل کر سکتی ہیں، اس دن سچویشن کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں پوری بات نہیں سن پایا تھا۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" وہ کچھ مبہم سا مسکرائی، یمین کا دل حقیقی معنوں میں اوپر تلے ہوا، وہ خوش تھی اور خوشی کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی، اپنی کوتاہیوں کا ازالہ تو وہ بے حسی کی چادر اوڑھ کر کر چکا تھا، رد کیے جانے والے ایسے خوش نہیں ہوتے، یقیناً وہ اپنا جھکاؤ کسی ایک جانب کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور ظاہر ہے جھکاؤ وہیں ہوا ہوگا جہاں سے اچھا رسپانس ملا تھا، یمین کو عجیب سی گھٹن ہونے لگی، جب فیصلے دل پر جبر کر کے کیے جاتے ہیں تو بے چینی اور گھبراہٹ یونہی دل میں ڈیرے ڈال لیا کرتی ہے۔

"جی..... آپ کچھ بتا رہی تھیں۔"

"شاید آنے والے دو تین ہفتوں میں میری اور سعد کی بات طے پا جائے۔" جملہ تھا یا دھماکہ، یمین کو لگا وہ پتھر کا ہو گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

جونہی کار کو حیدر آباد کے بیرونی شہر سے نکال کر جام شورو کی طرف رخ کیا ہے تو اپنے دل پر پڑے بوجھ کو اور بھی زیادہ محسوس کیا ہے، اداس سوچوں کو دور کرنے کی خاطر دریا کنارے کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کرنا چاہا اور دھیان کو بٹانے کے لئے آس پاس بکھرے نظاروں کی طرف دیکھتا ہوں اور راستہ طے کرتا رہا ہوں، پھر جیسے ہی جام شورو والی پل کو کراس کیا ہے تو، پتا نہیں کیوں، خود بخود کار کی اسپیڈ کو ہلکا کیا ہے اور دائیں طرف مڑ کر ''المنظر'' کی طرف رخ کرتا ہوں۔

آج پھر وہ ہی موسم ہے اور وہ ہی شام کا سماں، میرا ذہن بار بار ماضی کے جھروکوں سے جھانکنا چاہتا ہے، میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ''المنظر'' کے لان میں رکھی ٹیبل کی طرف بڑھا اور کرسی کھسیٹ کر بیٹھ گیا، آس پاس نظر دوڑائی تو دوسرے لوگ بھی نظر آئے، میری عجیب اداس کیفیت ہو رہی ہے، شام ڈھل رہی ہے اور فضا گھر لوٹنے والے پرندوں کے غولوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے خوبصورت لگ رہی ہے، آس پاس لوگوں کی دھیمی آوازیں، برتنوں کی ہلکی سی کھنکھناہٹ اور پل پر سے گزرنے والی بڑی گاڑیوں کا شور ایک فاصلے سے آ رہا ہے، میرے سامنے ''سندھو'' دریا کی موجوں پر ڈوبتے سورج کا عکس بھی نظر آ رہا ہے، اتنے میں ویٹر میرے آرڈر کے مطابق چائے لے آیا ہے، میں ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر چائے پی رہا ہوں اور میرے خیالات مجھ سے بھٹکنے لگے ہیں اور ماضی کی کئی میٹھی اور کھٹی باتیں یاد آ رہی ہیں اور بار بار رباب کا چہرہ میرے تصور پر چھا رہا ہے جو یادوں کی وادیوں میں لئے جا رہا ہے۔

''ہاں رباب! ہمارا خاندان بھی روایتی گھرانوں میں سے تھا جو جتنے بڑے ہوتے ہیں، اتنے ہی بڑے مسائل اور جھگڑوں میں گھرے ہوتے ہیں اتنے ہی بڑے زر جھگڑے زمینوں، جائیداد اور لڑکے لڑکیوں کے رشتے کے حوالے سے ہوتے ہیں جہاں اکثر ان کے مستقبل کے فیصلے ان کے بڑوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور پھر بھی ایسے غلط فیصلے کیے جاتے ہیں جن کی سزا کئی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے، ایسے ہی کسی غلط فیصلے کی وجہ سے بابا سائیں اور چاچا سائیں میں شدید اختلافات ہو گئے اور اس کی سزا ہمیں بھگتنا پڑی کہ ہم سب ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔''

''رباب! تم تو ہم سب کی بہت پیاری پھپھو کی بیٹی تھیں جنہوں نے بہت دکھ سہے تھے، پھپھا خاندانی دشمنی کے نتیجے میں قتل کر دیے گئے اور ان کی موت نے پھپھو کو روگ لگا دیا اور وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ زندگی کی آخری اسٹیج پر پہنچ گئیں اور جوانی میں ہی تمہیں تین سال کی عمر میں چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ لیا، تب تم چاچا سائیں کے گھر آ گئیں تھیں اور وہیں پلی بڑھیں تھیں، چاچا سائیں نے ہمیشہ تمہیں بہت پیار دیا اور تم میں اور اپنی بیٹیوں فریدہ اور فہمیدہ میں ذرا برابر فرق نہیں رکھا۔''

''ہاں مجھے آج بھی یاد ہے، جب ہم لوگ حیدر آباد سے شفٹ ہو کر کراچی آ گئے تھے، اس وقت میری عمر چند سال تھی اور تم مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھیں، پھر بابا سائیں اور چاچا سائیں کے درمیان رنجشیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ہم سب ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے اور حیدر آباد اور کراچی کا فاصلہ ہم لوگوں کے درمیان کئی دریے بڑھ گیا کہ ہم کئی سالوں تک پھر بھی مل نہیں پائے تھے۔''

''اتنا عرصہ بیت گیا کہ پھر چاچا سائیں کے بڑے بیٹے ادا اشفاق کی شادی نے ہمیں اکٹھا کیا، جب ان کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو چاچا سائیں اور چاچی بابا سائیں کو منانے آئیں کہ ہم لوگوں میں یہ قدیم روایت ہے کہ اپنے خوشیوں سے بھرپور موقعوں پر روٹھے ہوؤں کو منایا جاتا ہے۔''

''شادی اٹینڈ کرنے کے لئے ہمارا پورا خاندان تم لوگوں کے پاس حیدر آباد آیا، تب تک بہت کچھ بدل چکا تھا اور تم بھی تو کتنا بدل گئی تھیں... چھوٹی سی شرارتی اور معصوم سی بچی ''رباب'' اب ایک خوبصورت جوان لڑکی کے روپ میں میرے سامنے تھی، اب تم خاصی سنجیدہ ہو گئی تھیں اور بردبار بھی، تم خاندان کی دوسری تمام لڑکیوں سے مختلف تھیں، جب باقی لڑکیاں شادی کے لئے ہنگاموں میں مصروف ہوتیں، گانے گاتیں، قہقہے لگاتیں، سارا سارا دن شاپنگ کرتیں، میک اپ، ڈریسز اور جیولری کی باتیں کرتیں یا پھر ڈھولک کی تھاپ پر گیت گایا کرتیں تو تم ان سب سے الگ الگ رہتیں، روزانہ اپنے کمرے میں یا پھر لان میں درخت کے نیچے بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی یا پھر پینٹنگ بنانے میں مصروف رہتیں، تم بہت اچھی آرٹسٹ تھیں اور فائن آرٹس میں ماسٹر کیا تھا تم نے، اکثر تم دنیا ومافیہا سے بے خبر پینٹنگ میں مصروف ہوتیں تو میں تمہیں دیکھا کرتا تھا اور تمہیں تو میری موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا اور پھر نجانے کیسے تم میرے دل کی تنہائیوں میں اتر گئیں اور میں خود حیران ہو گیا کہ یہ کیسے ہو گیا کیونکہ میں یعنی دانیال حسن میں جو سارے خاندان کا سب سے خوبرو اور وجیہہ لڑکا تھا اور خاندان بھر کی اور یونیورسٹی کی لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں اس لئے خاصا مغرور اور خودسر بھی تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے بگاڑنے والے میرے اپنے اور دوست اور ساتھی تھے جنہوں نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ میں کوئی بہت ہی اونچی چیز تھا اور پھر دولت کا گھمنڈ بھی تھا اس لئے خاصا ضدی اور مغرور تھا اور یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ جس لڑکی کو بھی چاہتا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کا آرٹ جانتا تھا، اسی لئے یہ یقین تھا کہ جب میں تم سے اظہار محبت کروں گا تو تم تو خود کو بہت ہی خوش نصیب لڑکی سمجھو گی۔''

''ہاں میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ شام جب ادا اشفاق کی مہندی کی رسم ہو رہی تھی، گھر بھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا، قہقہے گونج رہے تھے اور خاندان بھر کی لڑکیاں مہندی کو سجا بھی رہی تھیں اور ناچ گانے کا مقابلہ بھی جاری تھا مگر تم حسب معمول فقط مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے انہیں دیکھ کر انجوائے کر رہی تھیں، کاسنی رنگ کے سوٹ میں تم سادگی میں بھی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں اور میں اپنی نظروں کو تم سے ہٹا ہی نہیں پا رہا تھا، اسی رات مہندی کی رسم کی رونقوں اور ہنگاموں کے درمیان موقع ملتے ہی میں نے تم سے اظہار محبت کر دیا تو تم گھبرا کر چلی گئیں اور میں تمہاری کیفیت کو حیا سمجھتے ہوئے انجوائے کرتا رہا۔''

ادا اشفاق کی شادی کا دن تھا اور حسب معمول لڑکیاں میک اپ، کپڑوں کی میچنگ اور جیولری کی باتوں میں مگن تھیں اور خاندان کے لڑکوں کے تبصرے کے مطابق اپنے آپ پہ، لیپا پوتی کر رہی تھیں کہ تم نظر آئیں تو میں باہر جاتے جاتے رک گیا تھا، تم نے پنک شرٹ اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا اور نازک سا جیولری سیٹ اور ہلکا میک اپ تمہارے حسن کو دو چند کر رہا تھا کہ تمہارے

دور جب مہران موج میں آیا اور آنکھوں کے تمام بند توڑ کر وہ سیلاب لے کر آیا تو مجھے بہت سکون محسوس ہوا کہ میں نے تو ہمیشہ سے یہی چاہا تھا کہ تمہیں ہارتے ہوئے دیکھوں۔"

"آج تھوڑی دیر پہلے جب میں تمہارے گھر سے نکل کر کراچی جانے کے لیے کار میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ تم تیزی سے میرے قریب آئیں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا سا گفٹ پیک میری طرف بڑھایا اور تیکھے تیکھے قدموں سے واپس لوٹ گئیں۔"

اب جب جامشورو کی سرخ خوبصورت شام آہستہ آہستہ گہرا سرمئی پیرہن اوڑھ رہی ہے، شفق کے گہرے رنگ سندھو دریا کی لہروں پر لہرا رہے ہیں تو میں بھی ماضی کی یادوں سے نکل کر حال میں لوٹ کر آیا ہوں تو اب مجھے اس گفٹ کا خیال آ رہا ہے کہ آخر اس میں کیا ہے؟ میں کار کی طرف بڑھتا ہوں اور سیٹ پر پڑا پیکٹ اٹھا کر ریپر ہٹاتا ہوں تو میری نظر ایک خوبصورت پینٹنگ پر پڑتی ہے جو تمہاری بنائی ہوئی ہے۔ اس میں بھی شام کے گہرے ہوتے ہوئے رنگ ہیں اور ایک لڑکا اور لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ دیے اپنے روشن گھر کی طرف بڑھ رہے ہیں جبکہ دوسری جانب ایک درخت کے سوکھے اور کھوکھلے تنے کے پیچھے، بکھرے ہوئے پیلے پتوں کے درمیان ایک لڑکی اداس نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہے۔ اچانک سے میری نظر پیکٹ میں پڑے ایک لفافے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں اور پینٹنگ کو احتیاط سے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر لفافہ لیے دریا کے کنارے کی ریلنگ کے قریب آتا ہوں اور لفافہ کھولتا ہوں، تمہارا خط ہے اس میں سرمئی شام میں خط کو پڑھتا ہوں۔

دانیال!

مجھے یہی بتایا گیا کہ تمہیں کس طرح مخاطب کروں، کزن کی حیثیت سے یا پھر اس بے نام رشتے کے حوالے سے جس میں تم نے مجھے سالوں سے جکڑ رکھا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت ناراض ہو مجھ سے کیوں کہ میرے رویے کی وجہ سے تمہاری انا کو بہت ٹھیس پہنچی ہے اور تمہارا دل ٹوٹا ہے کہ میں نے تمہاری محبت کا جواب کبھی بھی محبت سے نہیں دیا ہے وہ پیار کا خوبصورت اقرار جو تم میری زبان سے سننا چاہتے ہو، مگر میری زبان بند رہی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اس بات کو راز ہی رکھوں گی اور تم مجھے آخر کار بھول ہی جاؤ گے اور مجھے اپنے دل سے نکال دو گے۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے ضدی نکلو گے اور تمہاری انا پرستی تمہیں بے سکون رکھے گی۔ یہی دیکھ کر آج میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں کہ میری بے رخی کا سبب کیا تھا۔

دانیال تمہیں معلوم نہیں کہ ادا اشفاق کی شادی پر جب ماموں جان تمہارے بابا سائیں کو منانے کے لیے آئے تھے تو ان کی صلح کن شرائط پر ہوئی تھیں۔ زمینوں اور جائیداد کے معاملات کے علاوہ یہ بھی شرط رکھی گئی تھی کہ فریدہ کا رشتہ تمہیں دیا جائے گا۔ تو پھر تم ہی بتاؤ کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں کس طرح تمہاری محبت کا جواب اسی طرح دیتی؟ ماموں جان کے مجھ پر ہزاروں احسان ہیں، انہوں نے فریدہ، ثمینہ اور مجھ میں ذرا برابر بھی فرق نہیں رکھا ہے۔ تو پھر میں کیسے احسان فراموش بن جاتی؟

جانتی ہوں کہ تم ماموں جان سے فریدہ کے بجائے میرا رشتہ مانگتے تو وہ خوشی سے مان جاتے مگر دانیال میں نہیں چاہتی تھی کہ میں دونوں بھائیوں کے بیچ میں آؤں کیونکہ میری تو اپنی بھی

یہی خواہش تھی کہ دونوں بھائیوں کے بیچ سمدھیوں کا رشتہ بھی جڑ جائے تو یہ اور بھی مضبوط ہوگا اور ہمارا خاندان پہلے کی طرح بکھرنے نہ پائے گا۔ فریدہ تو میری سگی بہن کی طرح ہے اس لیے اس کی خوشی مجھے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔

البتہ اگر میرے محبت کے اقرار سے تمہاری انا کی تسکین ہو سکتی ہے تو لو آج میں اقرار کرتی ہوں کہ تم ہی ہو جس نے مجھے پیار کے حسین احساس سے آشنا کیا تھا اور اب زندگی بھر کوئی اور شخص میرے من کے تار چھیڑ کر محبت کا کوئی گیت بکھیر نہ پائے گا کیونکہ میرے دل پر تو لطیف سا نقش محبت پہلے سے نقش ہے۔

سک کی سیریں جھمن ترانیں سئیں تار
توں گئی روح میں توں نی اکھیاں بار
پر بی سکے پار سوں وا جھمنڈی ور ہے تھا
(جیوں جیوں جیروں دریا میں توں توں بڑھے ہے پیار
تو ہی جوت ہے جیون کی تو ہی روح میں یار
تجھ کو دریا پار تکنے تک بیتے ہیں)

"اف خدایا! دریا یہ سب کیا ہو گیا؟ یہ میں نے کیا کیا تمہارے ساتھ؟ ہاں آج کے بعد شاید میری انا کی تسکین ہو جائے اور شاید میرے دل کو سکون مل جائے کیونکہ میرے دل اور روح پہ جو بوجھ تھا وہ ہلکا ہو گیا ہے، مگر مجھے لگ رہا ہے کہ میں محبت کی بازی جیت کر بھی ہار گیا ہوں اور تم [illegible] ہو۔"

میں اپنے خیالوں میں مست ہوں کہ اچانک ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا میرے ہاتھ سے تمہارا خط چھین کر سندھو کے پانی پہ پھینک دیتا ہے اور مہران کی موجیں بے چین ہو کر اسے جکڑتے ہوئے دور بہت دور لے جا رہی ہیں۔ میں آخری حد نظر تک کاغذ کے اس ٹکڑے کو دیکھتا ہوں جو تمہارے پیار کا امین تھا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس جا کر کار میں بیٹھ جاتا ہوں۔

دور...... اب...... جب میری کار جامشورو کو بہت پیچھے چھوڑ کر اور حیدرآباد کو الوداع کہہ کر کراچی کی طرف رواں دواں ہے اور رات جو اپنے پر پھیلا چکی ہے، تب ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے درمیان میں سوچتا ہوں کہ۔

"رباب! تمہارے پیار کا واحد پیامبر سندھو کی لہروں کے حوالے ہو چکا کہ کیوں کہ تمہارا پیار بھی مہران کے پانی کی طرح شفاف اور پاک ہے اور دریا کی موجوں سے مل کر امر بن جائے گا کیونکہ محبت کے دریا کے جوش اور حدوں سے بہتے مہران کو کوئی مات نہیں کر سکتا ہے۔"

☆☆☆

نایاب جیلانی

بارہویں قسط کا خلاصہ

امام فریدے ایک ایکسیڈنٹ کی بدولت شاہوار جو سے ملتا ہے، ان کی ملاقات دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"سرکاری مرکز صحت" میں امام فریدے ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک جاتا ہے، اس لڑکی کے نقوش امام فریدے کی بہن کوثر سے ملتے جلتے ہیں، یہ انکشاف امام فریدے کو حیران کر دیتا ہے۔

ہیام "احسان منزل" کے مکینوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے، اسے اسامہ اور نثرہ کا کردار اس گھر میں بہت دلچسپ لگتا ہے۔ ہیام کی اسامہ سے بہت دوستی ہو جاتی ہے جس پہ نثرہ اسامہ کو محتاط رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔

نبیل، صحت کو ساتھ لے کر سرکاری بنگلے پہ امام فریدے سے ملنے کو جاتی ہے، امام فریدے، نبیل کو دیکھ کر بے رخی کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب اس کی نگاہ صحت پہ پڑتی ہے تو اس کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔

ہیام کو اپنے گھر پیسے بہت ارجنٹ بھجوانے ہیں، مسز ربیعہ کے مشورے پہ وہ اسامہ کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیرہویں قسط

سپیریئر کالج میں آج اس کا پہلا دن تھا۔
اور اس کی حالت اس وقت تک بالکل اس بچے جیسی تھی، جو پہلے دن اسکول آ کر بولایا بولایا سا ہر ایک چہرے میں اپنی ماں کو تلاشتا ہے، گو کہ وہ کسی چہرے میں اپنی ماں کو نہیں تلاش کر رہا تھا تاہم ہر ایک اجنبی چہرے کو دیکھنا کچھ کنفیوز ضرور کر رہا تھا۔
پہلے دن کی کلاس خیر و عافیت سے گزر گئی تھی، دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی گیا، ہر طرف امن و امان ہی رہا، بہت دن سے نہ سہی، لوی نے پڑھائی میں دلچسپی لینی شروع کر ہی دی تھی، کیونکہ اسامہ کی وارننگ ابھی تک دماغ میں تازہ تھی، اس نے آخری مرتبہ اسے جتایا تھا۔
"اگر اب بھی فیل ہونے کا سابقہ ریکارڈ قائم رکھا تو پھر تیار ہو جانا، میں تمہیں کسی فیکٹری کی لیبر میں بھرتی کروا آؤں گا، تاکہ تم اپنا پیٹ خود پال سکو، ہم سے "وہلے سنڈے" کے خرچے نہیں اٹھائے جاتے۔" اسامہ کی دھمکی بھی کارگر ثابت ہو چکی تھی اور اس کے الفاظ بھی ضائع نہیں ہوئے تھے، اسامہ کی نصیحتوں کے زیر اثر لوی نے بڑی شرافت کے ساتھ بالآخر کتابوں میں دل لگانے کی کوشش کر ہی لی تھی، اپنی ساری غیر اخلاقی سرگرمیوں کو بھلا کر، لیکن اس دن بڑا ہی عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔

وہ جو اسے کالج فیلوز اور کالج کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر چکا تھا، اس دن تو لوی کا دل چاہا، یا زمین پھٹے اور وہ اس زمین میں سما جائے یا آسمان اسے چند لمحوں کے لیے اٹھا لے، کم از کم وہ شرمندہ نگاہوں سے وقتی طور پر خود کو محفوظ دیکھنا چاہتا تھا۔
لیکن ایسا بالکل بھی نہ ہوا، نہ زمین پھٹی اور نہ آسمان نے اسے اٹھانے کی زحمت گوارا کی، زمین کے ایسے بوجھ کو زمین ہی ڈھونے کا حوصلہ رکھتی تھی، لوی کو اس لمحے اندازہ ہوا تھا۔
اس کے سامنے وہی نزاکت کا مرقع بنی خاتون کھڑی تھی، وہی..... شانزے مہروز جس کا پرس اور نقدی اڑا کے لوی نے دوستوں کے ساتھ مری میں خوب عیاشی کی تھی، بعد ازاں فون پر اسے دھمکاتا بھی رہا تھا اور آج اسی "بھٹے خان" لوی کے گلے میں وہ اپنی استادی کا پھندا ڈالے کھڑی تھی، لوی کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا، اسی خاتون نے اگلے دو سال تک اسے تعلیم دینے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔
وہ خرابی طبع کی وجہ سے "لیو" پر تھی اور اب مکمل شفایاب ہو کر درس کے میدان میں مکمل طور پر کود پڑی تھی۔
کلاس میں تو لوی کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملی تھی، لیکن کلاس کے بعد وہ شانزے کو دوبارہ دکھائی نہیں دیا تھا، حالانکہ وہ اس کی الگ سے "تفصیلی" کلاس لینے کا بھرپور ارادہ رکھتی تھی۔
لیکن لوی صاحب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب رہے تھے اور اگلے چار دن تک "بیماری" کا بہانہ بنا کر کالج سے غیر حاضر رہے، تاہم پانچویں دن اسامہ کی فون کال پر لوی کی وہ درگت بنی کہ اس سے اگلے دن کالج میں چار و ناچار جلوہ گر ہو گیا۔
لیکن پھر خدا کی کرنی یوں ہی ہوئی کہ محترمہ شانزے مہروز نے شاید اسے ایک طالب علم کی مانند معاف کیا تو گویا لوی صاحب کی جان میں جان آ گئی تھی۔

شانزے نے اس کے ساتھ کارنامے پر جب روشنی ڈالنے سے گریز برتا تو لوی بھی اپنے "جامے" میں لوٹ آیا، الحمدللہ خیر صلا، بیگم شانزے شاید اس معمولی سی واردات کو بھول گئی تھی، لوی کی تسلی کے لیے یہی کافی تھا، لیکن جب وظیفے پر چیک کا اختتام ہوا اور وہ اپنا اپنا ووٹ کارڈ لینے کے لیے بیگم کے آفس پہنچے تب تانی کے ہاتھ میں کارڈ تھماتے ہوئے شانزے نے اسے گہری نگاہوں سے ٹٹولا تھا، اسے ایک وقت میں ہراساں کرنے والا اس وقت بڑا ہی کنفیوز کھڑا تھا، شانزے کو بڑا ہی مزہ آیا تھا۔
"تمہیں ایک ڈکیت سے "طالب علم" کے روپ میں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔" لوی کے لیے یہ الفاظ کسی طمانچے سے کم نہیں تھے، طمانچہ بھی ایسا جس پر وہ بلبلا بھی نہ سکتا تھا۔
"ویسے اس عمر میں تمہیں کسی جاب سے منسلک ہونا چاہیے تھا۔" شانزے کے اگلے الفاظ پر لوی زہر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا، نہ ہوتی یہ استانی تو مزہ چکھا دیتا، مگر اسامہ کی نصیحتیں بھی یاد تھیں، یعنی خود پر کنٹرول کرنے پر مجبور تھا، ورنہ تڑی اور ولا جواب ہوتا؟ بھلا کس کتاب میں لکھا تھا؟
"بہت خوب تم خاصے سدھر چکے ہو، یہ بہت خوش آئند عمل ہے۔" جانے یہ تعریف تھی یا طنز؟ لوی سر تا پا جل کر رہ گیا تھا۔
"اور تمہاری شروعات میں ہی کارکردگی بہتر ہے، ویل ڈن، ویری گڈ۔" اب کہ یقیناً اس کی تعریف کیا گیا تھا، تاہم لوی کو وہ بھی خوشی نہیں ہوئی تھی، بکل میں لپیٹ کر جوتے مارنا شاید اسی کو کہتے تھے، وہ اندر تک تلملا کر رہ گیا تھا۔
"بڑی نوازش ہے، جو آپ کو میری کارکردگی اچھی لگی۔" لوی نے جل کر جواب دیا تھا، شانزے کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی، اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا تھا، اونٹ پہاڑ کے نیچے، اس نے اپنی مسکراہٹ بمشکل چھپائی تھی۔
"امید ہے ایسی کارکردگی کا ہی مظاہرہ کرتے رہو گے۔" شانزے نے اسے مزید جتایا تھا۔
"آپ جیسے مہربانوں کا سایہ سر پر سلامت رہا تو اس سے اچھی کارکردگی بھی دکھا سکتا ہوں۔" اس نے بظاہر شائستگی کے ساتھ دل کی گھٹن باہر نکالی تھی، تب شانزے نے اسے پہلی مرتبہ گھور کر دیکھا اور بولی۔
"واٹ ناٹ، اب تم جا سکتے ہو۔"
"شکریہ۔" وہ کڑوے بادام چباتا باہر آ گیا تھا، پھر گہرا سانس بھرتا سیڑھیاں اترنے لگا۔
"آہ، نعمان صاحب، اب آئے ہو نا اونٹ کے نیچے۔" اس کا اترا منہ سیڑھیاں اترنے کچھ اور بھی اتر رہا تھا۔

☆☆☆

ان دنوں علاقے کے حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔
شین قبیلے کے اندر کچھ دھواں سا اٹھ رہا تھا، جس کے اثرات ہنو خاندان پر بھی پائے جانے تھے، کیونکہ سبا خان کی والدہ شین قبیلے میں بیاہی گئی تھیں، یوں رشتہ داری کا بھی تقاضا تھا۔
سردار ہنو ان دنوں شدید ہیجانی پریشانی کے گھیرے میں تھے، کسی بھی وقت لڑائی متوقع تھی، اگر

ہو گیا۔

نیل بر کو کیا خبر تھی؟ وہ کس گناہ کے رستے پہ چل پڑی ہے؟ ان سرداروں کی نگاہ میں قابلِ معافی گناہ نہیں تھا اور ہرگز بھی نہیں تھا۔ اس نیل بر بے خبر کو بھلا کیا خبر؟ سرکاری بنگلے تک جانا، پل صراط پہ چلنے کے مترادف تھا تو کیا اسے جہاندار نے روکا نہیں تھا؟ اور وہ رکی نہیں، تھمی نہیں، مانی نہیں، ضد کی، کیا سرکش کی تاسر دار بہو کی جواولاد تھی وہ تو باپ سے مختلف کیسے ہوتی؟

حت کو لگا، یہ لوگ اس معمولی جرم کے بدلے میں نیل بر کو انار کلی کی طرح دیوار میں چنوا دیں گے، یا پھر دوعا کی طرح زمین میں گاڑ دیں گے اور دوعا وہ تھی جسے مصلوب کر دیا گیا تھا اور دوعا وہ تھی جسے محبت کی راہ میں چلنے کے جرم میں سولی پہ چڑھا دیا گیا تھا اور دوعا وہ تھی جس کا ذکر اس گھر میں حرام تھا، مردار جانور کی طرح حرام، اسی طرح نیل بر کا ذکر بھی اس گھر میں حرام ہو جاتا، مردار جانور کی طرح حق حرام ہو را ایسا ممکن تھا، بالکل ممکن تھا، ایسا ہونے والا تھا اور بالکل ہونے والا تھا۔

دوعا کی کہانی اس گھر میں پھر سے دہرائی جانی تھی اور بدقسمتی گھوم پھر کر ایک مرتبہ اور اس گھر میں ضرور آئی تھی، کیونکہ تاریخ خود کو دہراتی ہے اور تقدیر ہر سرکشوں کے متکبر چہروں پہ طمانچے مارنے ضرور آتی ہے۔

”تجھے دوعا کا انجام معلوم نہیں؟ تجھے دوعا کے انجام سے باخبر کیا گیا نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس گھر کی بیٹیوں کو لوگین کی عمر میں چھوڑتے دوعا کی کہانی نہیں سنائی جاتی؟ بول؟ جواب دے؟ بولتی کیوں نہیں؟“ وہ کسی وحشی شیر کی طرح غرا رہا تھا اور نیل بر کا سارا اعتماد ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا؟ پھر یہ سب کیوں ہوا؟ اس کی کیا غلطی کیا تھی؟ کیا امام فریحے کو دل میں بسانا؟ اسے آنکھوں میں بسانا؟ اسے راتوں کو جاگ جاگ کر سوچنا؟ تو کیا یہ گناہ تھا؟ اگر گناہ تھا تو صندیر خان کے سر خون نہیں آ رہا تھا پھر اسے کیا بالکل پن کا دورہ پڑا ہوا تھا؟ نیل بر حیران تھی، پریشان تھی، متوحش تھی۔

ابھی تو اس نے اپنے دل کو ٹٹولا ہی نہیں تھا، ابھی تو اپنے جذبوں کی گہرائی ناپی ہی نہیں تھی، ابھی تو سنہری کرنوں سے خوابوں کو آنکھوں میں سجایا نہیں تھا اور یہ قیامت کی گھڑی آ گئی، اس کی جان کانپ رہی تھی، جسم کانپ رہا تھا، روح کانپ رہی تھی۔

جبکہ صندیر خان پوری قوت سے چلا رہا تھا، باقی سب اسے خاموش اور ساکت تھے جیسے ہال میں موجود ہی نہ ہوں، یا ان کی زبانیں مفلوج ہوں، یا بولنے کے لیے الفاظ ختم ہو چکے ہوں۔

نیل بر نے اپنے باپ کی طرف نگاہ کی، شاید وہ صندیر خان کے عذاب سے اسے بچا لیتے، لیکن اس کے باپ نے غصے کی انتہا پہ نگاہیں پھیر لی تھیں، نیل بر کو پہلا دھچکا تب لگا تھا اور دوسرا دھچکا تب لگا جب صندیر خان حت کے سر پہ کھڑا ہو گیا۔

”بول حت ذیشان اے دوعا کون تھی؟“ صندیر خان نے حت کو جھنجوڑ ڈالا تھا، نیل بر کے جسم میں پھریری دوڑ گئی تھی، وہ حت کو صندیر خان کے عذاب سے بچانا چاہتی تھی، لیکن اس کا جسم خوف سے مفلوج ہو رہا تھا، پاکستان آنے کے بعد پہلی مرتبہ یہ کیفیات اور ایسی صورت حال سے سامنا پڑا

تھا نیل بر کے لیے سیاست خیز گھڑیاں تھیں، ناقابلِ برداشت، انتہائی بھیانک۔

اور وہ ابھی صبت منڈھو میں آ رہائی حملہ آوروں جیسی دھول اڑا رہا تھا جب حت کی کپکپاتی کمزور بے بس اور نم ناک آواز سنائی دی تھی، یوں کہ نیل بر نے جہاندار کا چہرہ آگ کی طرح تپتا محسوس کیا تھا اور اپنے باپ کا چہرہ نفرت سے سیاہ پڑتا۔

”دوعا میری بہن تھی۔“ حت کی آواز میں بہال کی دشمنوں کا درد گزار رہا تھا اور وہ آنکھیں موندے ننگی تلوار پہ چل رہی تھی۔

جہاندار نے بے ساختہ آنکھیں موند لی تھیں اور اس کے چہرے پہ صحراؤں کی ریت اڑ رہی تھی، اس نے جنگلوں کے اس پار دیکھا، پربت کی وادیوں کے اس پار سے، پہاڑوں کی نوک سے، پہاڑوں کی نوک سے، پہاڑوں کی اونچائیوں اور برف سے سفید کلس کے پیچھے سے صبت منڈھو میں آ رہائی حملہ آوروں کی دھول اڑ رہی تھی اور یہ ان کے قدموں کی دھول نہیں تھی، بلکہ اس عجیب و غریب، نادیدہ، تیز رفتار جانور کے سموں سے اٹھتی دھول تھی، جس پہ وہ سوار تھے اور اس کی بستیوں، زمینوں، کھیتوں اور ان کی ہریالی کو روندتے چلے آ رہے تھے، ویرانی اور خشکی کے باشندے صحرا کی سرزمین پہ بستے آ رہے تھے اور ان کی نگاہیں ایک ایسے جانور کے پیٹ کے گرد کسی ہوئی تھیں جو اس نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنے خوبصورت بیلوں اور ست رفتار بھینسوں کے ساتھ ان کے مقابلے پہ آ تو گیا تھا، لیکن ان بلاؤں کا کیا کرتا، جن پہ سوار ہو کر وہ اوجھل ہو جاتے تھے، نظر آتے تھے پھر اوجھل ہو جاتے تھے۔

اس تیز رفتار جانور کا جسم پسینے سے لشکتا تھا، اس لمبے منہ اور بالوں والی گردن کے جو پائے میں ایک وحشی تکبر تھا، جو زمین پہ اترا کر چلتا تھا، زمین پر ریت کی، ریت کے اوپر وہ تھا اور اس کے اوپر طاقت ور نوجوان۔

گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کی سطح پہ ریت جمی تھی اور گھوڑا اس پہ دوڑ رہا تھا، گراؤنڈ کے اس پار سفید محرابوں والی اونچی عمارت تھی، جس کی بالکونی میں جہاندار کھڑا تھا اور وہ لشکتے جسم لمبے منہ اور بالوں والی گردن، خوبصورت مایوں والے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا، جس کا سوار یونانی نقوش کے عکس جیسا تھا، جس کی آنکھوں میں گلگت کا ورثہ بستا تھا، جو بتاتا تھا پربت کی پہاڑی جیسا سخت، مستحکم، دلیر، تنومند اور مضبوط تھا، جس کے خواب بہت بلند تھے، جس کے حوصلے اور خیالات بہت بلند تھے۔

سفید جانور کی جلد فراقرم کی سیاہیوں کے اوپر پہلے چمکنے اور اب ماند پڑتے زرد سورج کی کرنوں میں رنگ بدلتی تھی اور اب اسی رنگ میں ڈھلی تھی جو گلگت سے پرے ننگی چٹانوں کے اوپر جما گئی ایک برف پوش چوٹی کا تھا۔

ہوا میں سرد ہے تھے، شام ہو رہی تھی اور پولو میچ جاری تھا، ان گھوڑوں کو یوں اپنے حملہ آور ہونے دیکھ کر ایک قدیم خوف اس کے اندر انگڑائی لے کر جاگا تھا، کیا سفید گھڑ سوار ہار جائے گا؟

ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، بالکونی میں کھڑا کم عمر لڑکا چلا رہا تھا۔

”فرخزاد کبھی نہیں ہارے، فرخزاد کبھی نہیں ہارے“ اس کم عمر لڑکے کی آواز ابھی تک جہاندار کے کانوں میں گونجتی تھی اور اس کا سانس گھٹ گھٹ کر فنا ہونے لگتا تھا، جی چاہتا پولو گراؤنڈ کے شروع

میں ہی اس سفید محرابوں والی عمارت کی بالکونی میں کھڑا ہو کر چلا چلا کر کہے۔

"فرخزاد ہار گیا، فرخزاد ہار گیا۔" لیکن اس کے الفاظ اس کی سانس ہی کے دم کی طرح اندر ہی گھٹ گئے تھے اور سامنیں حمت کی کمزور بے بس اور نم ناک آواز گونج رہی تھیں۔

"زرحا میری بہن تھی۔" اس کی آواز نوحوں کی مانند ہال میں چکرائی تھی اور زادور کے بازار سے بین کی آواز آئی تھی، کوئی ہیال کی بستی میں بانسری کی دھن پہ موت کا گیت گا رہا تھا اور کوئی گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کے پچھواڑے سے سفید محرابوں والے گھر کی بالکونی میں کھڑا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

"اور زرحا کہاں ہے؟" صندیر خان حلق کے بل چلایا تھا، یوں کہ نیل بر نے مارے خوف کے اپنے بند ہوتے دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا، جبکہ حمت نے آنکھیں موند کر کسی کنویں میں چھلانگ لگاتے ہوئے وہی سرسرائی نم ناک آواز میں بتایا تھا۔

"زرحا زمین کے نیچے ہے۔" حمت کی آواز میں شام اتر آئی تھی اور شام نے اداسی کی جا بجا چھبن رکھی تھیں۔

"اور اسے زمین میں کیوں اتارا گیا؟" سوالوں نے تلواریں پکڑ لی تھیں اور ہر تلوار کا وار حمت کے وجود کو زخم زخم کر رہا تھا۔

"اس نے جرم محبت کا اعتراف کیا تھا۔" حمت کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"اس گناہ کی اسے کیا سزا ملی؟" کوئی اس کے کان پاس چنگھاڑا تھا، حمت نے آنسوؤں کے سیلاب کو اندر دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

"زندگی کی قید سے آزادی۔" اس کی آواز بہت بڑی تھی اور وہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، جہاندار نے اسے زخمی نگاہ سے دیکھا اور رخ پھیر لیا تھا، وہ صندیر خان کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"تو اپنی اس محبت کو بتاؤ حمت، ہمارے ہاں جرم محبت کی سزا سولی ہے، پھانسی ہے اور بھیانک موت ہے، اس کو سمجھاؤ، اپنے قدموں کو سرکاری بنگلے کی طرف جانے سے روک لے اگر روک نہیں سکتی تو بتا دے، ہمیں قدم کاٹنے بھی آتے ہیں، سر قلم کرنے بھی آتے ہیں، زمین سے باہر نکالنا بھی آتا ہے، زمین کے اندر اتارنا بھی آتا ہے۔" زرد آنکھوں کی رشتوں کو اگلتا ابھی تک دھاڑ رہا تھا اور حمت ہیال کی خاموش رات کے بھید کی طرح ساکت اور خاموش تھی، لیکن اس کا رواں رواں اقرار کر رہا تھا۔

وہ ایک قیامت سے گزری تھی، نیل بر ایک قیامت سے گزر رہی تھی، طوفان آیا تھا، لیکن چپکے سے گزر نہیں گیا تھا، بلکہ سردار بنو کے محل میں ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا تھا، سکوت اختیار کر گیا تھا، رک گیا تھا۔

صندیر خان شعلے اگل کر پرسکون اب بھی نہیں ہوا تھا، اس کا سکون نیل بر نے اڑا دیا تھا، اس کا سکون نیل بر نے تہہ و بالا کر دیا تھا اور اس کا سکون جو کبھی کی نہ ختم ہونے والی دھوپ گاہوں کی وحشت زدہ دیواروں اور خانقاہوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا، وہ اپنا سکون کہاں سے تلاشتا؟ اس کا سکون تو سردار

بنو کی خود سر اولاد اپنے دل کے بدلے بیچ رہی تھی اور مجرم کسے ٹھہراتا؟ خان سردار بنو کو جو اس کے خاندان کی فرسودہ روایتوں کو مسمار کرنے اور بنیادیں ہلانے کا عزم کر چکی تھی؟ اور پربت کے اس پار ایک قیامت کھڑی تھی۔

جہاندار نے طویل اور گہرا سانس خارج کر کے خود کو بہت پرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا، اس کی آنکھیں دور بہت دور گلگت کی سرسبز وادی کے ہرے بھرے عکس سے جگمگا رہی تھیں اور پرانی پولو گراؤنڈ کا پچھلا حصہ اور سفید محرابوں والی بالکونی میں کھڑا نو عمر سا لڑکا، وہ مشکی گھڑ سوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور محبت کو زوال نہیں، موت بھی ہار نہیں، زندگی برباد نہیں اور فرخزاد کے لئے کوئی ہار نہیں کوئی ہار نہیں۔" اس کی آنکھوں کے پار پربت کے شہزادے کو دیکھا تھا، فرخزاد کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں دلفریبی سے گونج رہی تھی، حالانکہ وہ پولو کے میدان سے جا رہا تھا اور جہاندار کی زندگی سے جا رہا تھا، لیکن وقت ایک مرتبہ پھر زرحا اور فرخزاد کو ان کی زندگیوں میں واپس لا رہا تھا۔

جہاندار نے آسمان کو بدلتے دیکھا، سورج کو مغرب میں ڈھلتے دیکھا، اس نے اللہ کے انصاف کو اترتے دیکھا، دور آسمانوں سے، جگنوؤں روشن راتوں سے، سنہری چراغ خانوں سے۔

☆☆☆

قیامت ٹھہر گئی تھی، گزری نہیں تھی، رک گئی تھی، ٹلی نہیں تھی، جم گئی تھی، کیونکہ اسے ٹھہرنا ہی تھا، بنو محل میں قیام کرنا ہی تھا، دوسروں کی زندگی کو اذیت ناک ہوتے دیکھ یہ متکبر لوگ کیوں بھول گئے تھے کہ ایک دن وہ بھی قیامت سے انہیں بھی گزرنا ہی ہوگا۔

ہال میں ابھی تک کورٹ سجا تھا، ایک عدالت قائم تھی، جس کا جج اور جیوری ابھی تک صحرا کا سورج بن کر تپش فشاں بن کر آگ اگل رہے تھے۔

وہاں ایک کونے میں جھکے سے آئی سیاہ خانہ کھڑی تھی، ایک اطالوی تخت پہ بی جاناں بوڑھے جلال سے فروکش تھیں اور گہری نفرت بھری نگاہوں سے نیل بر اور حمت کو گھور رہی تھیں۔

وہیں ہال میں تخت کی دیوار سے ٹیک لگا کر جہاندار کھڑا تھا اور اس قیامت کو کروٹ بدلتے دیکھ رہا تھا، ان سب میں سب ایک وہی تھا، بالکل پرسکون۔

بالکل سامنے ہی حویلی ستون سے لگ کر کھڑے سرجار بہتر جو ٹھہر بن کر اپنی نظر کو گھور رہا تھا، جبکہ صندیر خان ناگا پربت کے جلال کی مانند بپھرا ہوا تھا، سب ہی سردار بنو کی کیفیات بھی مختلف تھیں، غیرت اور حمیت کے معاملے میں وہ اپنے بڑوں سے کسی طور بھی کم نہیں تھا۔

ایک البیلی سی لڑکی کی انگلی پکڑ کر چلتے ننھی سی گم سم بچی، جس کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی، جسے اٹھا کر وہ نیچے بستی میں اتر رہی تھی، سنہرے خوابوں کی بستی میں، نیلی آرزوؤں کی بستی میں، ارغوانی تمناؤں کی بستی میں، اور سرمئی خواہشوں کی بستی میں، حمت کی کیفیت سے قطعاً مختلف نیل بر کی کیفیات تھیں، وہ ایک مثال میں ڈال دینے والی لجائی لجائی کیفیت اور اداسی سے نکل چکی تھی۔

اب وہ ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی اور ایک ایک بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی، جب

جیسے جیسے اسے اس عدالت کے سجنے کا مقصد و مطلب سمجھ آرہا تھا ویسے ویسے اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا پھر ایک مقام پر اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔

تو گویا جہاندار ہی اس عدالت کے سجانے کا اصل موجب تھا، یعنی جہاندار نے اپنی اداکاری دکھاری کی وہ اتنا باخبر ضرور تھا جو نیل بر کے اندر اتری مخملی مخملی سنہری تبدیلیوں کو کھوج لیتا، اس نے نیل بر کے دل کا راز پالیا تھا وہ اس کی نگرانی پر تو ازل سے مامور تھا اسے خبر تھی نیل بر کی وہ بین کے بارے میں، وہ جانتا تھا نیل بر مڑ مڑ کر سرکاری بنگلے میں کیوں جارہی تھی؟

اور جب وہ نیل بر کا راز پا گیا تو اس نے ہوتخل کے فرماں رواؤں کو باخبر کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا، گویا اس نے اپنی فرمانبرداری کا پورا ثبوت پیش کردیا تھا، گویا اس نے اپنی وفاداری پہ مہر ثبت کردی تھی۔

وہ ہوتخل کا اصل نگہبان و پاسبان اور دربان تھا ہوتخل کی اونچی عمارت کے کلس سے گی تجائی ان کی عزت اور دستار کا محافظ ہو کر یا وہ سردار ہوتے سے لے کر لی جاناں کا آج کے بعد سے منظور نظر تھا۔

یعنی جہاندار کی چھپا کام آگئی تھی وہ ان کا اعتبار اور اعتماد جیتنے میں کامیاب ہوگیا تھا، لیکن اس سارے عمل میں اس نے نیل بر کے اعتبار کو بری طرح سے کھو دیا تھا، جس کی اسے پرواہ نہیں تھی اور جس چیز کی اسے پرواہ تھی وہ فی الوقت جہاندار کو حاصل تھی۔

نیل بر اسے نفرت اور زہر بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور جہاندار اس نگاہ سے تنہا بے نیاز تھا، گویا اسے نیل بر کی بیزاری اور نفرت کی کوئی پرواہ نہیں تھی وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ چنے کی ریوڑی کے بار بار کا بار بار ریکوڈ رہا تھا، جس سے بہت آگے بہت دور، بھسوکونز کی نکونی چٹانیں تھیں، اپنی ساخت کے لحاظ سے بے حد عجیب اور حیرت انگیز، ایسی غیر حقیقی نوک دار پہاڑیاں جو پوری دنیا میں کہیں نہیں تھیں بلکہ یہ ایک جہان کی لینڈ اسکیپ تھی اور اس پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی، وہ نیچے رو رہا بہتا تھا جس پر دھوپ کم ہوتی جارہی تھی، کیونکہ سورج ڈھل رہا تھا جیسے نیل بر کے نام کا سورج ڈھل رہا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھسوکونز کی متعدد نوک دار چوٹیوں پہ دھوپ اس طرح سے تھی جیسے انہوں نے سورج کی روشنی میں سے ایک ایک خوشہ لیا اور سہدی ہوگئیں، انہیں ناٹ رون بھی کہا جاتا تھا، یعنی جن چٹانوں پر سورج کی آخری شعاعیں پڑتی تھیں۔

اور یہ منظر نیل بر کی نگاہ کا زہر دیکھنے سے کئی درجے بہتر تھا وہ ان بھسوکونز کو دیکھتے بے شمار مرتبہ اس کے ساتھ آیا تھا، اس کے سپید مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر وہ روبیت کا منتظر تھا جو جھک جھک کر اس کے سنہرے گالوں کو چومتا وہ ہوتخل کے اونچے کلس کی طرف اشارہ کرتا تھا اور اس کے لہجے میں ہنزہ کے بہتے دریاؤں کی روانی ہوتی تھی۔

"جہانی او جہانی!" وہ اس کے سنہرے گال کھینچتا شوخ پریوں سی ہواؤں کے ہاتھ پیغام عشق بھیجتا تھا۔

"محبت دل کا سجدہ ہے۔" وہ اسے گدگداتا، ہنساتا اور ہوتخل کے سنہرے کلس کی روشنی اس کی گہری فسوں خیز آنکھوں میں بھر جاتی تھی۔

وہ ہوتخل کا منتظر ضرور تھا، لیکن پربتوں کا باسی نہیں تھا وہ پربتوں کا عادی نہیں تھا، اس لیے پربتوں نے اسے بھانپ لیا تھا، نگل لیا تھا۔

جہاندار کی آنکھوں میں صحراؤں کی ریت بھر رہی تھی وہ فرزانہ کے خیالوں سے پیچھا چھڑا کر واپس اس منظر میں لوٹ آیا تھا وہ منظر جو آنکھوں میں سکون کی شعاعوں کو کوٹ کوٹ کے بھر دیتا، جہاندار اسی منظر میں زندہ رہنا چاہتا تھا اسی منظر میں سانس لینا چاہتا تھا وہ نیل بر کی نفرت انگیز نظروں کو دیکھنا چاہتا تھا اور نیل بر کی کیفیات اس پل کیا تھیں؟ اسے اپنے اس گھر سے، اپنے ان رشتوں سے حتیٰ کہ اپنے باپ سے نفرت ہورہی تھی جو اس قدر تنگ دل و تنگ نظر تھا۔

اگر وہ اس قدر تنگ ذہن تھا؟ تو ایک آزاد خیال زرمگین سے شادی کیوں کی؟ اگر شادی کرلی تھی تو اس آزاد خیال عورت کے بطن سے اولاد کیوں پیدا کی؟ کیا خبر سردار ہوتخل جانتا نہیں تھا وہ اپنی ماں کی طرح آزاد خیال ہوسکتی تھی؟ وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتی تھی اور اپنے سردار باپ، غیرت مند تایازاد بھائیوں کے سامنے اپنی پسند کا اس قدر بے دھڑک کے ساتھ اعتراف کرسکتی تھی؟ اس بات سے ہوتخل کا کوئی فرد بھی واقف نہیں تھا۔

اگر واقف تھا تو جہاندار، اسے خبر تھی، نیل بر اب کیا کرنے والی تھی؟ نیل بر کے ارادے کیا تھے؟ اور وہ کون سا اسم پھونک کر ان سب کو پتھر بنانے کے لیے کل رہی تھی، جہاندار نے ایک گہرا طویل سانس لے کر اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ رہا تھا، اب ضد، انا اور ہٹ دھرمی کی جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔

نیل بر کی انا کو جیسے جھنجھلائی گئی تھی، اسے بھری محفل میں ذلیل کیا گیا تھا اور اس کی ذات پہ انگلی اٹھائی گئی تھی، یوں اسے بے جرم رسوا کیا گیا تھا اور یہ جرم معمولی نہیں تھا۔

جہاندار نہیں جانتا تھا نیل بر کے منہ زور جذبوں کی گہرائی کہاں تک تھی؟ اور وہ سرکاری ڈپٹی سرویئر جنرل کی محبت میں کس حد تک آگے جا چکی تھی؟ وہ اس بات سے واقف نہیں تھا لیکن اسے اتنی خبر ضرور تھی کہ محبت چاہے منہ زور ہو یا نہیں، لیکن اس وقت نیل بر کا غصہ توہین اور انا بہت منہ زور ہو رہی تھی اور اس نے پوری عدالت، جیوری، جج اور فیصلے کا لب لباب سمجھ لیا تھا جس کے تناظر میں اس پہ سخت قسم کی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔

وہ گھر سے نہیں نکل سکتی تھی وہ آج کے بعد گھر میں قید تھی، اسے ڈپٹی سرویئر جنرل کا نام تک بھول جانے کا حکم ملا تھا، ان رستوں کی طرف دیکھنا تو کجا سوچنے تک کی بھی اجازت نہیں تھی اور یہ لوگ کون ہوتے تھے نیل بر خان پر الزام لگانے والے، حکم چلانے والے اور پابند سلاسل کرنے والے؟ آخر یہ لوگ ہوتے کون تھے؟ کون؟ آخر کون؟ اس نے آگ اگلتی شعلہ فشاں نگاہوں سے ایک ایک چہرے کو گھورا اور نفرت سے چلا کر بولی تھی۔

"میں نیل بر کبیر خان ہوں، کرسٹان کی بیٹی، مجھ پہ تم لوگوں کی دقیانوسی اقدار اور پابندیوں کے حکم لاگو نہیں ہوتے، میں آزاد ملک کی آزاد پیدا ہوئی ہوں، میں اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوں، آزاد ہوں، تم میں سے کون ہے جو مجھے روک سکے، پابند کرسکے اور مجھ پہ اپنا حکم مسلط کرسکے؟ کون ہے آخر؟" اس کی آواز میں پربتوں کا جلال عود آیا تھا اور ہال کمرے میں موت کا سناٹا تیرنے

لگا، ہر کوئی دنگ ہوا، حیران ہوا، ششدر ہوا، گنگ ہوا۔
پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہنوکل کے سرداروں کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں، چہرے انگارے بنے اور نفرت و غصے کی انتہا پر جتوں کی بلندیوں سے کہیں بڑھ گئی۔

"بابا خان! سن لیں، آپ باپ جیسے میرے، مجھے آپ کو بتانا ہے اور آپ تک اپنی خواہش کو پہنچانا ہے، میں اسی ڈپٹی سرونٹر کو اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں، سنا آپ نے، کوئی روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو روک کر دکھائے؟" اس نے چیلنج بھری نگاہوں سے ایک ایک فرد کا غیرت سے سرخ اور سیاہ پڑتا چہرہ دیکھا تھا، انگارہ ہوتا چہرہ دیکھا تھا اور لبی جاناں نے جیسے اپنا دل تھام لیا تھا۔

"ایسی بے حیائی؟ ایسی بے حسی؟ ایسی بے شرمی؟ ایسی دیدہ دلیری؟" ہر آنکھ تھرا رہی تھی اور ہر دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔

ایک وہی تو تھا، پرسکون، پر یقین، جیسے اسے یقین تھا یہ سب تو ہونا ہی تھا، ابھی نہ ہوتا تو ایک دو بار بعد ہو جاتا، ہونی کو کون ٹال سکتا تھا؟ وہ ایک پل چہرے کو پڑھتا ہوا اسی پرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا اور نیل بر کے الفاظ جہاندار کی مجبوری بکس میں جمع ہو رہے تھے۔

"بابا خان! سن لیں، مجھے آپ کو ہی بتانا ہے، آپ تک اپنی تمنا کو پہنچانا ہے، میں اس ڈپٹی سرونٹر کو اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں، سنا آپ نے، کوئی روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو روک کر دکھائے؟" نیل بر چبا چبا کر اپنے الفاظ دہرا رہی تھی اور جہاندار اس کی بہادری اور جواں مردی پر قطعاً حیران نہیں تھا، کیا کمال کا جگر پایا تھا؟ کیا کمال کا انداز پایا تھا؟ کیا کمال کا دل پایا تھا۔

"میں اپنا دل دے آئی ہوں، میں اس سے محبت کر آئی ہوں۔" جہاندار اس کے لفظ لفظ کو تول رہا تھا، ترازو کے پلڑوں میں؟ ان میں سے کون سا لفظ زیادہ بھاری تھا؟ کس جملے میں زیادہ وزن تھا؟ کیسی شان بے نیازی تھی؟ گویا دل نہیں، کوئی عام سی معمولی سی دو ٹکے کی چیز لٹا آئی تھی اور جیسے محبت نہیں، کوئی بیوپار کر آئی تھی، کیا کمال کا شاہانہ انداز تھا، قابل تعریف، قابل توصیف؟ قابل توجہ، جہاندار کی ستائش بھری آنکھوں میں چمک اتر رہی تھی۔

"ہوں، تو سردار ہنو کی نور نظر کو اتنا ہی دلیر ہونا چاہیے۔" اس نے دل ہی دل میں اس کا شانہ تھپک کر داد بھی پہنچائی تھی۔

جبکہ پورے ہال میں ایک خوفناک سناٹا دریا کی لہر اور یہاں بکھری ہوئی لہروں کی مانند شور مچاتا تھا، ہنوکل کے سرداروں کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور ضبط کے آخری کناروں پر کھڑے پکار رہے تھے۔

"بدبخت خاموش ہو جا، تجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں؟ مجھے تیری جان کی پرواہ ہے، تیری جان میں میری جان ہے نیل بر، میری نگاہ سے دور ہو جا، دفع ہو جا، اپنی شکل گم کر لے اور ہزار مرتبہ استغفار پڑھ کے میرے سامنے آ، تیرے خون سے میں اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔" وہ بوڑھا شیر اپنی کچھار میں غرا رہا تھا، پھنکار رہا تھا، دھاڑ رہا تھا، جہاندار کی آنکھوں میں مصنوعی تاسف بھر گیا تھا۔

"... یہ وقت بھی آنا تھا سردار؟" اس کا مصنوعی تاسف افسوس میں بدلتا جا رہا تھا، پھر جہاندار نے مجمعے کو چھٹتے دیکھا، صندیر خان کو جاتے جاتے بھی گرجتے دیکھا۔

"آپ کے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت ہے سردار خان ہنو! اس بے حیا کا ٹھکانہ کر لیں ورنہ اسے آپ نہیں، میں زمین کے اندر گاڑ دوں گا، یہ کون ہوتی ہے، ہماری غیرت کو سرکار کے اس پسماندہ بنگلے کی چار دیواری میں رولنے والی۔" وہ ضبط کا آخری زہر بھرا گھونٹ بھرتا باہر نکل گیا تھا، اس کے پیچھے سنا ہوا سب جاتا گیا، تن تن کرتی نیل بر بھی پاؤں پٹختی نکل گئی، لبی جاناں اور وسیا خانم بھی اس کے پیچھے، سردار ہنو اور جہاندار اکیلے رہ گئے تھے، اپنی اپنی سوچوں میں گم اور وہ جو جہاندار تھا، وہی جہاندار جس کی آنکھوں میں فرخ زاد بسا تھا اور وہی سردار ہنو جس کی آنکھوں میں نیل بر کا پیار بسا تھا، جہاندار سوچ رہا تھا سردار ہنو کس طرح سے اپنی روایات سے ٹکرا کر جان عزیز بیٹی کے خوابوں کا محل کھڑا کرے گا؟

اور سردار ہنو سوچ رہا تھا، وہ کس طرح سے نیل بر کی خود سری، ضد، ہٹ دھرمی اور منہ زور جذبوں کی چٹانوں کو پاش پاش کرے گا؟ اس کا حل کیا تھا؟ ایک ہفتے بعد کیا ہونے والا تھا؟

صندیر خان اسے حکم دے کر چلا گیا تھا اور ایک ہفتے بعد اسے اپنا حکم سنانا تھا اور اس کے بعد کیا ہونا تھا؟ سردار ہنو کی ذات اور شخصیت کی عمارت میں زلزلہ آ گیا، انہوں نے ہاتھ بڑھا کر جہاندار کا سہارا لیا، جہاندار نے ان کو آگے بڑھ کر سہارا دیا تھا تو اب معتمد خاص سے مشورہ طلب کرتا تھا، اس نے گہرا سانس بھر کے اعصاب قابو رکھے اور پرسکون کر لیے تھے۔

"جہاندار جاناں!" اس طرز تخاطب پہ جہاندار کے دل میں تیر سے اتر گئے تھے، اسے کوئی بڑی شدت سے یاد آیا تھا۔

"حاضر خاناں۔" اس نے خان کا ہاتھ تھام لیا، تب اس پہ انکشاف ہوا، پر جتوں کا یہ سردار بری طرح سے کانپ رہا تھا، بری طرح سے ہانپ رہا تھا، کیا غصے سے؟ کیا ذلت کے احساس سے؟ کیا نفرت کے احساس سے؟ کیا خوف کے احساس سے؟ جہاندار سب سمجھ گیا، اسے سب سمجھ آتا تھا، پر جتوں کے اس بے رحم سردار کو خوف کا احساس کانپنے پہ مجبور کر رہا تھا، نیل بر کی دیدہ دلیری کے بعد سنائے جانے والے فیصلے کی انتہا کا خوف؟

"جہاندار جاناں! اس کو سمجھاؤ، موت کو آواز مت دے، اس کو روکو ورنہ صندیر خان اپنے انداز میں ہمیشہ کے لیے روک دے گا، وہ اعتراف گناہ کر گئی ہے، اس نا سمجھ کو اس گناہ کی سزا کا علم ہی نہیں۔" بوڑھا سردار خوف اور صدمے کے زیر اثر کراہ رہا تھا، اس کی غیرت پہ جیسے تازیانے لگے تھے، کوئی بوڑھے سردار کا دل کھول کر دیکھتا تو کانپ جاتا۔

"اعتراف محبت کا گناہ؟" جہاندار نے جیسے چیخ کی تھی، بوڑھے سردار کی آنکھوں میں لہو کھول اٹھا تھا اور ماتھے کی رگیں پھڑکنے لگیں۔

"اس کو سمجھا دو، اس گناہ کی میرے علاقے میں، میرے خاندان میں، میرے قبیلے میں کیا سزا ہے، اس کو بتا دو، وہ انگاروں پہ نہ چلے، وہ دعا گمنام نہ بنے، اس کو باؤلے پن میں پڑنے سے روک لو۔" اس کا وجود ابھی تک کانپ رہا تھا۔

"اس جرم کی سزا؟" جہاندار نے سمجھ کر جیسے سر ہلا دیا تھا۔

"آہ، سزا ہے موت ہے۔" وہ سر ہلاتا جا رہا تھا اور دیکھتا جا رہا تھا، یعنی دولہا کی قبر کے سرہانے ایک اور قبر بننے کی تیاری ہے جس پہ کبھی عمر بھر کے لیے نہ کوئی چراغ جلے گا، نہ کوئی فاتحہ پڑھے گا، نہ کوئی ذی روح اس طرف جانے کی جرأت کرے گا، تنہا دو قبروں کے ساتھ ایک اور قبر کا اضافہ ہو جائے گا، روایات کے باغی، منہ زور جذبوں کے نبدی، محبتوں کے مجرموں کی سربراہ نیر خان ہنو کے علاقے اور قبیلے میں یہی سزا رائج تھی، قرنوں سے، صدیوں سے، سالوں سے، نسلوں سے یہی معمول ہے۔

☆☆☆

نشرہ کے لیے بھبو کی کال اچنبھے کا باعث تھی۔

وہ جب سے گئی تھیں دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا، بلکہ دوسرے معنوں میں نشرہ کے وجود کی بھرپور نفی کی تھی، یہ نہیں تھا کہ وہ بیچ یا اور بھی کال نہیں کرتی تھیں، ان کی فون پہ بات ضرور ہوتی تھی پر اور بات کی کہ نشرہ کو فون پہ بلانا اپنی توہین سمجھتی تھیں۔

پہلے تو نہیں، البتہ نشرہ کو اب اندازہ ہو رہا تھا، بھبو نے ولید کی ضد کے سامنے صرف سر جھکایا تھا، اپنا دل ہرگز نہیں جھکایا تھا، دل تو ان کا جتنی میں اٹکا ہوا تھا، کیونکہ جب بھی ان کی کال آتی، بطور خاص بیٹی کو بلا کر بات کرتی تھیں، تب نشرہ کے دل پہ کیا گزرتی؟ اس سے کوئی واقف نہیں تھا اور آج نجانے کیا ہوا تھا، بھبو نے اسے فون پہ بلا لیا، نشرہ کے لیے حیرانی ہی حیرانی تھی، فون پہ نارمل سا احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے ایک جا تحکم نامہ سنایا تھا۔

"تم برتن مانجھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لو، یہاں مجھے سبزی کی ضرورت نہیں ہے، سب ٹھیک طریقے سے ہو جاتے ہیں، میرے اپنے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، تم کسی انسٹی ٹیوٹ کو جوائن کرو، کوئی انگلش اسپوکن کورس کرو، خود کو بدلو، یہاں جا لوگوں میں تمہارا تعارف کرواؤں تو شرم سار کی نہ ہو، کمال ہے، آج کل کی لڑکیوں والی بات ہی کوئی نہیں، یہ بات تو ولید بھی کہہ رہا تھا، نشرہ خاصی بیک ورڈ ہے، کم از کم سوسائٹی میں موو کرنا تو سیکھو، بیٹی کو دیکھ کر بھی تمہارا دل خود میں چینج لانے کو نہیں مچلتا؟" بھبو کی آدھے گھنٹے کی تقریر نے نشرہ کو خوش تو کیا اور بھی غمگین کر دیا تھا، اس کے دل کو بڑا ہی زور دار دھچکا لگا۔

"تو کیا ولید نے بھی کہا، میں بیک ورڈ ہوں، صدیوں پرانی، بوسیدہ اور آج کے دور میں فٹ طور پہ کیا فٹ؟" نشرہ کے دل سے یہ پھانس نکل نہیں سکی تھی، اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا، پھر اس نے خود کو تسلی دے لی تھی، کیا خبر بھبو نے خود سے جان بوجھ کر کہا ہو، بھلا ولید ایسی بات کر سکتا تھا؟ اس سوچ نے دل کو ڈھارس بندھا دی تھی۔

لیکن برا ہوا اس کے نصیب کا، اگلے دن بعد بالآخر ولید کو بھی نشرہ کا خیال آ گیا تھا، رات کو ولید کی بھی کال آ گئی، پہلے تو اس نے اپنی مصروفیت کی کہانی سنائی، چلو ٹھیک تھا، وہ مصروف ہی ہو گا، نشرہ نے کون سا شکوہ کیا تھا؟ مگر بعد میں اس نے بھی ابی کی والی کہانی شروع کر دی تھی۔

"نشرہ! تمہیں ایک بات کہوں؟ پلیز برا تو نہیں مانو گی؟" ولید نے انوکھی نرم انداز میں گفتگو

فلک ارم ذاکر

"خلیل جبران کہتا ہے "تم جس سے محبت کرتے ہو اسے آزاد چھوڑ دو اگر وہ تمہارا ہے تو تمہارے پاس لوٹ کر آئے گا۔"

اور پروین شاکر نے اس بات کا ذکر یوں کیا ہے۔

"کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس ایک بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی"

نجانے کب کے پڑھے ہوئے اقوال اور شعر آنیہ کو یاد آئے اور ساتھ ہی ان سے جڑے اختلاف کے پہلو "بقول آنیہ جو ہمارا ہے اسے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں وہ ہمیشہ ہمارا ہی رہے گا اور جو چھوڑ کر چلا جائے وہ گویا کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔" اب اپنے ہی کہے لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

"لیکن ارحم آپ تو میرے تھے آپ نے کیسے راہ بدل لی کیوں کیا ارحم کیوں کیا آپ نے ایسے۔" آنیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

رات گہری اور خاموش تھی صحن میں بچھی چارپائیوں پہ سب نفوس نیند کی آغوش میں سمائے دنیا سے بے خبر تھے ایک آنیہ ہی تھی جو گزشتہ چھ ماہ سے ہر رات جلی بھنی انگاروں پہ لوٹتے، کروٹ بدلتے اور روتے ہوئے گزار رہی، اس کے لئے تو یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ اس کا ارحم کسی اور کے ساتھ..... اس کے آگے تو سوچ کر ہی دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

آٹھ سالہ عزل کے رونے کی آواز نے آنیہ کی سوچوں میں بے اختیار خلل ڈالا تھا، اپنے

مکمل ناول

آنسو پونچھ کر اس نے جلدی سے کروٹ بدلی اور ساتھ والی چارپائی پر روتے ہوئے مزمل کو تھپکنے لگی۔

"امی! پاپا کب آئیں گے، مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔" مزمل کی بات پر آنیہ کے رکے ہوئے آنسو بے بسی سے پھر سے بہنے لگے۔

"بیٹا آجائیں گے آپ سو جاؤ شاباش۔" وہ مزمل کو تھپکتے دلاسے دے کر بہلانے لگی۔

کبھی اس کا گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا، آنیہ نے ارحم کے ساتھ شادی کے اٹھارہ سال بے حد مطمئن و خوش و خرم گزارے تھے، اللہ نے انہیں چار عدد بیٹوں عاشر، احمر، آفاق اور مزمل سے نوازا تھا، آنیہ کو بیٹی کی بے حد آرزو تھی مگر وہ اللہ کی رضا پہ شاکر تھی۔

آنیہ خود کو کچھ عرصہ پہلے تک دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی، چاہنے اور بے حد خیال رکھنے والا شوہر، فرمانبردار بچے، محبت کرنے والی شفیق ساس جو آنیہ کی ممانی بھی تھیں گو کہ آنیہ اور ارحم کا رشتہ بڑوں کی رضامندی سے طے ہوا مگر اس میں ارحم کی ذاتی پسند بھی شامل تھی۔

ارحم کا ماربل کا اپنا چھوٹا سا بزنس تھا، کاروبار کے سلسلے میں اکثر اوقات وہ کئی کئی دن شہر سے باہر گزارتا، آنیہ کو ارحم کی محبت پہ اندھا اعتماد تھا، بھی تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے ارحم چند دن بعد کاروباری دورے پہ کراچی جاتا اور واپس لوٹنے کا نام ہی نہ لیتا، آنیہ اپنی سادہ لوح طبیعت کے باعث اس کے لئے کبھی کوئی بدگمانی یا شبہ تک دل میں نہ لا سکی۔

آنیہ جب ارحم کی جدائی میں اس کی دید کو ترس جاتی اور اسے جلد واپسی کے لئے اصرار کرتی تو ارحم حیلے بہانے سے اسے مطمئن رکھتا۔

"اا آخر پاپا نے کراچی میں ایک اور ماربل کے بزنس سے ہی ہماری اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے پھر وہ دکانیں بھی تو پاپا کی ملکیت میں ہیں جو انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھی ہیں اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے ہر ماہ، پھر کیوں پاپا ہم سے دور جاتے ہیں۔" آنیہ کا بڑا بیٹا عاشر جو ایف اے آئی سی ایس سال دوم کا طالب علم تھا، باپ کی حد درجہ مصروفیات پر کبھی کبھی عاجز آ کر سوال اٹھاتا۔

"بری بات ہے بیٹا آخر ارحم یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہی تو کرتے ہیں تم لوگوں کے روشن مستقبل کی خاطر دن رات محنت کر کے کماتے ہیں۔"

"اماّ لیکن ہم سب ہی پاپا کو مس کرتے ہیں ہمیں ان کی فکر ہوتی ہے ایسے تو وہ اپنی صحت خراب کر لیں گے باہر ہوٹل کا کھانا کھانا پڑتا ہوگا انہیں۔" عاشر فکرمندی کا اظہار کرتا۔

"ہاں ہمارے پاپا دنیا کے بہترین پاپا ہیں۔" احمر جو میٹرک کا طالب علم تھا فخر و محبت سے لبریز ہو چلا۔

"پاپا اس بار ہم سب کے لئے کیا گفٹ لائیں گے۔" 7th کا طالب علم آفاق بہت اشتیاق و تجسس سے استفسار کرتا اور مزمل کے ساتھ مل کر مختلف قسم کے اندازے لگاتا، آنیہ سب کی باتوں پر زیر لب مسکرا دیتی۔

☆☆☆

وہ سردیوں کی ایک چمکیلی صبح تھی اور اتوار کا دن تھا، آنگن کے در و دیوار پہ بہت دنوں کے بعد بڑی بے فکری سے ہر سو دھوپ نے ڈیرے جمائے تھے۔

آنیہ کی ساس عالیہ بیگم آنگن میں بچھے تخت پر براجمان نہایت اطمینان سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے دھوپ کے ساتھ کینو سے بھی لطف اندوز

ہو رہی تھیں، جبکہ آنیہ گنگناتے ہوئے کچن میں مختلف ڈشز کی تیاری میں مصروف تھی کہ آج شام ارحم کی آمد متوقع تھی، احمر کچن میں ماں کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹانے میں مگن تھا، جبکہ آفاق اور عاشر گھر کی صفائی ستھرائی میں لگے تھے اور مزمل ابھی کمبل میں۔

"بھائی ہم لڑکیاں تو نہیں ہیں پھر یہ سارے لڑکیوں والے کام ماما ہم سے کیوں کرواتی ہیں۔" آفاق وائپر لگاتے ہوئے منہ بسور کر گویا ہوا۔۔ ہزار بار کا کیا گیا سوال پھر دہرایا۔

"یار دیکھو بہن تو کوئی ہے نہیں، تو اس لئے ماما کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانا ہمارا فرض ہے اور اسی لئے ماما نے ہم سب کو بچپن سے ہی گھر کے چھوٹے موٹے کام خود کرنے کی عادت ڈالی ہے۔" عاشر نے جھاڑو سے ماربل کا فرش رگڑ رگڑ کر دھوتے ہوئے تفصیل سمجھایا۔

"ارے بابا ایک اتوار کے دن ہی تم لوگ ذرا ماں کو آرام دیتے ہو ورنہ روز پڑھائی کی مصروفیات میں تم لوگوں کو وقت ہی کہاں ملتا ہے، یہ آفاق تو کام چور لگ رہا ہے آنیہ آفاق کو ابھی سے سدھار لو سسرالی لڑکوں کے سب گن نکل ہونے۔" عالیہ بیگم نے کینو کھاتے ہوئے لمبا چوڑا لیکچر جھاڑا، جسے آخر میں مذاق کا رنگ دے دیا اور خود ہی ہنس پڑیں۔

ساری تیاریاں خوش اسلوبی سے مکمل کر کے وہ سب لوگ بن سنور کے شدت سے ارحم کے منتظر تھے، جب داخلی دروازے کی گھنٹی بجی، آفاق، مزمل خوشی سے بھاگتے ہوئے باہر پہنچے، آنیہ بھی مسکرا کر آنگن میں ارحم کے استقبال کو نکل آئی، تیز ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی تو اس نے بے ساختہ گرم شال کا اپنے وجود کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔

موسم نے اچانک رخ بدلا تھا، فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی، سرد ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، لیکن آنیہ موسم کے ہر احساس کو نظر انداز کیے خاموش نگاہوں سے ارحم کے ساتھ اندر آتی ایک خوش اطوار سی دوشیزہ کو دیکھے گئی۔

وہ بائیس تئیس سال سے زیادہ کی ہرگز نہیں تھی، سرو قد، متناسب سراپا، جدید اسٹائل میں ترشے ہوئے بال، پیازی رنگت، چاند چہرہ، بڑی بڑی نیلی آنکھیں، بلاشبہ وہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی، جدید اسٹائل کے میرون کڑھائی والے آسمانی سوٹ میں میک اپ سے مزین اس کا گلاب چہرہ خوب دمک رہا تھا۔

یکدم آنیہ کو عجیب سی وحشت ہونے لگی اس کا دل اسے کسی انہونی سے آگاہ کرنے لگا، لیکن وہ دل کے خدشے، وہم جھٹک کر بس کھڑی ارحم کا خوشی سے دمکتا پرسکون چہرہ اور جذبے لٹاتی نگاہیں دیکھتی رہی جو صرف اس انجان حسینہ پہ مرکوز تھیں آنیہ کے وجود کو وہ دیکھ کر بھی انجان تھا یا دیکھا ہی نہ تھا، وہ سمجھ نہ سکی۔

تمام اہل خانہ کو ایک پل کے لئے سانپ سونگھ گیا تھا، ماحول پر عجیب سی خاموشی طاری دیکھ کر عالیہ بیگم اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

"پاپا یہ کون ہیں؟" عالیہ بیگم اور آنیہ کے دماغ میں کلبلاتے سوال کو بچوں نے زبان دے دی اور ارحم کا جواب نہیں بلکہ ایک دھماکہ تھا جو اس نے کیا، آنیہ کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔

"یہ میری وائف ہے۔" بچے خاموش تھے، عالیہ بیگم خوب واویلا کر رہی تھیں ارحم کو کوس رہی تھیں، مگر آنیہ تو ان سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

حیرت، بے یقینی، غم و غصہ، صدمہ نجانے کن

کن کیفیات نے بیک وقت اس کے وجود پر حملہ کر دیا، وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے کو ہٹ گئی اور برآمدے کے ستون سے لگ گئی، جس کے نیچے تک ستون سے لپٹی خزاں رسیدہ، زرد پتوں والی بیل نے اس کے وجود پر سوکھے زرد پتوں کی بارش سی کر دی۔

آنسہ نے دیکھا سرما کی نرم گرم دھوپ تو اس کے آنگن سے کب کی ڈھل چکی تھی، آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے شام سے پہلے شام کر دی، خنک ہواؤں نے آنسہ کے وجود کو منجمد کر دیا تھا اور آنگن میں تیزی سے سوکھے زرد پتے اڑانے لگیں۔

"آنسہ اب پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی وہ میرے ساتھ اب نہیں چل سکتی بس یہ وجہ ہے ورنہ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے اس سے اور یہی احسان بہت ہے کہ دوسری شادی کے باوجود میں نے آنسہ کو طلاق نہیں دی، وہ یہاں رہ سکتی ہے میرے گھر میں۔"

ارحم عالیہ بیگم کی نجانے کس بات پر بڑی بے رحمانہ کھردرے انداز میں وضاحت پیش کر رہا تھا۔

"بے شرم، بے غیرت، بچے جوان ہو رہے ہیں تیرے، تو نے ان کا بھی نہ سوچا۔" عالیہ بیگم روتے ہوئے نجانے اور بھی کیا کچھ کہہ رہی تھیں، بچے سہم کر آنسہ کی طرف لپکے محبت کرنے والے باپ کا یہ روپ بھلا کب دیکھا تھا۔

آسمان پر بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک کے بعد بارش کا پہلا قطرہ ان کے آنگن میں گرا۔

آنسہ نے تڑپ کر بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر ایک کے بعد ایک آنسو اس کا چہرہ اور بارش کے قطرے تیزی سے اس کا آنگن بھگونے لگے۔

ارحم اپنی نئی نویلی بیوی کو لیے اوپر کے پورشن میں بنے اپنے اور آنسہ کے بیڈروم کی سمت جا چکا تھا، آنسہ کی طرف اس نے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

☆☆☆

ٹوٹا اک وصل کا تارا تھا
پھر شہر ہجر ہمارا تھا
تیرے غم کی راہ پہ چلتے ہوئے
تیری یاد کا صرف سہارا تھا

ارحم کی بے اعتنائی، بے رخی، اجنبیت بھرا انداز، بیگانہ رویہ آنسہ کے وجود کو پتھر بنانے کے لیے کافی تھا، نجانے کتنا وقت بیت گیا تھا، برآمدے کی اندرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اسے یونہی گم صم بت بنے بیٹھے، دیوار اور فرش کی ٹھنڈک اور دسمبر کے برفاب جیسے کی رات کی تیز بارش میں بھیگے یخ بستہ ہوا کے جھونکوں نے اس کے وجود کو سن کر دیا تھا، مگر وہ اردگرد کے ماحول اور سردی کے منجمد کر دینے والے احساس سے بالکل لاتعلق سی ایک کے بعد ایک ذہن میں در آنے والی سوچوں اور خیالوں کے لامتناہی سلسلے میں ابھی خالی الذہن کی حالت میں پہنچی تھی، اس کا دل ساری حقیقت آنکھوں سے دیکھ کر بھی قبول کرنے سے انکاری تھا، وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کیا سوچ رہی ہے۔

عالیہ بیگم نے بچوں کے کمرے سے نکل کر کوئی دسویں بار دالان کی دیوار کے ساتھ بت بنی بیٹھی آنسہ پر نگاہ کی اور تاسف سے لب کچلنے لگیں۔

شام کو اچانک ارحم کی جانب سے ملی گئی خبر نے ان کو خود بے حد گھبرا دیا اور رنج سے دوچار کیا تھا مگر بچوں کے ساتھ لپٹ کر روتی بلکتی آنسہ اور سسکتے تڑپتے بچوں کو آگے بڑھ کر انہوں نے جیسے تیسے سنبھالا تھا، اور پوتوں کو تسلی آمیز کھوکھلے دلاسے دے کر جب بہلا پھسلا کر انہیں کمرے میں بٹھا کر مالیں کو کچھ دیر اکیلا چھوڑنے کی غلطی کر کے وہ باہر آئیں تو ان کا کلیجہ اپنی بچی جیسی بیچاری بہو کو دالان میں اس حالت میں بیٹھے دیکھ کر منہ کو آنے لگا۔

گزشتہ کئی گھنٹوں سے وہ آنسہ کو وہاں سے اٹھانے اور اس کی چپ کو توڑنے کی اچھی سی کوششیں کر چکی تھیں مگر بے سود، وہ جانتی تھیں اس کے اوپر کیا قیامت بیت رہی ہو گی مگر اس طوفانی سردی میں اس کے اس طرح سے بیٹھے رہنے سے ان کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے انہیں اس کی صحت اور سلامتی کی فکر ہو رہی تھی، انہوں نے اک نظر ہنوز سابقہ انداز میں براجمان دالان میں از حد سنجیدگی کی دو جہاں ویرانی میں خاموش نگاہوں سے آنگن میں برستی طوفانی موسلا دھار بارش، شور مچاتی ہواؤں اور در و دیوار سے لپٹے اندھیرے کو دیکھتی آنسہ پر ڈالی اور گرم شال سے اپنا کپکپاتا بھاری بھرکم وجود سنبھالے اس کے قریب چلی آئیں۔

"میری بچی چلو اب اندر چل کر بیٹھو۔"

ان کی بات نے اس کی پوزیشن پر کوئی اثر نہ کیا۔

"آنسہ تم بیمار پڑ جاؤ گی اپنا نہیں تو بچوں کا خیال کر لو اس بوڑھی ماں پر ترس کھا لو کچھ ان ہڈیوں میں اتنا دم نہیں رہا کہ جاڑے کی برفانی رات میں اس ٹھنڈک کو جھیل سکیں اندر چل کر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" ان کی جذباتی بلیک میلنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنسہ نے اس عرصہ میں پہلی بار نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا تھا، ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو رستہ بنانے نیچے اتر رہے تھے۔

"امی ارحم وہاں میری جگہ کسی اور کے ساتھ۔" اس نے پہلی بار لب وا کیے اور کپکپاتے لرزتے انداز میں جیسے ارحم کی شکایت کی اور یکلخت ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

عالیہ بیگم نے بے چارگی سے اوپر کے پورشن کی طرف نگاہ کی اور اسے شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے دھیرے سے اٹھایا، اٹھنے کی سعی میں بے اختیار ایک طویل آہ اس کے لبوں سے نکلی، ایک ہی پوز بنائے رکھنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں تھیں، عالیہ بیگم دھیرے سے اس کی ٹانگوں کو سہلانے لگیں۔

"اس سے اچھا تھا آنسہ ارحم مر جاتا، تم بیوہ ہو جاتیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ بے اختیار دہل کر انہیں دیکھنے لگی اور وہ ایک ماں ہو کر اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی تمنا کر رہی تھیں۔

"کم از کم دل کو تو تسلی دیا جاتا کہ اللہ نے لے لیا ہے، زمانے میں عزت تو رہ جاتی، اس عمر میں ایسا کام کر کے بڑھاپے میں میرے سر میں خاک ڈلوا دی کہیں منہ دکھانے قابل نہیں چھوڑا۔" لمحہ بھر کے توقف سے اپنی بات کی طویل وضاحت انہوں نے سسک کر مکمل کی۔

"نہیں امی اللہ ارحم کو میری عمر بھی لگا دے، وہ ایک بار مجھے کہتے ان کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر جاتی مگر اب....." وہ یکدم سے تڑپ کر رو دی۔

"اور.... اور.... وہ..... تو.... کہتے تھے، میں صرف آنسہ کا ہوں آنسہ کے سوا ارحم کسی کا نہیں ہو سکتا، وہ..... انہوں نے..... کہا کہ تم میری زندگی ہو، وہ سب..... وہ سب جھوٹ تھا کیا؟" آنسوؤں کی روانی میں ٹوٹتے ہوئے بے ربط اور کبھی رواں انداز میں ارحم کی مختلف مواقع پر

سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" اب کے ارحم نے آنسو ضبط کرنے کی سعی میں لرزتی آواز میں بیان کیا۔
"بابا نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا، ماما ہم اب یہاں نہیں رہیں گے نانو کے گھر چلتے ہیں بہاولپور، یہاں نہیں رہنا ماما اس گھر میں تو بالکل نہیں۔"
عاشر ماما کے کندھے سے لگ کر سسکنے لگا اور پھر آنسوؤں کا نہ رکنے والا ساون ان سب کی نگاہوں سے بہنے لگا، سب کو سسکتا دیکھ کر عمار مزمل متوحش سا آنسو بہانے لگا اور دادی کی گود میں سر دے دیا۔
"آنیہ تمہارا جو فیصلہ ہو گا میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن میں صرف تم لوگوں کی وجہ سے اس گھر میں رہ رہی ہوں جس دن تم لوگ یہاں سے گئے مجھے بھی یہاں نہیں پاؤ گے۔"
عالیہ بیگم ہچکیوں ہچکیوں سوں سوں کرتی بہو کے بولنے کی منتظر تھیں، وہ روکنا چاہتی تو کس منہ سے کس آس کے بل بوتے پر اس کے راستے میں حائل ہو کر دامن تھامتیں۔
"بچو! یہ دو نانو اب نصیب میں لکھا ہے مگر گھر چھوڑ کر نہیں جانا، کہیں نہیں، کبھی نہیں، لوگوں کا کام باتیں بنانا ہے انہیں اپنا کام کرنے دو کسی کی پروا نہ کرو تم سب کو ہمت، حوصلے سے کام لینا ہے اچھا شاباش۔" اس کی بات پر سب ششدر رہ گئے اور اس کی ساس خوشی سے اسے لپٹا کر رو دیں جو باتیں وہ بہو کے بتا کے سمجھ گئی تھیں بچے اس گہرائی سے نابلد تھے، بھی "کیوں" "کیوں" کی گردان کرنے لگے۔
"آپ کے بابا نے جو کچھ کیا ہے اسے کسی نہ کسی طرح ہم سب تسلیم کر چکے ہیں اور یہ گھر ہمارا ہے اپنا گھر چھوڑ کر کسی اور کے در پہ جائیں

حماقت ہے، اس سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو گا کمی نہیں۔" وہ درسانی سے بچوں کو سمجھانے لگی جبکہ ان کی دادی متاثر کن انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔
"آپ سب کی تعلیم کا حرج ہو گا اور پھر دنیا میں تماشا الگ بنے گا، ابھی تو ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور بہاولپور میں سب رشتے داروں کو کوئی خبر نہیں ہے۔"
"زمانے کی نظر میں، میں ارحم کی بیوی ہوں اور اس گھر میں مجھے اور میرے بچوں کو ارحم کی توجہ نہ سہی مگر ساری آسائشات اور وہ وقت کی روٹی تو مل جائے گی، بچوں کے روشن مستقبل کے لئے میں یہیں اسی گھر میں رہوں گی۔" اب وہ صرف ایک ماں بن کر سوچ رہی تھی۔
بچوں کو اپنے فیصلے کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کر کے آنیہ نے ٹھنڈی طویل سانس خارج کر کے گفتگو کا آخری حصہ اپنی ساس پہ نگاہ مرکوز کیے مکمل کیا، وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے فرط مسرت سے رونے لگیں، اس کے فیصلے کے احترام میں بچے خاموش رہے۔
"مجھے فخر ہے تم میری بہو ہو تم ایک عظیم عورت ہو، ارحم بدنصیب ہے جو ہیرا چھوڑ کر کوئلہ لے آیا، اس گھر سے تم نہیں بلکہ وہ جائے گی ایک دن ان شاء اللہ۔"
"چھوڑیں امی وہ بیوی ہے ان کی، اس کا بھی حق ہے اس گھر پر اور ارحم پر۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز لرز گئی تھی، اس نے بچوں کو کھانا کھانے کے لئے باہر بھیج دیا۔
"ارے کیسی بیوی اس نے تمہارے حق پر تمہارے شوہر پر ڈاکہ ڈالا ہے، شریف عورتوں کے یہ چلن نہیں ہوتے۔" بچوں کے باہر نکلتے ہی عالیہ بیگم چمک کر گویا ہوئیں، ان کی بات پہ وہ

چپ چاپ سی اور سوچ میں گم ہو گئی۔
"اے آنیہ بچی تم ایکبار اس سے بات تو کر کے دیکھو اپنے حقوق کے لئے، اگر اسے چھوڑ نہیں سکتا تو الگ گھر میں رکھے۔" انہوں نے سرگوشیانہ انداز میں مشورہ دیا، جیسے انہیں مان ہو کہ وہ آنیہ کی بات رد نہیں کرے گا، اسے ان کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔
"امی۔" وہ حق دق اسے تکتی ہوا رہ گئیں گویا اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو گیا تھا انہیں۔
"امی ان کے جذبات اور نگاہ بدل گئی ہے، آپ کس مان کی بات کر رہی ہیں؟ وہ مان تو اس شام ہی جھٹکے سے میرے دل کے ساتھ ٹوٹ گیا جب وہ اس لڑکی کے ساتھ آئے تھے، ان کی خوشی کسی اور سے وابستہ ہے تو یہی سہی، میں نے سوچ لیا ہے ان سے کچھ نہیں کہنا، جو ہے جیسے ہے ٹھیک ہے۔" بات کرتے کرتے اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر کرب سے آنکھیں موند لیں اور گہرے سانس بھرنے لگی، جیسے بے حد طویل مسافت طے کر آئی ہو، تھکان اس کے وجود میں دھیرے دھیرے اترنے لگی، عالیہ بیگم خاموشی سے باہر نکل آئیں۔
صحن میں رات کے اندھیرے نے ہر سو اپنے ڈیرے جما رکھے تھے، دالان کی دیوار سے لپٹی خزاں رسیدہ بیل کے بیشتر پتے زرد تھے اور آدھی سے زیادہ بیل کو تند ہوا کے جھونکوں نے سر ٹکرا ٹکرا کر بکھیر دیا تھا اور ہوا باقی ماندہ پتے بھی جھاڑنے پر کمر بستہ تھی، ہوا کے خنک اور نم جھونکے بار بار بیل کی شاخوں سے گلے ملتے اور نیچے آنگن میں یہاں سے وہاں ماربل کے فرش پر سوکھے زرد پتے بکھر جاتے۔
عالیہ بیگم نے ایک نظر خزاں کی زد پر آئی بیل کو دیکھا انہیں وہ آنیہ کی زندگی کے موجودہ دور کا حصہ لگی زرد رتوں کا دکھ سہتی ہوئی ہوا کی زد پہ بے بس، انہوں نے بے اختیار اک طویل سانس خارج کی بستہ فضا کے سبز رنگی اور سرد فضاؤں کا خمیازہ جھیلنے کی صورت بھٹکتی ہوئی بچوں کے کمرے میں پناہ لی۔

☆☆☆

"تمہیں معلوم ہے آنیہ تمہاری کس چیز نے مجھے تمہارا دیوانہ بنایا۔" اس کے بے حد قریب سے کسی نے مخمور انداز میں سرگوشیانہ استفسار کیا تھا۔
اور اس نے سرمگیں انداز میں استفہامیہ انداز سے نگاہ اٹھا کر سامنے بے حد وجیہہ و شکیل ہم سفر کو دیکھا اور ان آنکھوں میں مچلتے والہانہ جذبوں کی تاب نہ لا کر نگاہ جھکا لی۔
"تمہاری سادگی اور معصومیت نے۔"
"اللہ دو بار ہماری شادی کو دو ماہ ہونے والے ہیں تم ابھی تک مجھ سے اتنا شرماتی ہو۔" تھوڑی چھو کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔
"پتا ہے تم شرماتی ہوئی بے حد حسین لگتی ہو اور نے ہوئے لالیاں تو دیکھو۔" اسے شرم سے گلنار ہوتا دیکھ کر وہ بھوا اور قریب ہو کر شرارت پر کمر بستہ ہوا تو اس نے گھبرا کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔
"ہاہاہا، میری جان آنیہ۔" محبت سے اس کے بالوں میں بوسہ دیا۔
نجانے کب کی بھولی بسری یاد کا عکس اس کے خیال کے پردے پر جھلملایا اس کی بند آنکھوں کا حصار توڑ کر دو آنسو پھر سے باہر نکل آئے اور دل سے ہوک اٹھنے لگی۔
"آنیہ۔" خیال کی شدت اس کی سماعتوں پر حاوی ہو گئی تھی اسی لئے ارحم کی گمبھیر آواز اسے

واضح بے حد قریب سے ابھرتی محسوس ہونے لگی اور اس کے مخصوص کلون کی مہک، اس کی موجودگی کا دلفریب احساس، اس نے آنکھیں نہیں کھولیں مبادا تصور ٹوٹ نہ جائے۔

"آنیہ!" اب کے آواز قدرے بلند اور بیزاری کا عنصر لیے ہوئے تھی، اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، وہ مجسم حقیقت بنا اس کے سامنے موجود تھا۔

"ادحم!" اس کے لبوں نے بے اختیار جنبش کی۔

"ادحم! آپ آ گئے۔" نجانے کس خوش گمانی کے باقی ماندہ احساس کے تحت اس نے اس کی آمد پر خوشی محسوس کی، وہ اس کی طبیعت کا سن کر رہ نہیں سکا، وہ اس سے ملنے اسے ایک نظر دیکھنے آیا ہے، اس کی محبت کے رنگ اتنے کچے ہرگز نہیں، اسے اب بھی اس کی پروا ہے، وہ بس یونہی واسطہ بھول گیا تھا، وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی، لیکن لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے رونما نے اس کے دل میں آئے ہر خیال کی نفی کر دی کہ اس کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں تیرتی بیگانگی اور پتھریلے تاثرات میں کسی خوش کن خیال کا دامن پکڑنا بے حد حماقت کی بات تھی۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر اسے بغور دیکھ رہی تھی ایک انجانا سا خدشہ بے نام سا خوف اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا، وہ شاید الفاظ ترتیب دے رہا تھا، حبس زدہ جان لیوا خاموشی ان دونوں کے درمیان گویا صدیوں کے فاصلے در آئے تھے، کب سوچا تھا کہ ان کا رشتہ بھی اس نہج اور اس صورت کا ہو جائے گا، اس کی آنکھ کے کونوں میں آنسو سسکنے لگے۔

"تم اپنے گھر کب جا رہی ہو؟" بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

"کک...کیا؟" وہ ٹھٹک کر ہکلائی۔

"میں نے کہا تم اپنے گھر کب جا رہی ہو؟" اپنی بات دہرا کر اب کے وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر گویا ہوا۔

"میرا گھر تو یہ ہے میں نے کہاں جانا ہے؟" وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھ پائی اور قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔

"یہ تمہارا گھر نہیں ہے، یہ گھر میرا ہے تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم بیاہ کے آئی تھیں، تم وہیں جاؤ گی۔" آنیہ کا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا وہ لڑکھڑا گئی اور بیڈ کراؤن کا کونا تھام لیا، بے یقینی کی کیفیت سے تکتی رہ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

(یہ پورا گھر نیچے سے اوپر تک تمہارا ہے، تم یہاں کی وارثی ہو، ادحم کے دل کی ملکہ) اسے اس کی بہت پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی۔

اور اب...... اب ادحم کے وجود کے ساتھ وہ اس گھر کو اپنا کہنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی، ایسا بھی کبھی ہوتا ہے کیا؟

ادحم کی درشت آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے عالیہ بیگم اور بچے نکل کر ادھر آن کھڑے ہوئے تھے۔

"دماغ چل گیا ہے تیرا ادحم، پہلے کیا کم دکھ دیا ہے جو اب ان گھٹیا حرکتوں پر اتر آیا ہے۔" عالیہ بیگم اس کے الفاظ سن چکی تھیں، انہوں نے اسے بری طرح ڈانٹ کر رکھ دیا اور ایک کونے میں لرزتی کانپتی بہو کو ساتھ لگا کر تسلی دینے کے لیے

... سہارا پاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے یہ گھر خالی چاہیے، عجیب ڈھیٹ عورت ہے یہ آنیہ بھی جان نہیں چھوڑ رہی۔" وہ بڑبڑایا، ماں کی حمایت کو بھی خاطر میں نہ لایا تھا، یہ وہ گھر تھا جو ہمیشہ سے محبتوں اور خوشیوں کا گہوارہ رہا تھا، اس گھر میں کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، کجا کہ کسی سے پیش آنا اور والدہ کے آگے بولنا، مگر بچے دیکھ رہے تھے باپ کا رویہ دادی کے ساتھ بھی بدل گیا ہے آفاق، غزل، احمر کے پیچھے سہمے آنسو بہا رہے تھے۔

"امی مجھے یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا، مجھے نہیں جانا۔" وہ خوف زدہ اور پریشان آواز میں روتے ہوئے گویا ہوئی، وہ اپنے دکھوں میں اپنے میکے والوں کو شامل کر کے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیوں نہیں جانا ہاں، تم مجھے تین لفظ کہنے پر مجبور نہ کرو آنیہ شرافت سے رخصت ہو جاؤ۔" اس بات پر امی نے بری طرح بوڑھے ہاتھوں سے ادحم کو جھنجھوڑ ڈالا، جبکہ وہ روتے بلکتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"نہیں ادحم! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی بس مجھ سے اپنا نام مت چھینیے گا پلیز آپ کو اللہ کا واسطہ، میں چلی جاؤں گی، چلی جاؤں گی۔" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں اس سے التجا کر رہی تھی، جبکہ امی اس کو کوسنے دینے میں مشغول تھیں۔

"تو نے تو کہا تھا کہ یہ یہاں رہ سکتی ہے اور تو نہیں چھوڑ رہا اسے۔" اس نے بوڑھی ماں کے تھل تھل کرتے وجود کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور جھنجھلا کر اپنا آپ چھڑایا۔

دادی کو احمر نے تھام لیا تھا جبکہ عاشر نے آگے بڑھ کر ماں کو باپ کے قدموں سے جھک کر اٹھایا۔

"بابا ہم اب یہاں نہیں رہیں گے بس چلیں بہت ہو گیا۔"

"ہاں ہاں سب دفع ہو جاؤ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ چیخا اور دوسرے لمحے ماں کی طرف مڑا۔

"اور وہ پہلے کی بات تھی میں نے سوچا تھا چلو بیچاری بیٹھی رہے گی مگر یہ گھر حق مہر میں، میں نے سارا اپنی سیکنڈ وائف کے نام لکھ دیا ہے اور سارا کو آنیہ اور بچوں کا یہاں رہنا پسند نہیں تو بس جو سارا کا فیصلہ وہ میرا فیصلہ۔" عالیہ بیگم کے مسلسل کوسنے پر اس نے رخ کر کے اپنے اس اقدام کی وضاحت دی تھی۔

"ہمیں ایک دو دن کی مہلت دے دیجئے، ہم اپنا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔" وہ اس سنگدل کے سامنے نیر بہاتی ہاتھ جوڑے فریاد کناں تھی۔

"آنیہ تم مجھ پر حرام ہو گی اگر اس رات تم میرے گھر پر رہیں۔" وہ انگشت شہادت کا رخ اس کی جانب کیے وارن کرنے کے سے انداز میں سفاکی سے گویا ہوا۔

"ا......د......ح......م۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے حد استعجاب کے عالم میں بے یقینی، رنج وصدمہ کی کیفیت میں اسے پکارتی عاشر کے بازوؤں میں جھول گئی۔

آج اس نے وہ بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

آنیہ کا دنیا و مافیہا سے بے خبر بے ہوش وجود اس کے سامنے تھا، اس کا آنسوؤں سے تر ہوش سے بیگانہ چہرہ، نڈھال بے سدھ وجود، جس کے اوپر بچے اور عالیہ بیگم متفکر، ہراساں

جھنجھوڑ کر بیداری کرنے اسے پکار رہے تھے ہوش میں لانے کے لئے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔

لیکن وہ بے حد اطمینان سے کھڑا کوفت زدہ انداز میں یہ ساری کاروائی دیکھ رہا تھا، آف وائٹ شرٹ اور گرے کلر کے ٹوپیس میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔

مضبوط کسرتی بدن پر کلین شیو والا سرخ و سفید چہرہ ضبط اشتعال سے کچھ زیادہ سرخی مائل ہو رہا تھا، بڑی بڑی گہری شفاف آنکھیں، روشن پیشانی، بڑھائے گئے جیل کی بدولت قدرے سیٹ کیے ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، غصہ کی شدت کے دوران سر کو دیئے گئے بارہا جھٹکوں کی بدولت گھنے براؤن بال پیشانی کے اطراف میں بکھر گئے تھے، آنسہ نے آنکھیں کھولتے ہی بے حد کرب سے اپنے ارحم کا بیگانہ انداز دیکھا اور غالباً آنسوؤں کی دھند میں شاید آخری بار اس کو اپنی نگاہوں میں قید کرنے کی سعی کی اور پھر آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کے وجود پر سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیں، پھر بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہو گئی اور ذرا سی لڑکھڑائی، بچوں نے دائیں بائیں سے تھام لیا۔

“ہاشر! رکشہ لے آؤ ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے جائیں گے۔” اپنی تمام تر ہمتیں جمع کر کے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے اپنے بکھرے وجود کی کرچیوں کو سمیٹتے ہوئے وہ، بچوں کے چند ضروری کپڑے اور کتابیں بیگز میں بھر رہی تھی، ارحم اوپر جا چکا تھا۔

عالیہ بیگم کے واویلے اور بلند کوسنے جاری تھے انہوں نے ارحم کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور آنسہ اور بچوں کے ساتھ اس گھر سے رخصت کو ترجیح دی تھی، ان کے بیٹے کو جہاں کوئی پروا نہ تھی۔

“ارحم کا [illegible] بیڑا غرق ہو [illegible] سے اچھا میں بے اولاد ہی مر جاتی، تو نے اپنی اتنی نیک، صابر بیوی کو چھوڑا ہے تجھے اللہ کبھی بیوی کا سکھ نہ دے گا، تو روئے گا ارحم، ایک دن تو اپنی اسی بیوی اور بچوں کے لئے ترسے گا مگر پھر یہ لوگ تجھے دھتکار دیں گے، اتنا ظالم ہو گیا تجھے آنسہ کی بگڑتی طبیعت بھی نظر نہ آئی۔” وہ آنگن میں کھڑی سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

دالان کے ستون سے لپٹی بیل ویران ہو چکی تھی، تند خو ہوا نے اس کو تمام خشک و زرد پتوں سے محروم کر دیا تھا، فضا بے حد سرد و خاموش ہو گئی تھی، نم ہوا کے جھونکوں کی شدت نے [illegible] توڑ دیا، کھلے آنگن کے اوپر نظر آتے آسمان کو شب کے اندھیرے نے اپنے حصار میں لپیٹ رکھا تھا، اماوس کی رات میں آسمان پہ [illegible] کوئی تارا نہ تھا۔

دور فلک پر اندھیرے کی چادر سے ذرا نیچے منہ لاتے بادل کی اک آوارہ سے ٹکڑے نے اپنے گھر کے در و دیوار پر حسرت آمیز نگاہ کرتی سیاہ عبائے میں ملبوس آنسہ کو عالیہ بیگم اور بچوں کے سنگ رخصت ہوتے دیکھا تو ان کے ساتھ سفر کرنے لگا اور ہوا سے سرگوشی میں مصروف ہو گیا۔

جب ملتان سے بہاولپور کی مسافت طے کرنے کے لئے وہ سب بے حد چپ چاپ، دل گرفتہ، کوچ میں سوار ہوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے، سیاہ رات کی سرد ہوائیں یکلخت ہی کوچ کی بند کھڑکیوں اور دروازوں سے سر ٹکرانے لگیں اور بادل کے ٹکڑے کے ساتھ اور بہت سے بادل اکٹھے ہو کر شدومد سے آنسو بہانے لگے۔

سوز غم دے کر مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

وہ [illegible] الفاظ نہیں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
دل کو جھونکوں نے بھی گلشن سے رہا شد دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کہ تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

☆☆☆

“زندگی برباد کر دی، ارحم بھائی نے اپنی جنت جیسی پرسکون زندگی، بچوں سے بنا گھر خود ہی برباد کر دیا۔” مریم بھابی آنسہ کو ساتھ لگائے صوفے پر اس کے دائیں طرف براجمان اسے چپ کرانے کی سعی میں ہلکان تھیں، ان کا بس نہ چلتا تھا، ارحم کو کچا چبا جائیں، مریم بھابی اس کی چچازاد بھی تھیں انہیں اپنی اکلوتی نند بے حد عزیز تھی اور اس سے دلی ہمدردی محسوس کر رہی تھیں۔

بھیا نے خاندان کے چند بڑے بزرگوں کے ساتھ مل کر ارحم کو سمجھانے کی بے حد سعی کی تھی مگر ارحم سارا کی محبت میں اندھا ہو کر ہر رشتے کا لحاظ کھو بیٹھا تھا، بھیا ارحم کے کہنے پر آنسہ کے جہیز کا سب سامان اور عالیہ بیگم کا ضروری سامان لے آئے تھے، آج بھیا نے اس سے خلع کے لئے مشورہ کیا تھا جس پر وہ بپھر سی گئی تھی، اسے یہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں تھا۔

“سمجھنے کی کوشش کرو آنسہ، وہ جو کچھ کر چکے ہیں اور جس طرح سے بنا کسی قصور کے تم سے اور بچوں سے لاتعلق بنے بیٹھے ہیں، ایسے میں ان سے مکمل علیحدگی اختیار کرنا ہی مناسب ہے۔” مریم بھابی نے رسان سے اسے پھر سے قائل کرنا چاہا۔

“مجھے ان سے ہمیشہ علیحدہ رہنا منظور ہے مگر ان کا نام اپنے نام سے جدا کرنا ہرگز گوارا نہیں، اس بے نام تعلق کو ان کے حوالے کر کے مجھ سے مت چھینیں پلیز۔” وہ پھر سے سسکنے لگی، بھابی نے بھیا کو اک گہری سانس بھر کر دیکھا۔

“ہمیں آنسہ کے فیصلے کا احترام کرنا چاہیے۔” وہ گویا ہوئیں، بھیا مضطرب سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

“جلیلہ آپا مجھے معاف کر دیں، میں آپ سب کی مجرم ہوں میں نے ایسی ناخلف اولاد پیدا کی جسے نہ ماں کی پرواہ ہے نہ فرشتہ صفت بیوی اور بچے عزیز رہے۔” عالیہ بیگم آنسہ کی اماں کے سامنے ندامت سے ہاتھ جوڑ کر اشک بہانے لگیں۔

“نہیں بھابی یہ سب تو نصیب کے کھیل ہیں، کون مان سکتا ہے کہ میری نظروں کے سامنے پلا، بڑھا نیک، قابل بچہ شادی کے اتنے عرصے بعد اس عمر میں کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے۔” اماں چشمے کی اوٹ سے آنسو بہانے لگیں ان کا نحیف و کمزور وجود اس خبر کو سن کر صدمے سے بکھر گیا تھا آنسہ، بچوں کو دیکھ کر پل پل آنسو بہاتی تھیں عالیہ بیگم کا حال ان سے کچھ مختلف نہ تھا، اٹھتے بیٹھتے اچانک ہی خود کو موردِ الزام ٹھہراتے ان سے معافیاں مانگتی رہتی تھیں، اچھا تھا جو آنسہ کے والد حیات نہیں تھے ورنہ کس منہ سے ان کا سامنا کرتیں۔

بھابی نے گھر کی انیکسی میں ان سب کی مستقل رہائش کا بندوبست کر دیا تھا اور جب گھر کے اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایک معقول رقم بھابی نے اس کے حوالے کرنی چاہی تو آنسہ نے سہولت سے انکار کر دیا۔

“بھابی! اتنے سالوں میں گھر کے اخراجات سے بچت کرنا میری عادت تھی

میرے اکاؤنٹ میں کچھ رقم موجود ہے میں اب اپنے گھر کا خرچ اور دو سو دار ہی خود اٹھاؤں گی آپ لوگ پہلے ہی اتنا کر چکے ہیں اب اور شرمندہ مت کریں۔"

"ہاں بیٹا وہ رقم مجھے جو تم ہر ماہ ایک مخصوص رقم دیا کرتا تھا وہ میں ایک طرف جوڑ کر رکھا کرتی تھی سوچا تھا میری موت کے بعد چاروں پوتوں میں وہ رقم بانٹ دی جائے گی، لیکن اب وہی رقم میرے بچوں کے تعلیمی اخراجات میں کام آجائے گی، اس کا اس سے اچھا استعمال بھلا اور کیا ہوگا۔" عالیہ بیگم نے گفتگو میں شامل ہو کر مریم کو سمجھایا۔

"لیکن پھر بھی آپ لوگوں کی جمع پونجی کسی نہ کسی دن ختم ہو جائے گی، مہنگائی کا زمانہ ہے یہ پیسے رکھ لو آپ تمہارے کام آئیں گے، اللہ کا شکر ہے اس نے تمہارے بھیا کو بہت دیا ہے تم ہم پر بوجھ نہیں ہو۔" بھابھی نے اصرار کیا، وہ قناعت پسند اور وسیع القلب تھیں۔

"میں نے ایک۔۔۔ سکول میں ٹیچنگ کے لئے اپلائی کیا ہے انشاء اللہ جاب بھی مل جائے گی آپ فکر مت کریں۔"

آنسہ ایم اے اسلامیات تھی، برسوں پہلے حاصل کی گئی تعلیم اب اس کے کام آنے والی تھی۔

اسے اپنی خودداری بے حد عزیز تھی، اسی لئے اس نے گھر کے اندر رہائش کے بجائے انیکسی کو ترجیح دی تھی، تاکہ کھانے پینے اور دیگر امور کی ذمہ داریاں اور خرچ وہ خود اٹھا سکے۔

اس کی ضد کے آگے مریم بھابھی خاموش ہو گئی تھیں مگر انہوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً بڑی خوبصورتی سے اپنی اس خوددار نند کی مدد کرتی رہیں گی تاکہ اس کی خودداری مجروح نہ ہو اور ضروریات کی پوری ہو جائیں۔

آنسہ کو مقامی سکول میں مناسب تنخواہ پر ٹیچنگ مل گئی تھی، مزمل کا داخلہ اس نے اسی سکول میں کروا لیا، جبکہ آفاق اور احمر کو پرائیویٹ سکول میں تعلیم کا سلسلہ جاری کروایا، رہا عاشر تو وہ تعلیم چھوڑ کر نوکری کر کے اپنی ماں اور اہل خانہ کی کفالت کرنا چاہتا تھا۔

لیکن عالیہ بیگم اور آنسہ کی منت سماجت اور پڑھا لکھا کامیاب انسان بن کر دکھانے کا ان کا خواب اسے پورا کرنے کے لئے تھمنا پڑا تھا اور اس نے اپنا ایڈمیشن مقامی کالج میں کروا لیا۔

☆☆☆

مزمل کا ہاتھ تھامے سکول سے آف ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی گھر میں داخل ہوئی، اوائل فروری کا مسکراتا سورج اپنی کرنوں سے دھرتی کو شاداب کرتا ہر سو دھوپ لٹا رہا تھا، لان میں اگی چھوٹی چھوٹی خشک زرد اور کہیں کہیں سے جھانکتی سبزی مائل گھاس، پھولوں سے لدی درختوں کی شاخوں اور ایک طرف موجود کیاری میں تھا اور وقتاً دوسرا اٹھائے پھولوں، پتوں سے محروم بہار کے منتظر بے لباس شاخوں والے ان گنت پودوں پر دھوپ کا بسیرا تھا۔

وہ دھوپ سے نگاہ چرا کر اندر کی طرف چلی آئی اور اندر کا نظارہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی، کچن کے عین سامنے چھوٹے سے برآمدے تھا صحن میں ایک کونے سے لگے تخت پر عالیہ بیگم آفاق کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں مشغول تھیں اور کچن کے اندر کھڑی عبیرہ بری طرح سے روٹی بیلنے اور دنیا جہاں کے نقشے بنانے کی سعی میں مصروف تھی۔

"امی! آپ نے اسے کیوں کچن میں

جانے دیا، وہ ابھی بچی ہے نا تجربے کار کہیں ہاتھ وات جلا لیا تو بھابھی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" سلام کرنے کے بعد اس نے اپنی ساس سے پریشان کن لہجے میں جواب طلبی کی، مزمل اندر کمرے میں یونیفارم تبدیل کرنے چلا گیا تھا۔

عبیرہ کے تین بچے تھے، علیہ بی کام فائنل ایئر، باسل آئی سی ایس کا طالب علم تھا اور تقریباً عاشر کا ہم عمر تھا پھر سب سے چھوٹی عبیرہ جو احمر کی عمر کی تھی اور اسی کی مانند میٹرک کی سٹوڈنٹ تھی۔

"السلام علیکم پھپھو جانی!" وہ آواز پر پلٹ کر مسکرائی تھی، اس نے اپنی بات کے دوران اس کے سلام کا جواب دیا۔

"میری کب کتنی ہے وہ تم جانتی ہو اپنی بچی کو۔" وہ منمنائی۔

"ہو پھپھو جانی کیا ہو گیا ہے، تم آن میں اب اتنی بھی بچی نہیں ہوں۔"

"مگر بیٹا میں نے پہلے بھی کئی بار منع کیا ہے میں کر لوں گی تم کیوں خود کو ہلکان کر لیتی ہو۔" آنسہ نے محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وہاں سے ہٹایا۔

"یار پھپھو مجھے اچھا لگتا ہے کچن کے کام کرنا اور ماما اور علیہ آپی مجھے کچن میں گھسنے تک نہیں دیتیں ان کی نظر میں، میں ابھی چار سالہ بچی ہوں اور آپ ہیں آپ بھی مجھے روک رہی ہیں۔"

"اور میں روز تھوڑی نا کرتی ہوں، آج سکول سے لیٹ ہو گئی تھی چھٹی ہو گئی تو آپ کا کام کر دوں، پلیز مجھے بنانے دیں نا، بس آخری روٹی ہے۔" اس کی چٹر پٹر پر آنسہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"بھابھی سے تمہاری شکایت کرنی پڑے گی۔" اس نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔

مزمل کھانا مانگ رہا تھا عبیرہ کے محنت سے بنائے گئے نقشے دیکھ کر ہنس پڑا۔

"آپی آپ کیسی شکل کی روٹی بناتی ہیں۔" وہ گویا ہوا۔

"اوئے پاکستان کا نقشہ آیا ہے آپ کے حصے میں، میرا والا آسٹریلیا کا تھا۔" آفاق اپنی خالی چنگیر اور پلیٹ کچن میں رکھنے آیا تو مزمل کی روٹی کو دیکھ کر لقمہ دیا۔

"مسز آفاق تم صورت کو نہیں سیرت کو دیکھو اور کے اور وہی صورت تو وہ بھی سنور جائے گی اگر یہ ظالم بڑو گ خواتین میرے تیک ارادوں کی راہ میں حائل ہو کر انہیں خاک میں نہ ملائیں تو۔" اسے مصنوعی ڈپٹ کر اس نے اپنا لہجہ تھوڑا سا بنایا اور چلنے لگا، جبکہ آنسہ اور عالیہ بیگم مسکرا دیں۔

☆☆☆

"آج ماں کی یاد کیسے آگئی تمہیں۔" اسے اتنے دن بعد اپنے روبرو دیکھ کر اماں کے منہ سے بے اختیار شکوہ پھسل گیا۔

"بس اماں، مصروفیات ہی اتنی ہوتی ہیں، سکول سے آ کر بھاگم بھاگ روٹی پکانا، امی اور بچوں کو کھانا دینا نماز پڑھنا، پھر ٹیوشن کے لئے بچے آجاتے ہیں ان کو نمٹاتے ہوئے ساتھ ساتھ عصر، مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے پھر اسی دوران اگلے دن کے لئے ہنڈیا پکانی ہوتی ہے، سبزی ای بنا دیتی ہیں، پھر رات کی روٹی پکا کر کچن سمیٹتے ہوئے بس یہ ہوتا ہے کہ جلدی سے عشاء پڑھ کر بستر سنبھال لوں۔" اس نے تفصیلی ہو کر طویل وضاحت دی۔

"آنسہ نے تو اب بچوں سے کام کروانا بھی چھوڑ دیا ہے۔" عالیہ بیگم نے لقمہ دیا۔

"اماں بچے اپنے چھوٹے چھوٹے کام تو خود ہی سنبھال لیتے ہیں، پھر جو کچھ ہو چکا ہے اس

جتے بچے بے صدا اب جب ہو گئے ہیں، میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ پڑھائی کی مصروفیات کے بعد جو کچھ ٹائم بچے وہ علیحہ، میرو، باسل وغیرہ کے ساتھ گزاروں۔ ان کے ساتھ ہنسنے، کھیلنے بہل جاتے ہیں بچے۔"

"اور میں خود جان بوجھ کر اپنے اوپر ڈھیروں ڈھیر مصروفیت کا بوجھ لاد لیتی ہوں اچھا ہے دن آسانی سے گزر جاتا ہے، کچھ سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔" اماں کی پرسکون خاموشی اور خود پر کھوجتی گہری نگاہوں سے گھبرا کر وہ متواتر بولتی چلی گئی اسی لیے تو وہ ان سے بچتی تھی۔

"میری بچی میں تو ہر پل تیرے سکون قلب اور زندگی کے رستوں پر صبر اور آسانی کے لیے دعا کرتی ہوں۔" اس بات پہ عالیہ بیگم تاسف و ندامت سے سر جھکا گئیں، وہ جب کی اجڑی زندگی دیکھ کر ان کے دل پر بیتنے والے حالات اس کی دکھی ماں کی کیفیات سے مختلف تو نہیں تھے، لیکن وہ اظہار کر کے اس کے زخم نہیں کریدنا چاہتی تھیں خود کو کھوکھلی ہی سہی مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر دل بظاہر سنبھل جاتا تھا اور اندر سے روتا تھا۔

لیکن اماں جب آنسو کو آنکھوں میں لیے حزن ملال وہ آنسوؤں سمیت لبوں پہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے دیکھتیں تو ان کا دل کٹ کر رہ جاتا، اس کی کھوکھلی بے خود ساختہ مسکراہٹ ان کا وجود زخمی کر ڈالتی تھی اور دل آنسو بن کر آنکھوں میں سسکنے لگتا۔

"تو ماں دعا کرتی رہا کریں دعائیں ہی زندگی کو سہل بنا دیتی ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں مخاطب تھی۔

(کاش میں نے کبھی ارحم کی دائمی وفا کی دعا کی ہوتی اس کے دل میں ہمیشہ اپنی محبت و چاہت سے بسیرا قائم رکھنے کی دعا، تو شاید وہ بے وفائی کا رنگ نہ ہوتا)۔

لیکن وہ ہمیشہ اس کی محبتوں پہ اندھا اعتماد کرتی رہی اور رب کی مہربانی پہ شکر کا کلمہ پڑھتی رہی جس نے "آپ اپنا خیال رکھا کریں، دیکھیے حلقے پڑے ہوئے ہیں تیری آنکھوں کے گرد، تو کیا راتوں کو روتی رہتی ہے کیا ورم سے آنکھوں پر جو اتر جاتی تھیں۔"

اماں تو بدیدہ ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر سر اٹھایا اور آنکھوں کی نمی پیچھے دھکیل کر مسکرائی۔

اس مسکراہٹ سے ایک ماں کے دل کو ڈھارس ملی اور دوسری کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ لب کچلنے لگیں۔

"اماں میں اچھی بھلی ہوں، آپ خوامخواہ وہم نہ کریں اور میری زندگی تو سنور گئی ہے وہ مائیں مل گئیں پھر بچے چند سالوں میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں گے، سب اپنوں کی محبتیں ساتھ ہیں، میرا تو اللہ کا شکر ہے دامن محبتوں سے لبریز ہے (بس وہی نہیں ہے جو سب کچھ تھا جس کی فرقت کے صدمے نے آنکھوں سے نیند اور دل کا چین چھین لیا ہے، آنکھوں میں نوحے ہاں، بھروسے کی کرچیاں اور اندھیری راتوں کا درد چھپتا ہے، وہ آتا ہے اماں خدا اب دکھوں کی دلدل سے دور ھی ہے)۔"

"اللہ کا کرم ہے بہت سے لوگوں سے اچھی زندگی عطا کی ہے جیسی بھی ہے شکر ہے اس ذات باری کا۔"

"شاباش یہ ہوئی نا بہادر لوگوں والی بات۔" بھیا، بھابھی کے سنگ بہت سے شاپنگ بیگز اٹھائے لیونگ روم میں داخل ہوئے اور اس کی آخری بات سن کر کھنکھارا۔

باہر لان میں عاشر، احمر، وقاص، حمزہ اپنے تینوں کزنز کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں مگن تھے اور اندر گھر کے لیونگ ایریا میں بھابھی، بھیا، آپ اور ان کے بچوں کے لیے کی گئی شاپنگ دکھا رہے تھے اور ان کی محبتوں پہ ان کی مشکور ہوتی خود کو دن کا مقروض محسوس کرتی وہ جزبز ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

بہت سے دن بے کیف سے گزر گئے وہ دور صحرا میں ریت کے ٹیلوں پہ اپنی رنگینیں بکھیرنے اک سوگوار سی شام اتری اور دشت کے ایک گوشے میں آباد شہر بہاولپور میں پھیلنے لگی، گھر کی طرف قدم بڑھاتے عاشر کے چہرے پر دبے دبے جوش کی سی کیفیت تھی، راستے صحرا کی سمت سے آنے والی خشک ہواؤں سے غبار تھے، شام نے تجسس سے اسے تیزی سے قدم بڑھاتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہو لی۔

"جب...... یہ اتنے سارے روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟" وہ کچن میں شام کو کھانا پکانے میں مشغول تھی، جبکہ تینوں بچے اندر کمرے میں نصاب کی کتابیں کھولے پڑھ رہے تھے کہ امتحانات کا موسم تھا اور عالیہ بیگم مصلے پہ بیٹھی مغرب کی نماز کے بعد نفلوں کی ادائیگی میں مصروف تھیں۔

جب عاشر نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر اس کا رخ محبت سے اپنی اور موڑا اور اس کی ہتھیلی پہ ہرے اور نیلے بے شمار نوٹ رکھ دیے، لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کا دل انجانے سے خدشات سے لبریز ہو گیا، کچن کی کھڑکی کے شیشے سے اس بار باہر شام ٹھہر گئی تھی۔

"ماما! ارے دھیرج رکھیے آپ اتنی جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"مگر یہ جیسے؟"

"سب بتاتا ہوں، دراصل میں جس اکیڈمی میں پڑھنے جاتا ہوں اصل میں، میں وہاں پڑھنے نہیں بلکہ جاب کے سلسلے میں جاتا ہوں، چھوٹی کلاسز کو کچھ مضامین پڑھا کر باقی ٹائم میں کمپیوٹر پہ ان کے سکول و اکیڈمی کے کوئسچن پیپرز ٹائپ کرنے اور ٹیسٹ شیڈول بنانے میں گزارتا ہوں۔" اس نے ماما کو مطمئن کرنے کے لیے مکمل کر وضاحت دی۔

"اوہ!" اس نے بے اختیار سکون آمیز سانس خارج کی۔

"ماما میں جانتا ہوں مہنگائی کے زمانے میں یہ چند ہزار کی معمولی جاب کوئی حیثیت نہیں رکھتی، مگر مجھے فی الحال یہی سمجھ میں آیا، میٹرک کے بعد کیا گیا شارٹ کمپیوٹر کورس کام آ رہا ہے۔"

وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہا تھا، اس کو اپنے لخت جگر پہ ٹوٹ کر پیار آیا محض سترہ برس کی عمر میں وہ اتنا ذمہ دار بن گیا تھا۔

"میری جان! تمہیں ان جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، تم اپنی پڑھائی پہ دھیان دو میں ہوں ناں، پھر کیوں تم فضول میں ہلکان ہو رہے ہو؟" اس کی محبت بھری سرزنش پہ وہ ہلکا سا متبسم ہوا۔

"ماما پڑھائی الحمدللہ بہتر بن جا رہی ہے مجھے اپنے ساتھ بوجھ اٹھانے سے منع مت کیجیے اور ایک دن آئے گا آپ سب کا بوجھ میں خود اپنے کندھوں پہ اٹھاؤں گا ان شاء اللہ۔"

"ہاں مگر بیٹے پڑھ لکھ کر قابل انسان بن جاؤ پھر ساری ذمہ داریاں تمہارا سب ارمان پورے کرنا، اگر تمہاری خوشی اسی پارٹ ٹائم جاب میں ہے تو ٹھیک ہے بیٹے مگر اپنی صحت کا بھی خیال کرو، پڑھائی کے ساتھ کام نے کیسے کمزور کر

دیا ہے میرے بیٹے کو۔" اس نے فرطِ انبساط و فخر سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

شامہ ہولے سے ذرا مسکرائی اور کمرے سے باہر ہٹ گئی۔

☆☆☆

"پھپھو جانی! ماما آپ کو بلا رہی ہیں۔" شرمائی شرمائی سی ملیحہ نے اسٹڈی میں آ کر اسے پکارا۔

"بس دو منٹ۔" وہ تیزی سے بالوں میں برش چلانے لگی۔

"واہ وا! بے تابی تو دیکھو موصوفہ کی۔" عامر نے کپڑے کھنگالتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"کیوں نہ ہو آخر کو 'ساسو ماں' آئی ہیں! آہم!" وہ واشنگ مشین سے کپڑے نچوڑ کر عامر کے آگے ڈھیر کرتا ہوا شوخی سے ملیحہ کو دیکھ کر مخاطب ہوا اور آخر میں مصنوعی سا کھنکھارنے لگا۔

وہ بری طرح جھینپ گئی، گلابی اور سادہ اخروٹ کے شفون کے جدید اسٹائل کے سوٹ میں اس کی رنگت گلاب کی مانند دمک اٹھی تھی۔

بچوں کے امتحانات کا موسم گزر چکا تھا، لہٰذا فراغت کے اوقات ماں کے ساتھ ہاتھ بٹانے میں اسے سکون دینے کی جستجو میں گزارے جا رہے تھے، ملیحہ کو گزشتہ دنوں کسی خاتون نے کالونی میں میلاد کی تقریب کے دوران اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا اور آج اسی سلسلے میں تشریف لائی تھیں۔

"بس تنگ کرو میری بچی کو۔" آنسہ نے ان کی بے تکی باتوں پر جزبز ہوتی ملیحہ کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

"اللہ نصیب اچھے کرے۔" اس کا میک اپ سے مبرا سادہ سا چہرہ دعاؤں کے ہالے میں خاموش دعاؤں کے پھول اس پر نچھاور کیے، جس کہ عامر بھائی نے لفظ آمین دل کی گہرائیوں سے ادا کیا تھا، سادگی میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی، اس نے دل ہی دل میں بلائیں لے ڈالیں۔

"اچھا! پھپھو کو بلانے کے بجائے یہاں چپک کر رہ گئی جب آپ اپنی سیٹ کر رہی ہے ہونے والی ساس جی کو پیش کر دیجئے میں تو اڑی ہوگی۔" جیرو تیز تیز بولتی پھولی سانسوں کے بیچ ملیحہ کو شوخی سے لتاڑنے لگی، اسی کی بات پر ہی اس دیجے وہ شاید بھاگ کر آئی تھی۔

"اف تم نان اسٹاپ بولتی ہو میں بس آ ہی رہی تھی۔" ملیحہ نے پھپھو کا ہاتھ تھاما اور جھٹ سے چل دی۔

"مجھے اپنے انجینئر بیٹے کے لیے ایسی ہی سادہ سی لڑکی کی تلاش تھی، میرے بیٹے میں کوئی کمی نہیں ہے لاکھوں میں ایک ہے، بس آپ جلدی سے ہمارے ہاں چکر لگا کر بیٹے سے مل لیجئے اور ہاں ہی چاہیے کیونکہ آپ لوگوں سے چاند سورج کی جوڑی ہوگی دونوں کی۔"

ملیحہ ذرا ہی جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ہولے سے سلام کر کے انہیں چائے اور دیگر لوازمات سرو کرنے لگی، لڑکے کی ماں اپنی عمر رسیدہ جیٹھانی کے ہمراہ صوفے پر تشریف فرما تھیں، جبکہ اماں اور بھابھی متانت سے مسکرا کر انہیں سن رہی تھیں۔

اتنی طویل گفتگو کے دوران وہ آنسہ کے سلام کا سرسری سا جواب دے کر مکمل ملیحہ پر فریفتہ ہو رہی تھیں، اب جو ذرا ہوش آیا تو اس کا تفصیلی تعارف سے بھرپور انٹرویو ہی لینے بیٹھ گئیں۔

"اچھا تو آپ لڑکی کی پھپھو ہیں۔" انہوں نے چار جٹ کے سادہ سے کرتے سوٹ میں ملبوس سانولی سلونی، اسمارٹ اور سوبر سی آنسہ کو

نظر آئی۔

"آپ یہیں قریب میں رہائش پذیر ہیں یا کہیں دور کے شہر سے آئی ہیں؟"

"کیا کہا! اسٹڈی میں رہتی ہیں؟"

"آپ کے خاوند حیات نہیں؟"

"یہ کیا بات ہوئی آپ یہاں اور وہ دوسرے شہر میں، کیوں بھلا؟" رشتے والی دونوں خواتین مکمل طور پر اس کی سمت متوجہ ہو چکی تھیں۔

بھابھی اور اماں اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر فکرمند ہو گئیں اور جب مریم بھابھی نے مختصر لفظوں میں آنسہ اور ارحم کے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں نہیں مان سکتی کسی کا دماغ تھوڑی نا خراب ہے جو بلاوجہ دوسری شادی کرے۔" ایک نے بیان دیا۔

"زبان چلاتی ہوگی، پھوہڑ ہوگی، جھگڑوں سے تنگ آ کر زندگی میں سکون کی خواہش پر شوہر نے دوسری شادی کر لی ہوگی۔" لڑکے کی والدہ نے از خود ہی تمام اندازے قائم کر کے نتیجہ اخذ کر لیا اور انہیں اپنے مفروضوں کی سچائی پر کوئی شبہ نہ تھا، نہ ہی زبان کی کاٹ پر ندامت۔

ان کے پے در پے الزامات پر وہ بے حد ہراساں سی ہو کر نگاہ جھکا گئی، آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں پر بند باندھنے کی سعی میں جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ اتر آئی۔

حادثوں کی دنیا میں کون کس کو روتا ہے
پار کر کے دکھ اپنے خون دل کا ہوتا ہے
آپ کی نگاہوں میں وہ بھی ہو گئے مجرم
جن کی بے گناہی پر آسماں بھی روتا ہے

"ایسا کچھ نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" بھابھی غصہ ضبط کرتی انتہائی تحمل سے انہیں حقیقت حال سے باخبر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان کی اور بے شمار الٹی سیدھی باتوں پر انہیں بے تحاشا اشتعال آ رہا تھا، وہ اپنی نند کے دفاع میں جانے اور کیا کچھ کہہ رہی تھیں، آنسہ کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا، اس کا دماغ بالکل ماؤف ہونے لگا وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

"چلیں دادو اندر کمرے میں چل کر لیٹیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لوگوں کی فضول باتوں پر دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس ساری صورت حال سے سخت مضطرب ملیحہ ایک دم سے اٹھی تھی اور زرد پڑتی رنگت والی اماں کا چہرہ دیکھ کر اسے فکرمندی کے ساتھ بے تحاشا طیش آیا وہ ان کے ضعیف وجود کو سہارا دے کر اندر کی اور بڑھ گئی۔

"ہائے ہائے، کیسی بدتمیزی کر کے گئی ہے یہ لڑکی، مہمانوں سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔"

"اچھا ہوا پہلے ہی پتا چل گیا کیسے لوگ ہیں توبہ توبہ۔" اس کے لہجے کی نخوت نے ان خواتین کو اور بھڑکا دیا۔

"بس ایک لفظ اور مت کہیے گا، آپ لوگ جا سکتے ہیں ہمیں کوئی شوق نہیں آپ کے ہاں رشتہ کرنے کا۔" مریم بھابھی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، انہوں نے سخت لہجے میں انہیں ٹوک دیا، وہ دونوں منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں، منہ بنائے نخوت سے سر جھٹک کر چلی گئیں، بھابھی تھکے ہارے انداز میں صوفے پر ہی ڈھے گئیں۔

☆☆☆

لان میں بے چینی سے ٹہلتی جیرو نے تحیر سے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ تیزی سے اسٹڈی کی طرف قدم بڑھاتی پھپھو کو دیکھا، پھر مہمان خواتین کے چہرے کا تاثر، اسے کچھ غلط

ہونے کا احساس ہوا تھا وہ بے اختیار ملیحہ کے پاس آ گئی۔ ماما رو رہی تھیں۔ ملیحہ ان کو دلاسہ دے رہی تھی اور ماما بھی سے سب کچھ جاننے کی سعی میں اپیا کو جھنجھوڑ کر دیکھے گئی اور جب اسے تمام واقعہ کا علم ہوا تو سرتا پا سنگ ہو گئی۔

"انہوں نے پھوپھو جانی کے متعلق ایسا کہا، ایک عورت ہو کر دوسری عورت کے درد کی گہرائی کو جاننے کے بجائے اتنی تضحیک اور الزام لگا ڈالے۔"

"میں اگر جن ہوتی تو ان عورتوں کو کچا چبا جاتی، مر جاتیں وہ دونوں میرے ہاتھ سے۔" بڑی بے بسی سے لب بھینچے اس نے تصور ہی تصور میں جیسے ان کو کچا چبا ڈالا تھا۔

"کوئی بات نہیں سوئٹو۔ جن نہیں ہو تو اچھا ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں "چڑیل" تو بنایا ہی ہے ناں۔ ابھی اس کی ناشکری نہیں کرو، تم اب بھی بہت کچھ کر سکتی ہو۔" ملیحہ نے اپنا چھوٹو، برسوں کی بھولی سی بہن کی معصوم سی بات پر سنجیدگی سے اسے پچکارا اور مسکراہٹ دبا گئی۔

"ماما دیکھا آپ نے، ملیحہ آپا نے کیا کہا ہے۔" اس نے ٹھنک کر ایک بہانے ماں سے اپیا کی شکایت کی۔ جن کے لبوں پر ان دونوں کی بے سروپا باتوں سے مسکراہٹ کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ ماحول کا تناؤ کم ہونے پر ملیحہ نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

خلیل جبران کہتا ہے کہ حقیقت میں جو کچھ ہم میں پایا جاتا ہے وہ خاموشی ہے اور جو کچھ ہم نے اپنا دکھایا ہے وہ باتونی پن ہے اور اب اس کے لب بولنے سے قاصر تھے۔ لفظوں کا لبادہ اوڑھنے سے انکاری اور اس کے اندر پائی جانے والی خاموشی نے اس کی ذات کو باہر سے بھی جکڑ لیا تھا۔

عالیہ بیگم نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور کھویا کھویا انداز ملاحظہ کیا۔

"بیٹا پریشان نہ ہو معمولی بخار ہے اتر جائے گا۔" انہوں نے اس کی کیفیت کو اپنی طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے ہوئے تسلی و تشفی سے نوازا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ اس لئے اس پر بیتنے والی قیامت سے بے خبر رہیں اور یہ اچھا ہی تھا کہ ابھی وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس نے چپ چاپ سر ہلا دیا اور بھیگی پلکیں جھپک کر نمی اپنے اندر جذب کر لی۔

مریم بھابھی اور ان کے بچوں کی محبتوں میں بظاہر کوئی بھی بدلاؤ نظر نہیں آیا تھا۔ بلکہ بھابھی نے اس کے نادم ہو کر معافی مانگنے پر الٹا اسے گلے لگا کر دلاسہ دیا تھا اپنی محبتوں کا مان بخشا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔ ان کی اعلیٰ ظرفی کی وہ قائل تھی، لیکن اب ان کا سامنا ہونے پر وہ چور سی بنی جاتی، اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی کولیگز سے کرایہ کے مکان کے لئے کہہ رکھا تھا۔ مناسب کرایہ پر کہیں کوئی مکان ہی بھابھی کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے بچا سکتا تھا اور آنیہ کو ندامت سے۔ لاہور سے کوئی اجنبی عالیہ بیگم کو ڈھونڈتا ہوا ان کے در پر آ پہنچا تھا اور انہیں ان کے بڑے بھیا کی شدید علالت کی خبر اور ملاقات کی خواہش سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنے آپ کو ان کا پرانا شاگرد بتایا تھا اور بڑے بھیا جو کہ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر تھے ان سے موبائل پر بات بھی کروائی۔

اتنے برسوں بعد بھائی کی آواز نے انہیں تڑپا ہی تو دیا وہ فوراً احمر کے ہمراہ اس نوجوان کی معیت میں لاہور کے لئے روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

جاتی سردیوں کے خوشگوار دن کی فرحت بخش ہوائیں صحرا کی سمت سے چل رہی تھیں۔ کبھی ہوا اپنے ساتھ صحرائی مٹی کے سرخ ذرات راستوں پر اڑاتی بہار کی آمد پر مجبور تھی۔ گنگناتی وادیوں پر گردش کر رہی تھی۔

صحرا میں بھی پھول نہیں کھلتے۔ پھر اس کی خوش فہم ہواؤں کا اس شہر میں آ کر سندیسہ بہار سنانا چہ معنی دارد؟ شاید جانے وحشت میں کچھ جگنو ابھی تک زندہ ہیں اور یہ طے ہے کہ جگنوؤں کی لاشیں بہت جلد ریت کی گود میں مدفون ہو جائیں گی۔

غزل کے ساتھ سکول سے واپسی پر گھر کی اور قدم بڑھاتی آنیہ کے وجود پر یاسیت طاری ہونے لگی۔ اتنے دن کی کوششوں کے باوجود کوئی مناسب کرائے کا مکان نظر میں نہیں آ سکا تھا۔ مکان کے کرائے ہوش اڑانے کو کافی تھے۔ اس نے ڈیلر سے رابطہ کر کے کسی گروی مکان کو جلد تلاشنے کی درخواست کی تھی۔

کیونکہ وہ رویوں کے بدلنے سے خائف تھی۔ کہ بدلتے لہجے ہمارے اپنوں کو بھی سرتاپا بدل دیتے ہیں اور وقت کے دیئے زخموں نے اسے سکھایا تھا کہ رشتے موسموں کی مانند ہوتے ہیں ان کی پائیداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا فقط ایک پل لگتا ہے موسم اور لہجوں کے بدلنے میں۔

یونہی لاتناہی سوچوں میں گرفتار وہ تھکے تھکے انداز میں گھر لوٹ آئی۔ جہاں عالیہ بیگم بے تابی سے اس کی منتظر تھیں وہ کچھ دیر قبل ہی احمر کے ساتھ لاہور سے واپس لوٹی تھیں۔ ان کی دی گئی خبر سے وہ حیران پریشاں رہ گئی۔

"مجھے معاف کر دو میری چھوٹی بہن، میں نے اماں ابا کی مخالفت مول لے کر اپنی یونیورسٹی فیلو سے شادی کر لی اور تم سب سے ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ لیا۔ اپنی زندگی میں مگن کبھی مڑ کر تم لوگوں کی خبر نہیں لی۔ اماں ابا مجھ سے خفا ہی چلے گئے۔ بہت برا ہوں اور پر جا کر کس منہ سے ان کا سامنا کروں گا۔" بھرائی ہوئی آواز میں بولتے ہوئے ان کی سانس اکھڑنے لگی۔

"بھیا! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور ہم میں سے کوئی آپ سے خفا نہیں تھا۔ بس وہ وقتی غصہ تھا ابا کا۔ اس کے بعد میں آپ کو یاد کر کے روتے تھے مگر آپ کا کوئی پتا ٹھکانہ نہیں ملا۔" عالیہ بیگم برسوں کی پیاسی نگاہوں سے بڑے بھیا کا نورانی چہرہ تکتی رہیں۔ وہ بے حد نحیف و نزار تھے ہوسپٹل میں سفید بستر پر دراز انہیں دیکھ کر وہ بلک اٹھی تھیں۔ بمشکل وہ ضبط کر پایا تھا انہیں یوں بے بسی کے عالم میں اشکبار دیکھ کر۔

"آپ زیادہ مت بولئے، جب ٹھیک ہو جائیں گے پھر ڈھیروں باتیں کریں گے۔"

"نہیں میری بہن مجھے بولنے دو برسوں سے سینے پر بوجھ لئے پھرتا ہوں۔ کہہ لینے دو۔ تمہیں معلوم ہے ہم میاں بیوی تمام عمر اولاد کو ترستے رہے مگر شاید اماں ابا کے دل کو دکھانے کی سزا ملی۔ میری شریک حیات شادی کے چند سال بعد ہی چل بسی اور میں اپنی تنہائی کے ساتھ جیتا رہا۔ پرانے گھر گیا تو علم ہوا اماں ابا تو کوچ کر گئے اور تمہارا بیاہ ہو گیا اور آج میری تلاش ختم ہوئی ہے۔ میری بہن مجھے مل گئی۔" طویل بات کے دوران ان کی سانس کئی بار ڈوبنے لگی ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ عالیہ بیگم کا حال بھی کچھ الگ نہ تھا۔

اور پھر وہ برسوں کی ندامت کے بوجھ سے ہلکے ہوئے تو مسکرا کر اگلے جہاں چلے گئے۔

جانے سے پہلے اور بہت سی باتوں کے دوران انہی وصیت ان کے حوالے کی تھی جس کے مطابق ان کا ذاتی مکان عالیہ بیگم کے نام کر دیا گیا تھا۔ ساری روداد سنانے کے بعد عالیہ بیگم خاموش ہو گئیں، سب بچے اور آئمہ دم بخود سے ان کی بیان کردہ کہانی سن رہے تھے۔ اللہ نے کیسے غیب سے ان کی مدد کی تھی۔ آئمہ کی نگاہیں اللہ کے حضور تشکر و ندامت سے جھک گئیں۔ دشمنوں کا بھرم قائم رہا اور رہنے کے لئے اپنی چھت میسر آ گئی۔ کون کہتا ہے کہ رب اپنے بندوں سے غافل ہو سکتا ہے، وہ رحیم و کریم ہے اور بندے کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

وہ سب جلد ہی لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ اور اپنی جاب لائف کا آغاز اس نے از سر نو کر لیا تھا۔

☆☆☆

نیلا آسماں سو گیا
آنسوؤں میں چاند ڈوبا، رات مرجھائی
زندگی میں رہ گئی پھیلی ہے تنہائی
جو گزر رہے ہم پر وہ ستم ہے
تمہارے غم کا موسم ہے
یادوں کی وادی میں گونجے جیسے افسانے
ہمسفر جو کل تھے اب ٹھہرے وہ بیگانے
محبت آج پیاسی ہے
بڑی گہری اداسی ہے
نیلا آسماں سو گیا

رات کی آغوش میں سر رکھے نیل گگن سو رہا تھا جون کے گرم مہینے کی آخری تاریخوں کا زرد چاند اس کے افقوں میں بکھرا اور دھندلا گیا تھا۔ آج اسے ارحم سے جدا ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ رات کی تنہائی میں اداسی کا ہاتھ تھامے وہ ماضی کے شہر میں ہر گام پر بکھری یادوں کی مسافت طے کرتے میں ہلکان ہوتی کسی منزل کے شہر میں اچانک در آنے سے اس کی سوچوں میں خلل پڑا تھا، وہ اسے چونکنے لگی۔ ماضی کے سفر کی تھکان اس کے رگ و پے میں اتر آئی تھی۔

نجانے کب کے پڑھے ہوئے اقوال اور شعر اسے یاد آئے ساتھ ہی ان سے جڑے اختلاف کے ہزار پہلو۔

"ارحم! آپ تو میرے تھے، آپ نے کیسے راہ بدل لی، کیوں کیا ارحم، کیوں کیا ایسا!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی گرنے لگے۔

موذن کی آواز نے اس کے ڈوبتے دل کو ذرا تقویت دی، معمول کے انداز میں وہ اپنے وجود کی بکھری کرچیوں کے سنگ اٹھ کر مصلے پر ذات باری تعالیٰ سے ہمت حوصلہ مانگتی رہی۔

خلیل جبران کہتا ہے کہ جب تم رو رہے ہوتے ہو تو تمہاری روح تمہیں عبادت پر اکساتی ہے اور بار بار اکساتی ہے حتیٰ کہ تمہارا رونا ہنسی میں بدل جاتا ہے۔ اس کی روح پر بھی سکون کے چھینٹے پڑنے لگے تھے اور بکھرا وجود سمٹ کر دل کی مسافت کے لئے نئے سرے سے تیار تھا۔

زندگی مخصوص ڈگر پہ رواں دواں ہو گئی تھی، وقت کا پہیہ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ وہ بہاروں کی ایک اداس سی دوپہر تھی، آئمہ لان میں کھلی دھوپ سے بچ کر ادھر چھاؤں میں سنگھار کے پھولوں سے لدے درخت کے نیچے کرسی ڈالے بیٹھی تھیں اور ٹیوشن کے لئے آئے بچوں کو پڑھانے میں منہمک تھیں۔

گزرے دو سال نے ان کے چہرے پہ تھکان کی صورت گہرے نقوش ثبت کئے تھے، آنکھوں پہ پڑے حلقوں کے اوپر سفید کیشوں والے نفیس اور سنہری فریم کا چشمہ دھرا تھا۔ آم، آلو بخارا، فالسہ، لیموں کے پیڑ پودے سے لدے

ہوئے تھے جبکہ ارد گرد کی کیاریوں میں قطار در قطار کھلے گلاب، موتیا، گیندے، چمپا، کاسنی اور چنبیلی کے پھول ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ فضا میں چڑیاں، کوے، طوطے، مینا کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔

آفتاب گھاس کاٹنے والی مشین سے لان کی گھاس کاٹنے میں مشغول تھا، جبکہ احمر، مزمل کو میتھ کا ایک سوال سمجھانے میں لگا ہوا تھا۔

"ارے اسے انگوائی دکھ رہی ہے، اوئے دیکھو تو دھوپ کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا نہیں جا رہا۔" عالیہ بیگم قریب ہی چارپائی پہ اونگھ رہی تھیں جب ذرا نیند ٹوٹی تو درد کی دہائی دینے لگیں۔

"مامی! آپ سے کتنی بار درخواست کی ہے آپ کی آنکھ میں روشنی چبھتی ہے آپ اندر کمرے میں آرام کریں، مگر آپ اپنی من مانی کرتی ہیں، سورج کی روشنی میں لیٹنا ہے اور دھوپ کی طرف بھی دیکھنا ہے۔" آئمہ کے انداز میں ان کے لئے فکر مندی اور بے بسی سی جھنجلاہٹ تھی۔

"تم جانتی تو ہو میرا دل تنہا بیٹھنے سے گھبراتا ہے، تم سب کے بنا اندر نہیں لگتا ہے، جہاں تم سب وہاں میں۔" انہوں نے بے بسی سے عذر بیان کیا، ان کی بات بیچ میں رہ گئی اور خاموشی سے بچوں کی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئیں ابھی ڈور بیل کی اطلاعی گھنٹی بجی تھی، مزمل نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم!" دور سے ہی سلام جھاڑتی ہنستی مسکراتی دوڑ کر آئمہ سے لپٹ گئی، چلتی ہوا کے جھونکے نے ان دونوں پہ ہار سنگھار کی شاخیں ہلا کر پھول نچھاور کئے تھے جبکہ اماں گیٹ پہ ہانپتی کانپتی اپنے نحیف وجود اور اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

وہ سب مسکرا کر ان کے استقبال کو بڑھے جبکہ عبیرہ، عالیہ بیگم سے ملنے میں مصروف ہو گئی۔

"توبہ توبہ اس عمر میں اتنا سفر، ہائے یہ لڑکی میری جان لے کر چھوڑے گی۔" اماں کے واویلے جاری تھے، عبیرہ کھلکھلا اٹھی۔

"ذرا دو فکر نہ کریں آپ ابھی مزمل کی شادی تک زندہ سلامت رہیں گی۔" اس نے 9th کے طالب علم مزمل کے شرارت سے بال بکھیر ڈالے۔

"اماں آپ پہلے سانس درست کریں یہاں بیٹھ جائیں۔" آئمہ نے انہیں چارپائی پہ بٹھا دیا، احمر بھاگ کر پانی لے آیا۔

"ارے بھابھی آپ کی دائیں آنکھ میں کیا ہوا ہے؟" ان کی سرخ متورم آنکھ دیکھ کر حواس بحال ہوتے ہی انہوں نے استفسار کیا۔

"بس آپا! کافی دن سے دکھ رہی ہے، ٹھیک سے نظر نہیں آتا، پانی نکلتا ہے، آنکھ کے ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس نے ڈراپس دیے ہیں، ابھی تو فرق نہیں پڑا۔" عالیہ بیگم نے تفصیل فراہم کی اور ان کا حال احوال جاننے میں لگ گئیں۔

"پھپھو جانی میں اتنے دنوں سے آپ سب کو یاد کر رہی تھی، بابا کو ٹائم نہیں ہے، ماما انہیں اکیلے چھوڑ کر نکلتی نہیں، بہت محبت والی بیوی ہیں نہ، باسل بھائی ایم بی اے کر کے ڈگری لئے بنا امریکہ سے نہیں آنے والے، تو ماورا کو ہی ہمت دکھانی پڑی ہے اور آپ کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے اپنی ماں سے، دیکھیں نا واللہ جی مجھے کتنا ثواب دیتے ہوں گے۔" وہ تمام اسباب اپنے مخصوص چلبلے انداز میں بولے جا رہی تھی۔

"بہت اچھا کیا تم یہاں آ گئیں، پیپر کیسے ہوئے تمہارے؟" وہ اس سے بی اے کے امتحانات کی تفصیل کریدنے لگیں۔

"احمر بھائی آپ کے بی کام کے پرچے کیسے رہے؟" اس کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا گلاس لے کر استفسار کیا۔
"الحمدللہ اور میں نے پہلے بھی تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں تم سے سات دن بڑا ہوں، سات سال نہیں، جو بھائی کا لاحقہ استعمال کرتی ہو۔" اس کی بات کا جواب دے کر اس نے کڑے تیور دکھائے، پھپھو اور وہ ہنس دیں۔
"بھئی جو کہہ لیں، مگر آپ بڑے ہیں تو بھائی ہی کہوں گی، ہاں میں بہت باادب تمیزدار قسم کی بچی ہوں۔" اس کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آنیہ ان کی نوک جھونک سے واقف تھی اسی لئے پھر سے بچوں کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔
"ہاں سب سمجھتا ہوں تمہاری چالاکیاں۔" احمر نے اس کی پونی ٹیل کھینچی۔
"احمر بدتمیز! تمہیں عزت راس نہیں آتی، تم کبھی نہیں سدھرو گے۔" اس کی حرکت پر وہ فوراً اپنے اصل انداز میں اس سے مخاطب ہوئی، آفاق اور مزمل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔
"ہاں لگتا ہے آج بہت دن کے بعد تم دونوں نے ٹوتھ برش سے دانت چمکائے ہیں جو باہر نکل رہے ہیں، دانت اندر کر لو ورنہ گر جائیں گے۔" ان تینوں کو ہنستا دیکھ کر اس نے مصنوعی ڈانٹ پلائی۔
"کیا ہوا بھائی، بھائی والا ادب احترام سب ختم، تم تو گرگٹ سے زیادہ جلدی رنگ بدلتی ہو۔" احمر مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا، بہاروں کی رت چلتے چلتے ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگی تھی، پھول مسکرا کر لہرانے لگے تھے، پرندے خوشی سے گیت گانے لگے تھے۔
"اور دوست، تم دیکھنے میں اچھا ہمر سے زیادہ بڑے لگتے ہو بھائی نہیں کہوں گی تو پھر سب نمونوں کے بیچ مجھے جانے کتنا برا محسوس کریں گے۔" اس نے منہ بسورا، اس کی بات پر سب حاضرین ہنس پڑے۔
"تمہارے یہ گھسے پٹے ڈائیلاگ ہاں، اب بچوں کو زبانی یاد ہو گئے ہیں ان کے سامنے ہر بار ایسے ہی ڈرامہ کرتی ہو پھر اس کا ڈراپ سین، سب بچے جانتے ہیں تم مجھ سے سات دن چھوٹی ہو اور میں اب بیس سال کا ہو جاؤں گا۔" اس بات پر سب بچے ہنس پڑے اور وہ اس کے کھلے عام جھوٹ پر رد عمل کے سبب ہونق ہوتے ہوتے رہ گئی۔
"جاؤ میں نہیں بولتی اور آفاق میاں یا ہی بن کے گدھے کی طرح گھاس کھاتے رہتے ہو یا کالج کی پڑھائی بھی ہو رہی ہے؟" اس نے احمر کو مکمل نظر انداز کر کے روئے سخن آفاق کی جانب موڑا۔
"گدھا گھاس نہیں کھاتا۔" مزمل نے تصحیح کی۔
"میں بھی گھاس نہیں کھاتا۔" آفاق کی سادگی سے دی گئی وضاحت پر سب ہنس پڑے، آنیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
"اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں گدھا ہوں۔" اس کے گڑبڑانے پر دیر تک ہنسی رہی اور وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کے فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا۔
"اچھا گائز میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے شاگرد انتظار کر رہے ہوں گے۔" احمر معذرت کرتا اٹھ گیا وہ فزکس اکیڈمی میں جاب کرتا تھا۔
"تم پہلے میتھ کے دو سوال حل کرو جو میں نے سمجھائے ہیں پھر ٹینشن کے ساتھ کھیل میں مگن ہونا اوکے۔" جانے سے پہلے اس نے مزمل کو تنبیہ کی تھی جس پر وہ برے برے منہ بناتا ماما کے پاس کتابیں لے کر بیٹھ گیا، وہ جانتا تھا پڑھائی کے آگے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا اس گھر کے اصولوں میں پڑھائی سب سے پہلے ہے۔
"پھپھو! ماما، ملیحہ آپی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔" شام کو کچن میں باتوں کے دوران اچانک یاد آنے پر اس نے انہیں مخاطب کیا۔
"جی اللہ کا شکر ہے وہ اپنے سسرال میں شوہر کے ساتھ خوش و خرم ہیں، ان کا بیٹا اشعر ماشاءاللہ دو سال کا ہو گیا ہے، اس کی سالگرہ کی تصاویر میرے موبائل میں ہیں، میں دکھاؤں گی۔" پھپھو کے خیریت دریافت کرنے پر اس نے تفصیلاً جواب دیا۔
"اللہ ملیحہ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے آمین۔" آنیہ نے دل سے دعا دی اور چاول تل کے نیچے رکھ کر بھگو دیے، جبکہ جویریہ ابلی کے لئے مصالحہ بھون رہی تھی، بھنائی تقریباً تیار ہو گئی تھی، ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی، جب عاشر نے کچن میں قدم رکھا۔
"اخاہ مس جویریہ کی سواری باد بہاری ہمارے ہاں اتری ہوئی ہے۔" اس کے سلام کا جواب دے کر اس کی شان میں قصیدہ گوئی کی، ماما نے محبت سے اسے دیکھا، اونچا لمبا، چھ فٹ قد، بے حد وجیہہ صورت کا حامل ان کا بیٹا ہو بہو ارحم کی جوانی کی منہ بولتی تصویر تھا۔
"اللہ میرے بچے کو زندگی میں ہر رشتے سے وفا کرنے کی توفیق دینا آمین۔" انہوں نے کسی بیتے لمحے کے سائے کے زیر اثر صدق دل سے دعا کی اور بغور اسے دیکھا، ان کا بے حد سنجیدہ فرمانبردار اور سب کا خیال رکھنے والا بیٹا جب اس بہاروں جیسی لڑکی کو دیکھتا تھا اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھتے تھے اور اپنے خول سے باہر نکل آتا تھا۔
"جی کیونکہ آپ کی سواری کا رخ ہمارے شہر کی جانب ہونے سے رہا لہٰذا ہم نے سوچا ہم ہی پھپھو کے آنگن میں اتر کر ان کے ہو لیں، ویسے بھی لیکچرر شپ میں تعطیل سے معروف فرزند کا دیدار کر آئیں۔" پتیلی میں سے چکن کی بوٹیاں نکال کر مصالحے میں شامل کر کے بھنائی کرتی جویریہ نے شان بے نیازی سے اپنی تقریر کا اختتام کیا، عاشر کے ساتھ ماما بھی مسکرانے لگیں ان دونوں کو دیکھ کر ان کے اندر ایک دیرینہ آرزو جاگ اٹھی تھی۔ عاشر کو عالی نے ہی ایم ایس سی کیمسٹری کے بعد مقامی کالج میں لیکچرر شپ کی تھی اور دوپہر میں ایک اکیڈمی میں پڑھاتا تھا۔
"ہاں بہت اچھا کیا جو آپ کے مبارک قدم ہمارے گھر تشریف لائے کچن کی قسمت پھوٹے بہت عرصہ ہو چلا تھا۔" اس کی زبان میں کھجلی ہوئی۔
جویریہ نے لڑاکا عورتوں کے اسٹائل میں ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر اپنی ستارا سی آنکھیں سکیڑ کر اسے خشمگیں انداز میں گھوری سے نوازا اور پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔
"پھپھو جانی ان سے کہہ دیجئے کہ میری اتنی اچھی کوکنگ کا مذاق اڑا کر "ہائے" نہ کھینچیں ایسا نہ ہو بڑے بڑے بدذائقہ کھانے بنانے والی بیگم مل جائے، پھر پوچھوں گی۔" اس کی دھمکی پر عاشر کا قہقہہ بے ساختہ تھا، ایک عرصہ بعد گھر کے در و دیوار نے اس کی ہنسی سنی تھی، ہواؤں نے لان میں کھلے پھولوں تک یہ خبر پہنچائی تو وہ فرط مسرت سے جھومنے لگے، شام بھی ہولے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کے باہر ہاسپٹل کے کاریڈور میں وہ، مضطرب سی مسلسل قرآنی آیات اور وظائف

دعاؤں کو زیر لب دہرانی چہرے پہ تفکر آمیز تاثر لیے ٹہل رہی تھی۔ ممانی کی آنکھ کی بینائی دن بدن دھندلائی جا رہی تھی، ان کی آنکھ کی جھلی پہ زخم تھے علاج معالجے سے افاقہ کے بجائے صورت حال اور بگڑتی چلی گئی اب یہ حال تھا کہ جھلی سکڑ کر آنکھ کی بصارت کے مقام پر جھک گئی تھی اور بینائی بچانے کے لیے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مودود عامر کے ساتھ یہاں موجود تھیں احمر کو بکر وہ کل ہی انہوں نے گھر بھیجا تھا کہ وہاں امی جو دو جبیرہ اکیلی تھیں۔ آفاق اور مزمل سکول کالج سدھارے ہوتے تھے وہ ہی وہ خود تو انہیں ویسے بھی عامر کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر سکول کی ڈگری بھجوڑے ایک ماہ ہو چلا تھا ہاں ٹیوشن پڑھانا انہوں نے جاری رکھا تھا کہ زندگی میں اس مصروفیت سے محرومی کا احساس رہتا تھا، ورنہ موسموں، ہواؤں کے رخ اور تہواروں پہ دھیان دیے مدت گزر گئی تھی۔

"وہ احمر کا موبائل تو میرے پاس ہی رہ گیا۔" ان کے پاس بیلنس نہیں تھا تو اس کے نمبر سے ہی پی سی او والے دوست کو ایزی لوڈ کروانے کے لیے کال کی اور جلدی میں دادی کی پریشانی میں وہ اسے واپس دینا بھول گیا۔

"وہ ابھی ٹیکسی ہوگا میں اسے دے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سرعت سے پلٹا تھا۔

"تم یہاں رکو، تم صبح سے یہاں سے وہاں بھاگتے اپنی دادی کے آپریشن کے لیے انتظامات میں ہلکان ہوتے رہے ہو، میں اسے موبائل دے آتی ہوں۔" اس کی ناں، ناں کو نظر انداز کر کے سیل فون ہاتھ میں لیے وہ قدم بڑھا گئیں۔

کوریڈور مڑتے ہی ایک اور کوریڈور کی حدود شروع ہوتی تھیں، دونوں جانب پڑے بنچوں پر مردہ خاموشی، بچے، بوڑھے پر بچی ہاتھ

میں سے لیے [illegible] کے روم سے باہر دو ٹوٹ کر دور مریضوں کے طور پر اپنی باری کے انتظار میں تھے۔ فضا میں مختلف آوازوں کا ہلکا سا شور تھا۔ ایک قطار میں رکھے دائیں طرف کے بنچوں کی قطار کے پیچھے جالی دار کھڑکیوں سے پیچھے ہوسپٹل کے لان میں مریضوں کے لواحقین اور دھوپ کا بسیرا تھا۔ ایک بری طرح سے کھانستا ہوا شخص ان سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلا تھا اور مسلسل کھانسی سے دہرا ہوتے ہوتے اوندھے منہ گر پڑا، دو چار لوگ اسے اٹھانے لپکے تھے، انسانیت کے ناطے انہوں نے اک ترحم بھری نگاہ ڈالی۔

"نجانے کون ہے بیچارا۔" سرسری نگاہ ڈال کر گزرنا ہی چاہتی تھیں کہ اک نامعلوم سے احساس نے ان کا دل مٹھی میں بھینچ لیا، پاؤں آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے رنگ فق ہو کر پلٹی تھیں۔

"ارحم!" ان کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

میلا سا شلوار سوٹ، بڑھی ہوئی شیو سر اور داڑھی کے سیاہ بالوں میں سے جا بجا سفید بال جھانک رہے تھے۔

سفید رنگ سنولا کر زرد پڑ چکا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، صحت مند بھرے بھرے گالوں کی بجائے پچکے ہوئے گال بے حد نمایاں تھے، لاغر وجود، ایک پل کے لیے انہیں اپنی بصارت پر شک کا گمان ہوا، یہ وہ ارحم تو نہیں تھا، یہ ارحم ہو ہی نہیں سکتا تھا کہاں وہ اپنے لباس اور منصب کو لے کر ہمیشہ ہی بن ٹھن کر نفیس حلیے میں رہنے والا شخص، کہاں یہ اپنی ذات سے لاپرواہ میلے سے شکن زدہ شلوار سوٹ میں ملبوس لاغر وجود۔

انہوں نے سر جھٹک کر اپنے دل میں رحم توڑ دو، سسکتی، بلکتی درد کی صورت جلوہ گر اس کی

محبت کے ہر بڑھتے خیال کو جھٹکتا جا رہا تھا لیکن چرائی ہوئی اس کے وجود پہ جمی آنکھوں میں آئی نمی نے اس خیال پر یقین کی مہر ثبت کر دی۔

وارڈ بوائے کی مدد سے اس کے بے ہوش جسم کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

"میں نے ابھی اس پیشنٹ کو سمجھایا تھا کہ اسے مکمل علاج کی ضرورت ہے اس کا یہاں ایڈمٹ ہونا بہتر ہے مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔" وارڈ بوائے کی اطلاع پر ڈاکٹر صاحب کوفت زدہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے باہر آئے اور ایمرجنسی وارڈ کی جانب بڑھ گئے۔

وہ پتھر کے بت کی مانند سن ہوتے وجود کے ساتھ دیوار سے لگی بے آواز آنسو بہاتی رہیں، ان کے دماغ میں ان گنت سوالات مچل رہے تھے اسے اس شہر میں ایسی حالت میں دیکھ کر وہ بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی ساکن کھڑی تھیں، وہ اس کی بے وفائی و ناروا رویے کے باوجود نجانے کیوں وہ اس سے نفرت نہیں کر پائی تھیں، مگر اس کا سامنا بھی تو نہیں کرنا چاہتی تھیں، وہیں اپنا جدا رہ بہر حال عزیز تھا، لیکن اس ایسے عالم میں چھوڑ کر جانا بھی گوارا نہ تھا۔

وہ اپنے تھکے وجود کو گھسیٹ کر ایمرجنسی روم کے باہر آ کر بنچ پر بیٹھ گئیں، ان کے ذہن سے یکسر محو ہو چکا تھا کہ وہ کس کام سے یہاں سے گزر رہی تھیں یا امی کی آنکھ کا آپریشن جاری ہے، دھیان میں بس ایک ہی شخص، ایک ہی نام تھا، ارحم اس کے سوا ساری دنیا کو فراموش کر چکی تھیں، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی سلامتی و تندرستی کی دعائیں ان کے لبوں کو چھونے لگیں۔

"ڈاکٹر صاحب! اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟" اسے آکسیجن اور سکون آور انجکشن لگا کر وارڈ میں شفٹ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے جب ڈاکٹر صاحب باہر نکلے تو انہوں نے بے اختیاری میں تیزی سے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

"آپ ان کے ساتھ ہیں؟ آیئے میرے ساتھ۔" انہوں نے لحہ بھر کو ٹھٹک کر سیاہ چادر میں ملبوس خاتون کو دیکھا اور ان کی خاموشی سے نتیجہ اخذ کر کے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا۔

کھڑکی کی جالیوں سے چھن چھن کر آتی گلابی دھوپ ان کے گم صم وجود اور چہرے پر چھائی گہری سوچوں کے جال کا احاطہ کیے ہوئی تھی، وہ سایوں کی مانند ارد گرد سے گزرتے مریضوں کو ادھر سے ادھر حرکت کرتے دیکھ رہی تھیں اور سماعتوں میں آتی ملی جلی آوازوں کو بھی بے معنی دستک کی سی میں غلطاں و پیچاں تھیں، بیداری سرتے ہی عاشر کی نگاہ نے انہیں جا لیا، انہیں دیکھ کر نا جانے کیوں اس نے بے اختیار سکون کی سانس خارج کی۔

"نانا!" اس کے قریب آ کر مخاطب کرنے پر بھی جب ان کے وجود میں حرکت نہ ہوئی تو اس نے فکر مندی سے ان کا کندھا ہلایا۔

"آں، ہاں۔" وہ بے حد چونک کر ایکدم سے اسے دیکھنے لگیں جیسے پہچاننے کی جستجو میں ہوں۔

"نانا آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ کیا ہوا احمر نہیں ملا تھا اور آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، آپ رستہ بھول گئی تھیں؟" اس نے بے قرار لہجے میں کتنے سوال ایک ساتھ کر ڈالے ان کے گئے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا مجبوراً وہ متفکر ہو کر ان کو تلاشنے نکل پڑا۔

"میں... میں ٹھیک ہوں، شاید کہیں دور گم ہو گئی تھی، تم آ گئے ہو چلو واپس چلتے ہیں۔" شعور

سے وحشت بحال ہوا تو تھکن آلود سانسوں کے درمیان انہوں نے مجھے خود کلامی کی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عاشر نے بمشکل ان کی سرگوشی سنی اسے وہ کہیں سے بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں، مگر وہ ان کی حالت کو دادی کی پریشانی پر محمول کرتے ہوئے ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کیے اور چل پڑا۔

☆☆☆

پوچھتے ہو نا!
تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں جو تجھے لکھ بھیجیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
تو نے پوچھا ہے مگر کیسے بتائیں تجھ کو
کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
کبھی چہرے، کبھی آنکھوں سے جھلک جاتا ہے
جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے!!

وہ بے حد سنجیدگی سے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مشغول تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی ذات پر چھائی غیر معمولی خاموشی گھر کے سبھی نفوس کو چونکانے کا باعث بنی تھی، اپنے طور پر ہر کسی نے کریدنے کی سعی کی اور کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اپنے تئیں دلاسے دیے، بہلانے کی تگ و دو میں پیش پیش تھے۔

امی کی آنکھ کی پٹی کھل چکی تھی، مگر احتیاط کے پیش نظر ابھی کچھ دن کے لیے آنکھ دھوپ، ہوا اور روشنی سے محفوظ رہنے کے لیے ڈال دیا تھا ان کو ڈیڑھ دن آپریشن کے بعد ہی ڈسچارج کر دیا گیا

تھا! ہاں [illegible] بچی [illegible] ادا کر کے جالی دی تھی۔

موسم میں ہلکی سی حدت کا احساس نمایاں ہونے لگا تھا، مگر ساتھ میں چلتی ہوا فرحت سے بھرپور تھی۔

امی اور اماں دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کر رہی تھیں، عبیرہ کچھ دیر ان دونوں کے خراٹے سنتی رہی پھر منہ لٹکائے باہر نکل آئی یوں بھی اسے دوپہر کو نیند نہیں آتی تھی۔

عاشر لان میں چیئر پر براجمان سامنے رکھی ٹیبل پر جھکا کل کے لیکچر کے نوٹس بنانے میں مصروف تھا، قریب ہی چارپائی پر کتابیں بکھیرے احمر ولٹ سے پیشتر ایم بی اے کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں لگا ہوا تھا، جبکہ آفاق حسب معمول پودوں کی تراش خراش میں مگن تھا اور مزمل کتاب کھولے اونگھ رہا تھا۔

عاشر سب پر اک نظر ڈال کر وہ دھم سے چارپائی پر آ بیٹھی۔

"اٹھ گئیں تم۔" پھوپھو جانی نے یونہی اسے مخاطب کیا۔

"کیا تو آپ سب کے اصرار پر مروت میں سونے کی کوشش میں تھی اب حبس کے باعث نکل آئی۔ کیا پھوپھو آپ اتوار کے دن تو ننھے بچوں پر ظلم نہ کیا کریں ان کو بھی عیش کرنے دیں تھوڑی۔" حالانکہ وہ جانتی تھی بچوں کے سکول ٹیسٹ کی بدولت انہیں آج بلوایا گیا ہے مگر ماحول پر چھائے سکوت کو توڑنے اور درد دل چھپا کر رکھنے والی اپنی پھوپھو کا دھیان بٹانے سب کو بہلانے کی غرض سے وہ یونہی بے وجہ کچھ نہ کچھ ہانکتی رہتی تھی۔

"وہ دیکھیں بیچارے مزمل کا کیسا اتنا سا منہ نکل آیا، ہائے معصوم سی جان پر اتنا ظلم۔" اس

نے بچے کو معصوم سی وحشت آمیز بتایا۔

ہار سنگھار کے درخت پر کھلے پھولوں کے گچھوں سے لدی شاخوں پر بیٹھی چہچہاتی چڑیوں نے یکدم بہت سا غل غپاڑہ مچایا اور اڑ گئیں، ہوا کے جھونکے نے بہت سے پھول گرا کر پر موجود ان کے وجود پر گرا دیے۔

وہ عبیرہ کی بات پر ہولے سے مسکرا دیں، جبکہ مزمل چونک کر مظلوم سی شکل بنا کر بیٹھ گیا۔

"اف ہاں بچے دنیا بہت ظالم ہے کوئی ترس نہیں کھانے والا پڑھ لے بیٹا، تاکہ جلد گلو خلاصی ہو اور "بابا بہادر پودوں کی سرکار" تیرے ساتھ کھیل سکے۔" اس کے درویشانہ اشغال میں ایک ہاتھ اٹھا کر مضحکہ خیز انداز میں مزمل کو بھگا دینے پر سبھی کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

"بے ایمان ہا ہے تم بس سکوں۔ ترس کھانا، وہ دیکھو ننھی سی بچی ہے شاید بمشکل تین سال کی ہوگی کیسے پتھر دل والدین ہیں اتنی سی جان پر تعلیم کا بوجھ لاد دیا، مجھے تو ترس میں ترس آ رہا ہے۔" احمر نے بات مذاق کے رنگ میں کہی تھی، مگر اس کے زیر اثر سب نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں نظر دوڑائی، وہ واقعی ایک بے حد خوبصورت سی گلابی رنگت اور بھولے بھولے گالوں والی بچی تھی، جو آنٹی کو کاپی پہ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر دکھانے آئی تھی اور کاپی چپل گھاس پر پھینک کر اس کی گود میں گرتے پھول بے حد اشتیاق سے قلقاریاں مارتے ہوئے اٹھانے اور پھر معصومیت اداسے اسے دکھانے میں لگی تھی، عبیرہ کو بے اختیار اس پر پیار آیا، آفاق بھی کانٹ چھانٹ چھوڑ کر چلا آیا، آنٹی مسکرا کر اسے گود میں بھر چکی تھیں۔

"ارے یہ گڑیا پڑھنے تھوڑی آئی ہے یہ تو بس ایسے ہی ہمدانی صاحب کے مالی بابا کی

بیٹیوں کے ساتھ چلی آئی۔" ہمدانی صاحب ان کی لائن میں تیسرے گھر میں رہتے تھے ان کے مالی بابا کی بیٹیوں کو ماما فری ٹیوشن دیتی تھیں۔

وہ اور آفاق اشتیاق آمیز دلچسپی سے اس کے گالوں کو چھو رہے تھے جبکہ وہ کھلکھلا اٹھی، عبیرہ نے اسے اپنی گود میں لینے کی کوشش کی مگر وہ رخ موڑ کر آنٹی سے لپٹ گئی۔

"تمہاری شکل اسے پسند نہیں آئی ڈر گئی بچاری۔" احمر کو موقع مل گیا اسے تنگ کرنے کا، اس کے کہنے پر سبھی ہنس دیے۔

"جی نہیں میری اوٹ میں سے تمہارا نظر آتا چہرہ دیکھ کر ڈر رہی ہے۔" اس نے ادھار چکایا۔

"ہمارا حسن اچھے اچھوں کو یونہی مدہوش کر دیا کرتا ہے۔" وہ اترانے لگا عبیرہ سمیت سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اللہ رے خوش فہمی۔" وہ سر جھٹک کر بچی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"حمنہ۔" جواب بچی کے بجائے مالی بابا کی بڑی بیٹی نے دیا تھا۔

"یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟" دونوں کے رنگ روپ شکل صورت میں بے حد تفاوت تھا جبھی اس نے یہ سوال کیا۔

پھوپھو جانی نے اس کے گال پر بوسہ دے کر اسے اتار دیا اور بچیوں کی کاپیاں چیک کرنے میں لگ گئیں، مگر حمنہ عبیرہ کے بجائے احمر کی طرف لپکی تھی اور چارپائی سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگی۔

"باجی یہ ہمارے صاحب کے مہمان کی بیٹی ہے، وہ آؤٹ ہاؤس میں رہتے ہیں جی، اب کافی دن سے وہ کہیں چلے گئے ہیں جی تو اس کو سنبھالنے کی ڈیوٹی صاحب جی نے ہمارے ذمہ سونپا ہے۔" اس نے سبق کی طرح فر فر تفصیل

بتائی۔

"دیکھیے مسٹر یہ خوبصورت بچی، صرف خوبصورت لوگوں کے پاس ہی جاتی ہے۔" احمر نے اپنے پاس کھڑی بچی کو اٹھا کر بانہوں میں لیا اور پیار کر کے چاکلیٹ تھما کر اتار دیا، اس نے اس کی بھنبھناتی ان سنی کر دی۔

"کیسے ماں باپ ہیں اتنی سی بچی ایسے کسی کے حوالے کر کے گئے ہیں۔" اس نے پھپھو جانی سے اپنا خیال شیئر کیا۔

"وہ اس کی ماما نہیں ہیں، بابا ہیں بس جدا ہو گئی کوئی مجبوری۔" وہ شاید پہلے ہی تمام معلومات اکٹھی کر چکی تھیں جبھی اسے آگاہ کیا تھا۔

"اوہ۔" وہ تاسف میں سر ہلا کر رہ گئی۔

اب وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتی نرم گلابی ہاتھوں سے عاشر کو اپنی سمت متوجہ کر کے چاکلیٹ ریپر کھولنے کا مطالبہ کر رہی تھی، اس نے اپنے فون سے سر اٹھا کر نرم سی مسکراہٹ سے اسے چاکلیٹ کھول کر تھما دی، عبیرہ بے حد غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے! آپ دونوں کے نین نقش میں بے حد مشابہت ہے۔" اس نے با آواز بلند قیاس کیا، سب ہی نے چونک کر تائید کی تھی۔

"یہ تو آپ کی بیٹی لگ رہی ہے عاشر بھائی۔" اس نے رائے دی۔

"ہاہا ٹھیک یہ تم دو پرو، میرے حسن کی تعریف کر رہی ہو۔" وہ کہاں کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔

"میں..... نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" وہ مزید ای سب کی ہنسی سے وہ بے حد جھینپ گئی تھی۔

☆☆☆

دعا میں لب پہ سوال رکھنا
...، میں اپنی کمال رکھنا
دینا چاہتے ہو اگر خوشیاں ہمیں
تو خوش رہنا اور اپنا خیال رکھنا

اس نے شعر کے اختتام پہ تمام حاضرین پہ اک نظر ڈالی۔

"واہ واہ۔" احمر تالیاں پیٹ پیٹ کے سر دھننے لگا۔

کل صبح اس کی روانگی تھی، کھانے سے فراغت پا کر وہ سب لان میں نکل آئے تھے جہاں آفاق اور عزل نے ڈھیروں ڈھیر ننھے دیے جلا کر روشن کر رکھے تھے، مقصد آج اس کے ساتھ وقت بتانے اور ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے کا تھا، وہ لوگ ہمیشہ سے اس شہر میں اس کی آخری رات کو خاص اہتمام کرتے تھے، سردیاں ہوتیں تو لیونگ روم میں کوئلے دہکا کر اس کے گرد بیٹھ کر خشک میوہ، چائے کے ساتھ بے شمار لطائف، اشعار، گانے ایک دوسرے کو سنائے جاتے، گرمیاں ہوتیں تو بھی ساری رات لان میں مختلف کھیل کھیلے جاتے، یا پھر شاعری کی محفل جمتی جو زیادہ تر ان کی نوک جھونک کی نذر ہو جاتی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے پھپھو جانی اور ماموں کا خیال رکھنے، پڑھائی میں دل لگانے، اچھا انسان بننے کی ڈھیروں نصیحتیں کی تھیں اور سب کے لیے شعر سنایا تھا اور اس کی تعریف کے دوران حاضرین سونے کی ایکٹنگ کرنے لگے تھے اب احمر خراٹے اور ایکٹنگ میں لگا تھا۔

"بس میرے بھائی اپنے جذبات پہ قابو رکھو۔" عاشر نے تالیاں بجاتے احمر کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"کیا کروں بھائی اتنی خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہائے میرا دل، عبیرہ تم واقعی میں سچ جا رہی

ہو نا؟"

وہ اس کے ڈرامے جانتی تھی جبھی آرام سے آئس کریم کا کپ ختم کرنے میں مگن رہی جو چند لمحے قبل عزل فریزر سے ان سب کے لیے نکال کر لایا تھا۔

میں نے روکا بھی نہیں، وہ ٹھہرا بھی نہیں
جادو کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

اس نے لہک لہک کر شعر سنایا۔

"احمر بھائی ہم سب اتنا تو رو رہے ہیں، ایسے ٹونے کیوں تال رہے۔" آفاق برا منا گیا عزل نے اس کی تائید کی... محض مسکرا کر رہ گئی، یہاں سے روانگی کے وقت اس کا دل بے حد اداس ہو جایا کرتا تھا۔

"آپ کے بھائی مذاق کر رہے ہیں چندا آپ کو معلوم تو ہے۔" اس نے دونوں کو پچکارا، اس کی نظر چراغوں کی لو پہ تھی اور عاشر کی اس پہ اب وہ سب لطائف سنا کر ہنسنے ہنسانے میں مشغول تھے۔

آسمان پہ ستاروں بھری رات مسکرا رہی تھی، چودھویں کا مکمل روشن چاند ان کے لان میں جھکا اپنی چاندنی لٹا رہا تھا، سب کی چاندنی میں ہولے سے اٹھتی ہوا جھونکے سے چراغوں کی ضیا سے عبیرہ خانی کرتی تو کبھی آم، آلو بخارا، فالسے اور لیموں کے پھلوں سے لدے پیڑوں کی بوجھل اور گھنی شاخوں کو نیند سے جگا دیتی، فضا میں موتیا، گلاب، چنبیلی اور لیموں کی ملی جلی مہک بے حد دلفریب لگ رہی تھی۔

تیری نظر آ میری نظر ہے
دل میں ہے کیا تیرے مجھ کو خبر ہے

احمر کے ایکدم سے گنگنانے اور معنی خیز انداز میں گنگنانے سے وہ پٹا کر قریب کی کیاری میں لہراتے سرخ، پیازی، زرد، سفید پھولوں کو دیکھنے لگا۔

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آنکھوں کی بات
جو بھی قصہ ہے ابھی تک گھر کے اندر تو ہے
آسمان سبز کنول پہ اک تارا اک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو یہ خوشنما منظر تو ہے

عاشر کے شعر پہ عبیرہ نے بے اختیار واہ واہ کی، جبکہ وہ احمر کو گھورنے میں مگن تھا جو پیٹ کا ہلکا ہے اور مسلسل اس کو تنگ کرنے پہ ڈٹے ہوئے ہے۔

احمر کے بلند و بانگ قہقہے پہ وہ سب ہونق سے اسے دیکھ رہے۔

"بھائی یہ تو چیٹنگ ہے آپ ہمیں بھی وہ لطیفہ سنائیں جس پہ آپ اتنا ہنس رہے ہیں۔" عزل اور آفاق نے صدائے احتجاج بلند کیا۔

"نہیں وہ بھائی نے شعر بے حد چبا چبا کر سنایا اس لیے۔" وہ پھر سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

"عبیرہ آج تم سچ میں ماشاء اللہ بے حد خوش لگ رہی ہو، میرے جانے پہ واقعی میں اتنے خوش ہو، میں اب نہیں آؤں گی، ٹھیک ہے۔" اب کے وہ برا منا گئی کب سے اسے عاشر بھائی کے ساتھ اشارے، سرگوشیاں کرتے اور ہنستے دیکھ رہی تھی، اس کے اندر بے حد اداسی اتر آئی۔

"حاضرین کرام اور جلی کٹی خاتون۔" اس کے طرز تخاطب پہ اس نے بے اختیار دانت کچکچائے جبکہ باقی سب ہنس رہے۔

"میری بات غور سے دل تھام کر سنیے اگرچہ یہ بات آپ سب کے گوش گزار کرنے پہ مجھے جان سے گزرنے کا خطرہ لاحق ہے مگر آپ

کی خاطر یہ رسک لے رہا ہوں۔" اس نے بے حد شوخ و شنگ نگاہوں سے عاشر کی گھوریوں کو خاطر میں لاتے ہوئے مصنوعی خوف زدہ انداز میں بیان دیا۔

چلتی ہوائیں ساکن ہو گئیں، رات کے دوسرے پہر کا ماہتاب تجسس سے لان میں اتر آیا تھا، لان میں اونگھتے شجر و پودے چونک کر ہمہ تن منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"عاشر بھائی کا رشتہ ہاہاہا، یہ دولہا بابا نکاح ہو گیا ہے۔" بالآخر اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی، یہ اور بات کہ اس دوران عاشر نے اچک کر اس پر حملہ کر دیا تھا، اس کا منہ بند کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر وہ اپنے نام کا ایک ہی تھا اپنی بات بے تحاشا قہقہوں اور مار کھانے کے دوران کراہتے ہوئے پوری کر کے رہا۔

"واہ، مزہ آگیا، بہت مبارک ہو عاشر بھائی، آج تو آپ نے دل خوش کر دیا، واہ جی واہ۔" وہ سب حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے عاشر کو دیکھ رہے تھے، سب سے پہلے عبیرہ نے لب کشائی کی۔

چاند ہولے سے ہنس دیا، ہوائیں، پھول، ستارے سرگوشیوں میں مگن ہو گئے، چاندنی ان کے درمیان ٹھہر کر گیت سنانے لگی، شب کے دوسرے پہر درختوں کے پتے چاندنی کے گیت پر رقص کناں ہو گئے۔

"لو جی اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے، آپ نے تو لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔" اس نے عاشر کو جھینپتے دیکھ کر، پکار کر نعرہ لگایا اور ہنسنے لگی۔

"بھائی ہماری ہونے والی بھابھی کون ہیں بتائیے؟" آفاق، مزمل، اشتیاق سے اس کے سر ہوئے، عبیرہ نے بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

جواباً عاشر مسکراتے ہوئے [illegible] نگاہ احمر کے [illegible] چھوڑا۔

"یہ ہمارے درمیان جو عبیرہ صاحبہ تشریف فرما ہیں یہی وہ ہستی ہیں۔"

سب خوشگوار حیرت میں جیسے جھوم اٹھے، اس دوران عاشر چپل کھسکا کر احمر کو مار چکا تھا لیکن وہ ڈاج دے گیا اور وہاں سے فرار ہو گیا جاتے جاتے آفاق و مزمل کو اشارے سے اٹھا کر ساتھ لے گیا تھا۔

ان کے درمیان دلکش سی چاندنی رنگ برنگ پھولوں اور چلتے دلوں میں پیار کے پھولوں سے لدے درخت کے نیچے مسکراتی ہوئی خیر خاموشی آکر بیٹھ گئی۔

وہ کتنی دیر بے یقینی سے ساکت بیٹھی رہی اور جب عاشر کی آنکھوں میں لو دیتے جذبوں نے یقین کا سرا تھمایا تو بے ساختہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"عبیرہ کیا ہوا؟" وہ بوکھلا کر گھٹنوں کے بل ٹک کے کھسک آیا، چاندنی میں اس کی سنائی دیتی سسکیوں میں بے حد چھپکے سے خاموشی ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔

"عبیرہ!" اسے سمجھ میں نہ آیا کیسے چپ کرائے، وہ مضطرب سا ساری صورتحال جاننے کی سعی میں تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی جانب بڑھایا مگر پھر واپس کھینچ لیا۔

جب محض کزن تھی تو اور بات تھی اب یہ بالکل مناسب نہیں تھا ایک عجیب سی جھجک مانع ہو گئی تھی اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ اس کو نئے تعلق کے حوالے سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس نے عجیب سے انداز میں روتی بہاروں

جیسی لڑکی کو بے بسی سے دیکھا اور ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"عبیرہ ابھی صرف ماما نے فون پہ ممانی جان سے زبانی کلامی بات طے کی ہے، میں ماما ہوں ماموں جان و ممانی کو بتا تم سے رضامندی لیے ہاں نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی تم خوش نہیں ہو تو میں ماما کو منع کر دوں گا، بے فکر رہو اس سب معاملے میں تمہارا نام نہیں آئے گا، میں ہمیشہ تمہیں ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کی طویل بات کے دوران ہچکیاں لیتا وجود ساکن ہوا تھا اور اسے ہر لحاظ سے پرسکون کرنے کے لیے اس نے لمحوں کے اندر فیصلہ سنا دیا تھا۔

عبیرہ نے ایک جھٹکے سے چہرہ اونچا کیا، آنسوؤں سے تر بتر چاندنی میں بھیگا جاذب نظر چہرا لمحہ بھر سے زیادہ دیکھا نہیں گیا، وہ دل تھما ہوا، وہ اس کی خوشی میں خوش تھا، اس کے آنسوؤں نے طبیعت میں عجیب سی بے چینی و بوجھل پن بھر دیا تھا، اس چہرے پر تا زندگی سدا مسکراہٹ دیکھنے کا متمنی تھا۔

"عاشر بھائی!" عبیرہ نے ہچکی میں اسے پکارا، اس کی پکار میں عجب سی کسک تھی جو عاشر کے علاوہ چاندنی، ستاروں اور ہواؤں نے بھی سنی، وہ یکدم پلٹا تھا مگر نظر اس پہ ڈالنے کی غلطی نہ کی۔

"بس اتنا ہی جانتے ہیں مجھے، اتنا ہی سمجھا ہے۔" وہ سسکی زدہ آواز میں شکوے بول رہی تھی، وہ دم بخود رہ گیا۔

محفل فلک سے سنتے ہی ستارے لان میں جھکے بغور انہیں دیکھنے لگے، چاند ٹھٹک کر رک گیا۔

"میں ایسی ویسی لڑکی ہرگز نہیں ہوں جس نے کسی کے ساتھ کے سپنے دیکھے ہوں اور ان کے ٹوٹنے پر رونے لگی، میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بہت مضبوط بنا کر رکھا ہے، میں نے کبھی کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں اور آپ نے مجھے کیا سمجھ لیا عاشر بھائی۔" وہ بے حد خفا انداز میں بھیگی آواز کے ساتھ اس سے مخاطب تھی آخری جملہ کی ادائیگی کے دوران پھر سے پھپک کر رو دی۔

"آئم سوری، میرا وہ مطلب......" عبیرہ کے لہجے اور آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی، وہ ہرگز جھوٹ نہیں بول رہی تھی اس کا لہجہ ٹھنڈا پانی پڑ گیا، متاسف انداز میں وہ مارے ندامت کے جملہ مکمل نہیں کر پایا۔

"پھر تم مجھے کھل کر پوری بات بتاؤ، یہ بن بادل برسات کیوں آخر؟" چند لمحے وہ بے بسی سے اسے سوں سوں کرتے، تکتا رہا پھر جیب سے اپنا رومال اس کی نذر کرتے قدرے متحمل کر کر رہا تھا، وہ بے حد الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔

"وہ عاشر بھائی میں نے زندگی میں کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا، عاشر بھائی ارحم بھیا نے جو زخم جیجو بھائی کو دیے اس کے بعد مجھے شادی سے سخت نفرت ہو گئی، محبت سے بھروسہ اٹھ گیا عاشر بھائی مجھے بہت ڈر لگتا ہے شادی سے مرد بڑے ہرجائی ہوتے ہیں عاشر بھائی اسی لیے اس قدر اچانک سے احمر کی دی گئی خبر نے میرے حواس مختل کر دیے۔" اس کے دیے گئے رومال سے اپنے آنسو اور بہتی ناک بار بار رگڑتی، بھیگے لہجے میں وضاحت دیتی اس پیاری سی لڑکی کی بات پہ عاشر ہنس دیا، چاند فوراً بادل کی اوٹ میں چھپ گیا تھا، ہوائیں بے قراری سے بہت سے رستے بھلا کر درختوں کی شاخوں میں پناہ ڈھونڈنے لگیں، چاندنی کے پاؤں

سمیٹ لینے سے یکلخت اندھیرا چھا گیا تھا جبکہ گھر کے قدرے فاصلے پہ واقع اندرونی رہائشی حصے سے آتی روشنی جو مدھم روشنی اپنے اندر سمونے کی ناکام جستجو میں مگن تھی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر شوخ و لاپروا سی نازک سی لڑکی اپنی ذات کی گہرائیوں میں ان کے درد چھپائے زمانے کے رشتوں سے اس حد تک خوفزدہ ہے، اس نہج تک جا سکتی ہے۔

"بے وفائی مرد یا عورت سے مشروط نہیں ہوتی، یہ انسانی فطرت پہ منحصر ہوتی ہے، بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے جب اسے اپنے من میں چھپا کر موتی کی صورت دیتی ہے جبکہ سانپ کے اندر وہ زہر کا روپ اختیار کرتا ہے، جس کا جیسا ظرف ویسی اس کی تخلیق۔"

لمحہ بھر کے توقف سے اس نے اس کی سوچ مثبت رخ پہ گامزن کرنے کے لئے بے اختیار طویل لیکچر دے ڈالا، یہ پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی، بادلوں کی اوٹ سے اسی پل چاند طمانیت سے مسکرایا ان کے وجود ٹھنڈی چاندنی میں نہا گئے۔

"میں تمہیں اس رشتے کے لئے فورس نہیں کر رہا، میں تو یوں بھی اک ہرجائی شخص کی اولاد ہوں، میں فقط تمہارے بھروسے کے قابل نہیں، دعا ہے تمہیں جیون میں اپنا چاہنے والا ہمسفر ملے جو تمہارے دل سے ہر خوف و واہمہ دور کر دے اللہ کریم تمہارے نصیب بہت اچھے کرے۔" اس نے خلوص دل سے اسے دعاؤں سے نوازا اور واپسی پہ اک آخری نگاہ ڈال کر قدم موڑ لئے، دل میں چپکے سے درد کے پنچھی اتر آئے تھے، یہ طے تھا کہ ان پنچھیوں کو اک دن اڑ جانا ہے کیونکہ وہ نصیب سنوارنا اس کے لئے بھی اللہ نے کسی نہ کسی کو

منتخب کیا ہو گا جو مقررہ وقت پہ اسے نعمت کی صورت آن ملتی۔

"عاشر بھائی آپ میری فکر نہ کریں، پھپھو جانی کی اولاد ہیں ماما پاپا اولاد کے لئے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کرتے، اس گمان میں مت رہیے کہ آپ میرے بھروسے کے قابل نہیں، بلکہ شاید آپ کے سوا میں دنیا میں کسی مرد پہ اعتبار نہ کر سکوں۔" اس کی بات پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے اور وہ حیرت سے یکلخت مڑا تھا، لڑکی اسے جھٹکے پہ جھٹکا دینے پہ تلی ہوئی تھی۔

"وہ کیوں؟" بے اختیار اس کی زبان پھسلی تھی۔

"کیونکہ عاشر بھائی جو خود چوٹ کھائے ہوئے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو کبھی زخم نہیں دیتے عاشر بھائی۔" اس کے روانی و صاف گوئی سے اپنی رضامندی کا عندیہ سنانے پہ عاشر نے سر تھام لیا اور وہیں گھاس پہ دھم سے گر پڑا۔

"کیا...... کیا ہوا؟" وہ بوکھلا کر قدرے جھکی اور بھنویں اچکیں اس کے منہ سے بگڑے زاویوں پہ لگا دیں۔

"یار اب تو بھائی مت کہو یہاں لگتا ہے جا کر۔" اس نے دل کے مقام پہ ہاتھ رکھ کر وضاحت دی جبکہ لہجہ و آنکھوں میں شرارت سی شوخی بھری ہوئی تھی وہ فوراً جھینپ کر پیچھے ہٹی۔

"ہاں ہاں اب بھائی مت کہنا کبھی۔" تینوں شیطان ڈرائنگ روم کی لان میں کھلنے والی کھڑکی سے اوپر نیچے جھانکتے کورس میں چلائے تھے۔

"اف اللہ۔" اسے اچانک سے ڈھیروں ڈھیروں شرم آ گئی، عاشر چونک کر چلائے کھڑکی کی جانب لپکا مگر وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بند ہو گئی، وہ خجل سا سر کھجاتا مڑا اور اسے دیکھ کر

...سے بے تحاشا جھینپ تھا جبکہ وہ بجلی کی سی پھرتی سے شرم سے دہکتے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے اندر بھاگ گئی۔

☆☆☆

بعد مدت اسے دیکھا لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا لوگو
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو
دوست تو خیر کوئی کس کا ہے
اس نے دشمن بھی نہ سمجھا لوگو
چاپ سی سمت کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا لوگو
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا لوگو

ادھم کی پیاسی نگاہیں بے تابی سے ان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں سنہری فریم کے سفید جھریوں والے چشمے کی اوٹ سے دکھائی دیتی یہ صورت آنکھیں بصارت کا ذریعہ محسوس ہوئی، وہ بھلا ان تک رسائی کیوں حاصل کرنا چاہے گا اس کی زندگی میں ان لوگوں کی کیا وقعت۔

وہ روز کا دن معمول کے مطابق تھا، سورج مقررہ وقت پہ مشرق کی اوٹ سے ابھرا تھا اور کی طرح صبح نکلتے پہ رتجگوں کے عذاب سے نجات اور نئے دن کی مسافت کے لئے ہمت طلب کی، وہی گھریلو مصروفیات اور بچوں و دادی کی نوک جھونک ماحول کو خوشگوار بنانے کی سعی، وہی معمول کے انداز میں گرما کی پر حدت دوپہر ڈھلنا وہی تھی، وہ عصر کی نماز پڑھ کر ابھی فارغ ہوئی تھیں۔

جبکہ چاروں بچے قریبی مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لئے گئے ہوئے تھے، جھلستی لو کی کارستانیاں بھی وہی تھیں، کملاتے ہوئے اشجار

خاموش و جامد تھے، نہ کوئی آندھی اٹھی تھی نہ طوفان کے آثار تھے نہ ہواؤں کا رخ بدلا تھا پھر وہ کیونکر مان لیتیں کہ سامنے دکھائی دیتا عکس اک حقیقت ہے۔

ڈور بیل کی آواز محض سماعتوں کا واہمہ اور یہ وجود التباس نظر، نگاہوں کے دھوکے کے سوا کچھ نہ تھا، انہوں نے کتنی دیر سے دم سادھے اس سراب کو پلکیں جھپک کر ہٹانے کی سعی کی پھر کھٹ سے دروازہ بند کرنے ہی کو تھیں کہ مقابل نے پاؤں دروازے کے بیچوں بیچ پھنسا کر ان کے ارادے کو ناکام بنا دیا، وہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھیں۔

"پلیز ایک بار میری بات سن لو۔" التجائیہ انداز و شکست خوردہ آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی، اسے ان کا ٹھکانہ کیونکر معلوم ہوا یہ سب سوال بے معنی تھے، وہ جانتی تھیں دنیا گول ہے۔

"کس ناطے کس رشتے کے تحت آپ کی بات سنوں اب راکھ میں کوئی چنگاری باقی نہیں رہی جسے کریدنے آپ چلے آئے، خدارا یہاں سے چلے جائیے ہم لوگوں کی پرسکون جھیل جیسی زندگی میں کنکر پھینک کر ارتعاش پیدا مت کیجئے۔" سرد مہری سے بے تاثر انداز میں وہ گویا ہوئیں ہوا کے پر حدت جھونکوں نے پیپل کے درختوں کی شاخوں سے ڈھیروں پتے گھاس کے اوپر گرائے تھے۔

"اس جذبے کے تحت میری بات سن لو، جس کے ساتھ تم نے ہاسپٹل میں میری مدد کی، خواہ وہ انسانیت کا ہی کیوں نہ ہو۔" اس کی کہی بات نے ان کو بے بس کر دیا جو بات اپنے تئیں وہ سب سے اور خود سے چھپائے پھرتی تھیں وہی اس کو معلوم ہو گئی۔

انہوں نے خاموشی سے ایک جانب ہو کر اس کے لیے راستہ بنایا۔

"امی جی نہ تمہارے پاس؟" اندر آ کر یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز میں واضح طور پہ لرزش ابھری اور ان کے اثبات میں سر ہلانے پہ گویا اس کے مردہ تن میں جان آ گئی۔

وہ اکیلا نہیں آیا تھا یہاں اس کے ساتھ کوئی اور وجود بھی تھا جو اتنی دیر سے اس کی اوٹ میں ہونے کے باعث نگاہوں سے اوجھل تھا، وہ شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں، اور اک کے بہت سے در خود بخود ان کی نگاہوں کے سامنے روشن ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

سارہ نے ارحم کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی، وہ انتہا درجے کی پھوہڑ، بدزبان، کاہل و خود پسند تھی، جس کا کام دن بھر آئینے کے آگے اپنے آپ کو سجانا، سنوارنا اور اپنا حسن نکھارنا تھا، کھانا ہوٹل سے تیار شدہ آتا تھا، کپڑے دھونے استری کرنے دھوبی کے ذمے تھے، صفائی کام والی کر جایا کرتی، ارحم کو اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے پکارنا پڑتا اس پہ وہ بلند آواز میں بکتی جھکتی اور گالی گلوچ تو ہنوز جاری رہا، آئی یہاں تک کہ محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے، تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا اپنی جنت جیسی زندگی کا سکون یاد آتا مگر وہ اب واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا اس کی مردانگی کو یہ گوارا نہ تھا۔

سارا بچے کے حق میں نہیں تھی وہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے جب اس کی جان کو اس کام میں رسکی بتایا تو، وہ جیسے تیسے چپ ہو گئی، اس کی تند تیز زبان جنھوں نے ارحم کے ناک میں دم کر دیا تھا، وہ اس کو خوش رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتا مگر وہ ناشکری اور مادیت پرست عورت ہمیشہ چیں بہ جبیں اور ناراض رہتی، اس کی سونے و ہیرے کے زیورات کی آرزو میں اپنی عمر بھر کی پونجی اور جائیداد سے ہاتھ دھو کر ارحم نے اسے سر تا پا زیورات سے لاد دیا مگر اس کی ہوس کا کنواں پھر بھی نہیں بھرتا تھا۔

بچی کی پیدائش کے بعد وہ ننھی سی جان کو لاپروائی سے بھوکا پیاسا چھوڑ کر اپنے تنگ جیسے دوستوں کے ساتھ پارٹیز میں چلی جاتی، محلے کے لوگوں سے اس کے مشکوک چال چلن کی باتیں ارحم ان سنی کر دیتا تھا، سارا کے کردار پہ اندھا یقین رکھتا تھا آفس سے آ کر بچی کو سنبھالنا بھی اس کے ذمے تھا، ایک دن جب وہ گھر لوٹا تو بچی بستر سے نیچے گری ہوئی تھی اس کا سانس بے حد مدھم چل رہا تھا، چھ ماہ کی بچی کو کئی دن سے بخار و زکام تھا مگر بے حس ماں کی لاپروائی نے اسے موت کے منہ تک پہنچا دیا۔

ایمرجنسی میں بروقت لے جانے سے اسے بچا لیا گیا تھا ڈاکٹر نے مونیہ کی تشخیص کی تھی اور انتہائی نگہداشت میں رکھا تھا، سارا کا کچھ اتا پتا نہ تھا اور ایک شخص کی نشاندہی پہ جب ارحم اسے ڈھونڈتا مطلوبہ فلیٹ پہ پہنچا تو اشتعال و خفگی کے باعث ہوتا دستک دیئے اندر داخل ہو گیا دروازہ لاک نہیں تھا اور اندر بیڈ روم کے کھلے دروازے سے نظر آتے منظر نے ارحم کو شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا، سارا جس حالت میں تھی، ارحم نے اسی وقت اس کو طلاق دے دی، بعد میں بچی کے عوض اسے اپنے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑے، وہ اپنی بچی ہرگز اس بدکردار عورت کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بچی کے ساتھ چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے دربدر پھرتا ٹھوکریں کھاتا رہا، بہاولپور بھیا کے

پاس گیا مگر افسوس انہوں نے اسے بری طرح دھتکار دیا، آپ، بچوں اور ماں کی تلاش میں وہ شہر شہر بھٹکتا رہا، پھر پتا چلنے پہ کہ وہ سب لاہور میں ہے لاہور آ گیا، بچپن کا اک دوست اتفاقاً سر راہ مل گیا وہ اس شہر میں اپنے گھر لے آیا اور یہاں بہت پہلے ہی وہ بچوں کو آتے جاتے راہ میں دیکھ کر روتا رہتا تھا ان لوگوں کا سامنا کرنے معافی مانگنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا تھا، لیکن ضمیر کی خلش کو کم کیے اور بچی کو محفوظ ہاتھوں میں سونپے دوسرے نہیں جانا چاہتا تھا کبھی ہوسپٹل میں وہ لے گیا مگر ڈاکٹر نے طبیعت خراب ہونے پر زبردستی ایڈمٹ کر لیا۔

جب اس کے دوست کو اطلاع ہوئی تو وہ ہسپتال آنے جانے رہے اور شکوہ کیا کہ اپنی بیماری "ٹی بی" کے متعلق بتایا کیوں نہیں گیا، ارحم کے ذہنی حالات بے حد برے تھے، وہ اپنے دوست کے ہسپتال کے اخراجات اٹھانے پر مشکور تھا اور اس رقم کو قرض کے طور پہ لوٹانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن جب انہوں نے اس بابت لاعلمی کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صاحب سے استفسار کرنے پہ تمام واقعہ کا علم ہوا اور آنیہ کے دستخط دیکھ کر کسی شبے کی گنجائش نہیں رہی تو وہ ہسپتال سے زبردستی ڈسچارج ہو کر ندامت کے سمندر میں غرق اس کے روبرو چلے آئے، ان سب سے اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرنے کا حوصلہ ان کے دل در آنیہ کے انسانیت پرور سلوک کی بدولت آیا۔

اپنی روداد، انہوں نے روتے کھانستے سسکیوں کے دوران ان کے قدموں پہ سر رکھے بیان کی ادای صوفے پہ بے جان تھیں وہ کار بیٹ پہ ان کے قدموں میں ڈھے گئے تھے، ارحم پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے نفرت سے رخ موڑا تھا مگر

انہوں نے زبردستی ان کے پاؤں روتے ہوئے پکڑ لیے، اپنے لخت جگر سے لاکھ نفرت سہی لیکن اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان پہ جو قیامت گزری وہ صرف ایک ماں کا دل ہی جان سکتا ہے، اب وہ صحت مند زندگی سے بھرپور ارحم نہیں تھا بلکہ نحیف و کمزور کھانستے جیتے میں ہڈیوں کا کوئی ڈھانچہ سا تھا کھچڑی کلر کی داڑھی و سر کے بال، وہ اپنی عمر سے کئی گنا آگے کھڑا تھا۔

لیکن جو کچھ وہ کر چکا تھا اس کے بعد وہ کسی رحم، کسی ہمدردی یا معافی کا ہرگز مستحق نہیں تھا، انہوں نے محبت کو نفرت کے لبادے میں لپیٹ کر پاؤں کھینچ لیے۔

"کم بخت، ناخلف اولاد، دفع ہو جا، کیا لینے آیا ہے یہاں، اپنی غرض کو آ گیا بڑھاپے میں اولاد اور بیوی کا سہارا لینے، منحوس ہم تیری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"میں نے کہا تھا نا اچھی بیوی نعمت ہوتی ہے تو نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی، اللہ نے تجھے خاک میں ملا دیا، اس بچی آنیہ کا صبر پڑا ہے تجھ پہ کم بخت مارے، اپنی بچی پکڑ اور تو دو کیاروں ہو جا بچی۔" غالب بیگم کے منہ میں جو آ یا وہ بکے گئیں، جبکہ وہ گم صم بچی سوچوں میں گم رہیا۔

"میں تمہارا مجرم ہوں، آنیہ تم جو چاہے سزا دے لو لیکن مجھے معافی دے دو میری بچی لیکن مجھے جیتنے سے جینے نہیں دیتی اور اس معصوم کو پالو میں اس تک پرورش دینا چاہتا ہوں اسے اپنے ماں باپ جیسا ست بنتے دینا، اسے اپنی طرح بنانا آنیہ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" وہ بکھرے ہوئے ندامت سے چور لہجے میں مخاطب تھے، جبکہ خالی خالی نگاہوں سے ساکن جنبش انہیں بکھرنے ملاحظہ کرتی رہیں۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

رمشا احمد

"اُف نہ جانے ابھی کتنا سفر باقی ہے۔"
خوشان نے رات کی تاریکی اوڑھے خاموش تیزی سے گزرتے مناظر پر سے نظریں ہٹا کر کوچ کے اندر کے ماحول پر اپنی توجہ کی، ہلکی سی روشنی میں سیٹوں کی پشت سے ٹیک لگائے، گھٹنوں میں سر دیئے یا پھر بیت پرست کرلیتی لڑکیاں، سب کی سب خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں اور لائبہ شاہ بھی خوشان صدیقی کے کاندھے پر سر رکھے آرام کر رہی تھی، خوشان پہلی مرتبہ اتنے لمبے سفر میں اپنی فیملی کے بغیر اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کر رہی تھی۔

خوشان اور لائبہ کی دوستی کو بہت گہری تھی اور چونکہ دونوں کے گھر بھی قریب قریب تھے اس لئے ان کی دوستی کا الگ ہی رنگ تھا، پڑوسی ہونے کی وجہ سے دونوں گھرانوں کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے، اسی لئے تو لائبہ شاہ کی امی نے اظہر بھائی کی منگنی ہوتے ہی خوشان کی ممی کو یاد کروا دیا تھا کہ اظہر بھائی کی بارات کے ساتھ وہ لوگ بھی ضرور جائیں گے، جو کہ ملتان جانی تھی، مگر ادھر اظہر بھائی کی شادی کے

ناولٹ

تنکشن شروع ہوئے ادھر مما کی طبیعت خراب رہنے لگی، مگر مما نے خوشان کو جانے کی اجازت دے دی کہ آنٹی ناراض نہ ہوں، پھر خوشان بھی لائبہ کے خاندان والوں سے بہت حد تک واقف تھی اور لائبہ تو بے پناہ خوش تھی کہ خوشان ان کے ساتھ تھی۔

لائبہ شاہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی اس لئے اسے خاندان بھر میں منفرد حیثیت حاصل تھی اور خوشان چونکہ لائبہ کی اکلوتی چہیتی سہیلی تھی اس لئے خوشان کو بھی بہت پذیرائی نصیب ہوئی تھی اور دوران گفتگو بھی صامیہ، رامیہ، شیریں، عامرہ، زنیرہ، خوشان کو

بھی سرسری گفتگو کرتی رہی تھیں، مگر لائبہ شاہ کو عزیم احمد کا نام لے کر چھیڑنے کے علاوہ وہ زیادہ تر چپ رہی تھی، حالانکہ وہ ان سب سے خاصی فری ہو گئی تھی اور اس وقت کوچ میں موجود سب کی سب یا تو باقاعدہ انگیجڈ تھیں یا پھر در پردہ ان کی بات کسی نہ کسی کزن سے پکی تھی اور یہ بات خوشنان کے لیے ایکسائٹمنٹ سے بھرپور تھی اور سب سے زیادہ بے چینی تو اسے عزیم احمد کو دیکھنے کی تھی۔ تصویروں کی حد تو خوشنان اس سے واقف تھی اور بہت حد تک متاثر بھی کہ عزیم احمد ایم ایس سی کر رہا تھا اور خوشنان حیران تھی کہ اس فیملی میں لڑکے سب کے سب ہائی کوالیفائیڈ تھے مگر لڑکیوں کی تعلیم واجبی سی تھی، ملک کی ایک تو بالکل ہی ان پڑھ ہی تھیں مگر پھر بھی کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔

”ارے تم جاگ رہی ہو؟“ لائبہ نے خوشنان کو سندی سندی آنکھوں سے دیکھا۔
”ابھی تو کافی دیر ہے تم کچھ دیر آرام کر لو، وہاں پہنچ کر تو بالکل بھی وقت نہیں ملے گا، ویسے مزہ بھی بہت آئے گا، خاص طور پر خالہ جانی کے ہاں ویسے ہی بہت ہلا گلا ہوگا۔“
”ویسے وہ لوگ بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ لائبہ نے کھلی کھلی آنکھوں سے وہ منظر بھی دیکھ ڈالا اور خوشنان مسکرا کر رہ گئی۔
”چلو بھئی آ گئی منزل قریب۔“ لائبہ نے کھڑکی سے باہر کے منظر پر نگاہ دوڑاتے ہوئے خوشنان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
صبح کا ہلکا ہلکا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا، کوچ میں بھی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مرد حضرات بھی باتوں میں مصروف تھے، لائبہ کے بابا جان سادات شاہ اور بڑے چچا شہادت شاہ دروازے سے لڑکوں کی گاڑیوں کو کھولنے لگے اور تمام سامان کو ایک بار پھر چیک کرنے لگے تھے، جبکہ زرمین، ذکی اور چچی صفوا اور باقی خواتین بھی لڑکیوں کو سامان سمیٹنے اور حلیے درست کرنے کی ہدایات کر رہی تھیں۔
گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور بڑے سے سفید گیٹ سے مرد و حضرات کا اژدہام نکل آیا اور وہ سب خواتین کی دعاؤں میں گیٹ پر موجود لڑکیوں سے ہاتھ ملاتی گلے ملتی گھر کے اندر آ گئیں۔ خالہ جانی سفر کا احوال پوچھ رہی تھیں۔
خوشنان کو یہاں اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ سب باتوں کے دوران کپڑے وغیرہ نکال کر نہانے کے لیے تیار ہونے لگیں، جبکہ باقی خواتین جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر خالہ جانی کے ہمراہ کام میں مصروف ہو گئی تھیں، شاید وہ طویل سفر کرنے کی عادی تھیں اسی لیے خوشنان کو اس قدر تندہی سے کام کرتی وہ حیران کر گئیں اور خوشنان کو لگ رہا تھا کہ وہ ان آٹھ گھنٹوں کا سفر پیادہ کر کے آئی ہے، مگر زندہ چہروں، خوشگوار باتوں اور اپنائیت و محبت سے بھرپور انداز لیے وہ سب اس کی تھکان کو کہیں غائب ہی کر گئے تھے۔

☆☆☆

”ڈئیر شمرہ! یہ اسامہ لوگ کہاں ہیں؟“ ناشتے کی طویل و عریض میز پر سجے نان، پائے، گرم گرم حلوہ، پوری، چنے، دہی، سلاد، باقر خانیاں۔ لائبہ نے گرم پوری اور چنوں سے انصاف کرتے ہوئے اپنی تایا زاد سے پوچھا۔
”اسامہ وغیرہ رات تک تو یہیں تھیں تم لوگوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی گئی ہیں، کچھ رہ گئی تھیں وہ گھنٹے تک واپسی ہوگی۔“ شمرہ نے بھی پوری تفصیل بتا دی۔
”اور باقی لوگ تو گیٹ پر ہی آپ کی راہوں میں پلکیں بچھائے کھڑے تھے وہ بھی

رات سے۔ شاید تم نے گھبراہٹ میں نوٹس نہیں لیا، آپ کا سامان جس نے کمرے تک پہنچایا تھا وہ بھی لوگ ہی تھے۔“ شمرہ نے شرارت سے کہا تو لائبہ نے صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیا اور بات بدلنے کے لیے بولی۔
”اور یہ سید زراب علی شاہ کہاں غائب ہیں؟ کب شرف باریابی عطا فرمائیں گے؟“ لائبہ نے مسکرا کر پوچھا اور ساتھ ہی خوشنان کے ہاتھ میں گرما گرم پوری پکڑا دی۔
”وہ ان کی طرف سے آپ بے فکر رہیں، موصوف نہ صرف رشتے دار ہونے کا احساس بخوبی سرانجام دے رہے ہیں بلکہ حق دوستی بھی خوب نبھا رہے ہیں، قسم سے زراب بھائی خوب ہیں، کل سے اب تک ایک پاؤں پر کھڑے ہیں۔“ شمرہ نے زراب کے قصیدے ہی پڑھ ڈالے مگر لائبہ نے ہنس کر کہا۔
”کیوں اس کی دوسری ٹانگ کو کیا ہوا؟“
اور جواباً شمرہ نے اسی سے کہا۔
”ہائے لائبہ کتنی خراب ہو تم، اسامہ کے سامنے ایسا کہا تو وہ بہت مائنڈ کرے گی۔“ لائبہ نے خوشنان کو سبز چائے کا کپ پکڑایا اور کرسی پر ٹک گئی، تو صاحبہ، رامیہ، نیرین بھی ان کے قریب آ گئیں اور سب پتہ چلا کہ زراب، اظہر بھائی اور سب کزنز اور دوستوں کو لے کر ہوٹل چلا گیا ہے اور دوپہر سے وہ اظہر بھائی کی اور گاڑی کو تیار کر کے لائے گا، سو لڑکیوں کو بھی ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تیار ہونے کا حکم مل گیا۔
وہ سب ایک کمرے میں دروازہ بند کیے تیاری میں مصروف تھیں، ساتھ ہی باتیں بھی ہو رہی تھیں اور چھیڑ چھاڑ بھی، کہ السلام علیکم کی زور دار آواز کے ساتھ ہی مسکراتی ہوئی اسامہ لائبہ کے گلے میں جھول گئی۔

"ارے بدتمیز اب آ رہی ہو؟" لائبہ نے خفگی سے اسمارہ کی کمر پر دھموکا جڑا اور ساتھ ہی اسنا کو گلے لگا کر پیار کیا اور خوشنان اور باقی سب بھی ان سے ملنے لگیں۔

☆☆☆

وہ سب تیار ہو کر خالہ جانی کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے، مگر ابھی تک دولہا اور بھائیوں کا کچھ پتہ نہ تھا، ارے بابا جان، چچا جان اور دیگر حضرات بے چینی سے کئی چکر روڈ کے لگا چکے تھے، آدھ گھنٹے پہلے صارم کا فون آیا تھا کہ بس وہ چلنے ہی والے ہیں، بابا جان کا خیال تھا کہ واپسی کا پروگرام جلدی ہی ہو جائے مگر یہاں برات کی روانگی میں ہی اتنی دیر ہو رہی تھی، ایک تو بزرگ حضرات نے جلدی جلدی کا اتنا شور مچایا کہ لڑکیاں تیار ہو کر کب کی بیٹھی انتظار میں سوکھ رہی تھیں، بچیوں کے موڈ خراب ہو رہے تھے، لائبہ تو تپ ہی رہی تھی، اس کا کسی پر بس نہ چلا تو اسمارہ کے سر ہی ہو گئی۔

"یہ سارا کیا دھرا تمہارے اس بانگڑو بھائی کا ہے، ہمیں یہاں تیار کروا کے بٹھا دیا اور خود دولہا سمیت نہ جانے کہاں وہ غائب ہو گیا، ریکارڈ ہے جو کبھی ڈھنگ کا کام کیا ہو، یہ کوئی تک ہے گھنٹہ پہلے ارشاد فرمایا بس پہنچ رہے ہیں، آپ ریڈی رہیں، جب تک ہم دلہن والوں کے ہاں پہنچیں گے نانا ابا کی ہڈیوں جیسا حال ہو جائے گا وہ......" اس سے پہلے کہ لائبہ مزید کچھ کہتی اسمارہ بول پڑی۔

"یہ تم کیا ہر وقت بھائی جی کے خلاف ہی بولتی رہتی ہو، دولہا کو وہ ہی نہیں لے کر گئے بلکہ ساتھ وہ تمہارا عزیز بھی ہے، صارم، آفاق، شہریار، صالح سرفہرست عزیز اور مریم، مگر تمہیں تو نہ جانے کیا ہے؟" اسمارہ نے خاموش ہوتے میں ہی عافیت جانی، کیونکہ انکل فاروق نے سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کو کہہ دیا تھا۔

"لو اب کیا برات دولہا کے بغیر ہی جائے گی؟" لائبہ نے خوشنان کا ہاتھ پکڑ کر کوسٹر میں چڑھتے ہوئے کہا۔

"بھئی مزاب کا فون آیا تھا کہ وہ لوگ مین روڈ سے ہمارے ساتھ مل جائیں گے اور واقعی جونہی کوچ نے مین روڈ پر ٹرن لیا گلاب کی کلیوں اور موتیے کے پھولوں سے سجی گرے کار آگے آگے لیڈ کرنے لگی جبکہ چار یا پانچ کاریں پیچھے تھیں وہ بھی قدرے سجی ہوئی تھیں۔"

برات کے لئے قریبی پارک میں انتظام کیا گیا تھا، اس لئے فاصلے پر دولہا اور دوسرے لوگوں کو اتار لیا گیا، اب عجیب سماں تھا، آتش بازی ہو رہی تھی، ڈھول کی تھاپ پر لڑکے دھمال اور بھنگڑا ڈال رہے تھے اور گلاب کے پھول گلے میں ڈالے گولڈن کرتے پاجامے میں سر پر نہایت خوبصورت کلا سجائے اظہر بھائی بہت اچھے لگ رہے تھے جبکہ باقی سب لڑکوں نے سوٹ پہن رکھے تھے اور گلاب کی نازک کلیاں اس کی تیاری کی شان بڑھا رہی تھیں۔

برات کا استقبال بھی بہت زبردست کیا گیا تھا۔

"لو ایک تو تمہارا نکما بھائی جانے کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔" اسمارہ سے مخاطب لائبہ کی آنکھوں میں شرارت کی واضح چمک تھی، جو اسمارہ کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی، اس لئے وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

"ویسے سچ بتاؤ ناں لائبہ چکر کیا ہے؟ آخر تم ہر وقت بھائی جی کو ہی کیوں یاد کرتی ہو؟ حالانکہ وہ خاصے نکمے ہیں، کام چور ہیں اور بقول تمہارے کوئی خوبرو بھی نہیں۔" اسمارہ لائبہ کا رخ

دلہن دیکھنے کے لئے رکی تو لائبہ بولی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ وہ بے حد کام چور، نالائق بھی مگر پھر بھی کبھی کبھی کوئی کام صحیح بھی کر ہی لیتا ہے، اب جیسے اس کیمرے کو چارج کرنا ہے مگر...... بے شرم بالو تہ مالو جب بھی اس سے کوئی کام ہو تو وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔" لائبہ نے بات بدلی تو اسمارہ ایکدم ہی بھائی جی کی کھوج میں ہجوم میں غائب ہو گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کیمرہ موجود تھا۔

"لو بھئی دولہا کی بہن تمہاری تصویر بناؤں، وہ بھائی جی اس طرف ہیں۔" اسمارہ نے کہا تو لائبہ خوشنان کو ابھی آئی کہہ کر اسی طرف چل دی جس طرف اسمارہ نے اشارہ کیا تھا، جبکہ اسمارہ کھٹا کھٹ سب کی تصویریں بنانے لگی، پھر وہ کیمرہ واپس بھائی جی کو دے آئی کہ باقی تصویریں وہ دلہن کے آنے پر بنائیں گی۔

"ارے وہ سمرینہ وغیرہ ابھی تک نہیں آئے؟" لائبہ نے کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اسنا اور اسمارہ سے سوال کیا۔

"ہاں وہ ذرا لیٹ ہی آئیں گے۔" اسنا نے مختصر سا جواب دیا۔

"بچی کا موڈ اور طبیعت کل سے ہی خراب ہے۔" اسمارہ نے وضاحت کی۔

"خیر موڈ تو پرانی بات ہے ہاں طبیعت میں خرابی ذرا زیادہ تازہ خبر ہے۔" سمرینہ اپنی جرات صاف گوئی کی بدولت خاصی مشہور تھی۔

نکاح ہوا تو دلہن کو اسٹیج پر لا کر بٹھا دیا گیا، چونکہ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ انتظام تھا، اس لئے فی الحال خواتین تصویریں بنا رہی تھیں۔

دلہن واقعی بہت حسین تھی، لائبہ نے خوشنان کی اور باقی کزنز و دور رشتہ داروں کی ڈھیروں تصویروں اور دلہن کے کئی زاویوں سے کلوز اپ لئے، چونکہ اسٹیج پر بہت رش ہو گیا تھا اس لئے خوشنان ایک طرف کھڑی ہو گئی کہ سامنے کی طرف موجود مسٹرڈ سوٹ میں ملبوس شخص پر اس کی نظر پڑی جو بے چینی و اضطراب کی سی کیفیت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں تھامے کیمرے کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

"اسمارہ...... اسمارہ۔" خوشنان نے لڑکیوں کے جھرمٹ میں اسمارہ کو آواز دی، وہ بمشکل باہر آئی۔

"جی کیا ہوا؟" نہایت مودب لہجے میں اسمارہ نے پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

"وہ شاید تمہارے بھائی تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔" خوشنان نے اسی طرف اشارہ کیا تو اسمارہ "شکریہ" کہتی چل پڑی۔

پھر اظہر بھائی کو بھی دلہن کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا، لائبہ کافی دیر بعد ہجوم میں سے برآمد ہوئی تھی اس لئے ایکدم ہی کرسی پر گر گئی۔

"لو بھئی آ گئے لوگ۔" لائبہ نے اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے مسکرا کر خوشنان سے کہا تو وہ نہ سمجھ آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی، کہ وہ سامنے سے آنے والی سے خوشدلی سے ہاتھ ملا رہی تھی جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، بلکہ اخلاق بھی ندارد تھی۔

"ارے خوشنان ادھر آؤ ناں ان سے ملو یہ ہیں اسمارہ کی چچا زاد سمرینہ اور سمرینہ یہ ہے میری بہت ہی پیاری دوست خوشنان، خوشنان صدیقی۔" اور خوشنان نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سمرینہ کے ہاتھوں میں دیا تو تب بھی وہی سرد مہری جسے خوشنان محسوس کیے بنا نہ رہ سکی، جبکہ اسمارہ کی چچی اور ان کی چھوٹی بیٹی سفینہ قدرے بہتر طریقے سے ملی تھیں۔

"لائبہ یہ سمرینہ کافی بے کچھ عجیب سا نہیں ہے؟" خوشان تو اس کے سپاٹ انداز پر ایک دم ہی کھٹک گئی۔ لائبہ سے کہنے لگی۔

"نہیں تو ٹھیک ہی ہے۔" لائبہ کا انداز ٹالنے والا تھا جبکہ خوشان کی نظر بالکل ہی سامنے بیٹھی سمرینہ پر تھی، جو انشا سے باتوں میں مگن تھی اور مسکرا بھی رہی تھی، مگر اس کی مسکراہٹ میں تازگی نہیں تھی۔

اچانک ہی موسم ابر آلود ہو گیا تھا اور بارش ہونے لگی، اس لئے سب مہمانوں کو گھر میں بلا لیا گیا اور، لوگ مختلف کمروں میں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے، چونکہ ابھی رسمیں وغیرہ ہونا باقی تھیں اس لئے رخصتی میں بھی دیر تھی، جبکہ بابا جان اور باقی حضرات کا خیال تھا کہ شام سے پہلے ہی روانگی ہو جائے، مگر فی الحال تو سب مگن تھے۔

"اف ابھی تو دودھ پلائی کی رسم میں مزہ آئے گا، دیکھنا ذرا کیا ہوتا ہے۔" لائبہ نے خوشان کو اعلام کیا جو دلہن اور دولہا کے گرد جمع لڑکوں کو دیکھ کر ہی گھبرا رہی تھی اور کمرے سے باہر ہونے کے باوجود بھی اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

سمرینہ وغیرہ جتنی دیر سے آئے تھے اتنی ہی جلدی واپس بھی چلے گئے اور جاتے جاتے بھی خوشان کے ذہن میں کئی سوال سمرینہ کی صورت میں محفوظ ہو گئے اب ایسی کیوں ہے؟ خوشان کو الجھن سی ہو گئی، ظاہر ہے خوشان کی سلام دعا تو لائبہ کی دور پار کی سب کزنز سے تھی اور سب کی سب خوش اخلاق اور ملنسار تھیں پھر سمرینہ۔

"یہی تو وجہ ہے ناں سمرینہ وہ نزاب کی منگیتر ہے اور اسامہ کی نند بھی ہے اور ان کی چچا زاد بھی ہے۔" لائبہ کی وضاحت پر خوشان کی نظروں میں نزاب اور سمرینہ دونوں ہی گھوم گئے۔

"ہائے وہ سمرینہ منگیتر ہے نزاب کی؟ اف کتنی خوش قسمت ہے۔" اور خوشان کی بات پر لائبہ مسکرانے لگی کہ صامیہ، وامیہ اور دیگر کزنز کی طرح اس نے بھی جل کر بے چارہ نزاب کا نعرہ نہیں لگایا تھا بلکہ سمرینہ کی خوش قسمتی کو نزاب کی بدقسمتی نہیں کہا تھا۔

"مگر......" خوشان کے اس مگر کے آگے جو سوال تھا، لائبہ سمجھ گئی تھی اس لئے خود ہی بولی۔

"بس اتنی سی بات ہے کہ سمرینہ سے پہلے نزاب کے لئے بڑی خالہ نے عمیرہ کے لئے بات کی تھی اور بھائی کے لئے اسامہ کی، مگر تمہیں تو معلوم ہے کہ اظہر بھائی کو شروع سے عروج میں دلچسپی تھی اور اس نے بھی ماموں جان سے کہہ دیا تھا اس لئے بات نہ بن سکی، تو اسامہ کی بات اس کے چچا زاد صارم سے اور نزاب کی سمرینہ سے ہو گئی، اس لئے سمرینہ سمجھتی ہے کہ نزاب شاہ اور میرے میں کچھ ہے مگر ایسا نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ میں اور نزاب بچپن ہی سے ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں اس لئے زیادہ فرینک ہیں، پھر تعلیمی اعتبار سے دونوں خاندان میں آگے ہیں، ایجوکیشن معاملے جب بھی ذکر ہوتا ہے لڑکیوں میں میرا اور لڑکوں میں نزاب کا ذکر ہوتا ہے کیونکہ بہت لائق، ذہین، محنتی ہے، اچھا بزنس بھی کر رہا ہے جبکہ سمرینہ صرف آٹھویں پاس ہے۔"

خوشان نے ایک بار پھر دل ہی دل میں نزاب کی زبردست پرسنالٹی کو سراہا اور سمرینہ کی خوش قسمتی پر رشک کیے بنا نہ رہ سکی کہ ایکدم سے بلند ہوتے شور نے اسے اندر کی سمت متوجہ کر لیا جہاں دودھ پلائی کی رسم ہو رہی تھی، دولہا کی طرف سے لڑکے موجود تھے جبکہ باقی لڑکیاں دلہن والیاں بنی ہوئی تھیں، بحث زور و شور سے جاری تھی۔ لائبہ اور خوشان کرسیوں پر کھڑی ہو گئیں تاکہ اندر کا منظر واضح دیکھ سکیں۔

"لائبہ ایسا کرو تم اندر چلی جاؤ۔" خوشان نے لائبہ کا ہاتھ پکڑ کر کرسی سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"ہیں...... کیوں؟" لائبہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ دیکھو۔" خوشان نے آنکھوں کے اشارے سے بتایا، تو ان کی طرف پورا کا پورا متوجہ نزاب نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔

"ہاں...... اسے دیکھو ذرا۔" لائبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تو کافی دیر سے دیکھ رہی ہوں۔" خوشان نے آہ بھر کر کہا۔

"بکواس مت کرو، تمہیں پتہ نہیں عزیم کا وہ چچا زاد مجبور ہے اور یہ لگتا ہے ایسے ہی اتفاق سے نگاہیں جھکانا بھول گیا ہوگا اور تمہیں خبر ہے مائی ڈیئر کہ مجھے اپنا اکلوتا منگیتر ہی بہت پیارا ہے۔" لائبہ نے کہا۔

"ہاں مگر ضروری تو نہیں کہ اسے سمرینہ پسند بھی ہو۔" خوشان تو نزاب اور سمرینہ کے معاملے میں اٹک ہی گئی تھی۔

"اچھا بھئی جب بھی اسلام آباد آتا ہے اظہر بھائی کی بائیک پر موصوف کو بٹھا کر سارے جہاں کی سیر کرتا ہے، ذرا سا محترمہ کے بارے میں کچھ کہہ دو تو ایسی کھری کھری سناتا ہے کہ بس۔" لائبہ نے تنگ آ کر کہا۔

"پھر بھی ہو سکتا ہے کہ......" خوشان نے سوچتے ہوئے کہنا چاہا مگر لائبہ نے درمیان میں ٹوک دیا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا یہ منگنی اس سے پوچھ کر ہوئی تھی اور اس نے صاف کہہ دیا اس کی کوئی پسند وسند نہیں ہے، والدین جہاں چاہے مرضی بات کر لیں اور خبردار جو تم نے اب کچھ کہا، ویسے چلو ہم کپڑے تبدیل کر لیں اندر تو جانے کا فائدہ نہیں وہ عزیم بھی اندر ہے، سب دولہا دلہن کو بھول کر میرا مذاق بنانے میں اپنی صلاحیتیں آزمائیں گے خاص طور پر یہ خبیث نزاب۔"

☆☆☆

کوچ میں بیٹھتے ہوئے خوشان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر صامیہ، اسامہ، انشاء کوئی بھی موجود نہیں، صارم نے بتایا کہ وہ دوسری کوچ میں سوار ہو گئی ہیں، چونکہ اب واپسی میں ملتان والے رشتے داروں نے بھی جانا تھا ویسے کے لئے اس لئے جگہ کم پڑ رہی تھی، دلہن آنٹی، بڑی خالہ وغیرہ کار میں دلہن کے ساتھ تھیں، لائبہ نے کوچ میں بیٹھنے کو ترجیح دی تھی کہ کار میں بیٹھے بیٹھے مشکل ہو جاتی، دو کوچیں بھری ہوئی تھیں اور اب یہاں لڑکوں کی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔

"اف یہ لوگ سارا راستہ یونہی کھڑے رہیں گے کیا؟" خوشان کو دروازے کے قریب باتوں میں مشغول کھڑے نزاب، صارم، عزیم کو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اسی طرح دیکھ کر وحشت ہونے لگی تھی، جواباً لائبہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے ابھی تو تھوڑا سا سفر مکمل ہوا ہے اور ان کو کھڑے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ، پاگل ان کو تو عادت ہے اسلام آباد سے ملتان، لاہور تک اسی طرح سفر کرنے کی اور ویسے بھی ٹک کر بیٹھ جانا ان کی سرشت نہیں، تم آرام سے بیٹھو بلکہ کچھ آرام کر لو تاکہ ولیمے میں بیمار، بیمار سی شکل نہ ہو۔" اس کی بات سن کر خوشان نے مسکرا کر سیٹ سے ٹیک لگا

کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اللہ خیر کیا ہوا؟" نہ جانے اسے کتنی دیر ہوئی تھی سوتے ہوئے کہ زوردار آواز کے ساتھ وہ ہڑبڑا کر اچھل گئی۔

"کچھ نہیں جمپ لگا تھا۔" نہایت نرم آواز میں اس کی تسلی کرائی گئی تو وہ نیند سے بے حال پلکوں سمیت ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تقریباً سبھی سو رہے تھے یا پھر ہو گئی بے سدھ اور باہر اندھیرے کی آوازیں اور اس قسم کی جمپ ان کے آرام میں مخل نہیں تھے مگر خوشان کی نیند ٹوٹ چکی تھی، لائبہ تو سکون سے خوشان کے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔

"لائبہ میری تو ٹانگیں ہی اکڑ گئی ہیں، پلیز کچھ دیر کھڑے ہو کر ٹہل لیں؟" خوشان نے منت بھرے لہجے میں لائبہ سے کہا تو وہ، جو خوشان کے کہنے پر کھڑے ڈھال حضرات کی طرف متوجہ تھی، ان سنی کر گئی کہ عزیز اسے جب سے لطیفوں سے زراب، عباد وغیرہ کی تھکن اور بے قراری دور کرنے کی کوشش خود بھی خاصا ہلکان ہو رہا تھا۔

"چلو یار وہ ان پر بھی احسان کر ہی دیں، ویسے بھی بیچاروں نے بہت صبر کیا ہے۔" پھر لائبہ نے ان لوگوں سے جا کر کہا تو وہ خوشان، لائبہ اور اسماء اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور وہ چاروں ان کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ آگے والی سیٹ کی بیک پر ہاتھ جمائے باہر تیزی سے گزرتے نظارے دیکھتے ہوئے لائبہ سے باتوں کے دوران خوشان بوجھل سی ہو گئی کہ وہ جب بھی اپنے مقابل کھڑی لائبہ کی طرف دیکھتی نظر [illegible] سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے زراب کے چہرے پر پڑتی اور تب ہی اسے ایسا لگا تھا کہ وہ شخص بند آنکھوں سے بھی دیکھ رہا ہے۔

"شکر ہے پہنچ گئے" خوشان نے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی کہا، باقی سب بھی اپنا سامان اتارنے لگے اور وہ لائبہ کے ہمراہ اندر آ گئی۔ جہاں دیگر مہمانوں کے لیے چیخ و پکار مچی ہوئی تھی، مگر لائبہ نے خوشان کو گھر بھیج دیا تا کہ آرام کے بعد وہ کل ولیمے میں فریش شامل ہو۔

گھر کے گیٹ پر لائبہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی اور زراب لان میں بچھی کرسی پر شلوار سوٹ میں ملبوس کندھے پر کالی شال ڈالے نیم دراز تھا، مگر اس کی بند آنکھیں شاید ہر منظر دیکھ رہی تھیں کیونکہ کھلے گیٹ سے باہر نکلنے تک لائبہ واپس جا چکی تھی مگر خوشان کو اپنی پشت پر تیز نظروں کا واضح احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

لائبہ نے خوشان کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ سب تیار ہیں وہ بھی آ جائے اور وہ جب گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو بالکل سامنے کھڑے زراب علی شاد کی مسکراتی آنکھوں نے اس کا استقبال کیا، ان مسکراتی آنکھوں کی روشنی سے وہ صرف ایک لمحہ کو ٹھٹکی تھی اور پھر اگلے ہی پل وہ لائبہ کی تلاش میں آگے ہی بڑھ گئی۔

اطہر بھائی اور عروج تو ولیمے کی شام ہی کو ہنی مون ٹرپ پر روانہ ہو گئے تھے، اطہر بھائی کے دوست نے شادی پر گفٹ کی صورت میں پاکستان میں موجود تمام خوبصورت مقامات کی سیر کا انتظام کروا دیا تھا۔

اگلے دن باقی مہمانوں نے بھی رخت سفر باندھا، اسماء وغیرہ نے خاص طور پر خوشان سے گھر آ کر الوداعی ملاقات کی تھی، ساتھ ہی وہ شادی کی تصویریں بھی لائی تھیں۔

"ہائے لائبہ یہ تصویر میں لے لوں؟" خوشان نے برات والے دن کی اپنی گروپ والی تصویر دیکھی جو حیرت انگیز طور پر بہت ہی زیادہ اچھی آئی تھی، حیران حیران آنکھوں اور دبی مسکراہٹ میں وہ خود کو بھی پہچان نہیں پائی اس لیے کہہ بیٹھی۔

"بھئی مجھ سے کیا کہتی ہو جن کی تصویریں ہیں ان سے مانگو، ہماری جب آئیں گی تو میری جان بے شک سب کی سب رکھ لینا۔" لائبہ نے مسکرا کر کہا تو وہ اسماء کی شکل دیکھنے لگی۔

"وہ چند ہیں میں دے تو دیتی مگر بھائی جی نے کہا تھا کہ البم میں تصویروں کی ترتیب بھی ادھر ادھر نہیں ہونی چاہیے، میں بھائی جی سے پوچھ کر دے دوں گی۔" اسماء نے شرمندہ سے لہجے میں کہا، خوشان نے "چلو رہنے دو" کہہ کر بات ختم کر دی۔

وہ سب جانے کے لیے تیار تھے، بڑے سے لان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے خیال رکھنے کی ہدایات کرتے وہ خوش بھی تھے اور اداس بھی، گاڑیوں میں سامان رکھا جا چکا تھا اسی لیے خواتین نکل کر اجازت لے رہی تھیں۔

"اچھا دوستوں خدا حافظ۔"

"پھر جلدی چکر لگائیے گا۔" لائبہ نے کھڑکی سے اندر منہ کر کے گویا صاحب کے کان میں صور پھونکا تھا۔

"آرام سے خاتون۔" فرنٹ ڈور کھولتے زراب نے لائبہ سے کہا تو وہ اسی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم بھی جلدی آنا، بھول مت جانا یوں بھی تمہاری یادداشت پر جھاڑو بہت جلد پھر جاتی ہے۔" لائبہ نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ زراب سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرے گی۔

"اگر کہو تو یہیں رہ جاؤں سوچو ذرا میری یادداشت پر جھاڑو پھر جاتی ہے تمہاری تو عقل ہی چٹ گئی ہے، اسے سمجھانا ہو چکا ہے، باقی جو کسر رہ گئی تھی وہ اس کمبخت نے پوری کر دی۔" صاف جتانے والا انداز تھا۔

"اچھا اب بکواس بند کرو اور چلو مرو۔" لائبہ نے اسے منہ چڑانے کے بجائے معاف کر دیا تھا۔

"اچھا..... اچھا خدا حافظ، ویسے جلدی آؤں گا۔" اس نے ایک نظر خوشان پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی لائبہ نے حیرت سے لمبا ہیں کہا تھا، مگر گیٹ سے نکلتی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا زراب اپنی آنکھیں ان حیران آنکھوں کے ارد گرد کہیں چھوڑ آیا تھا، مگر ہونٹوں پر مستقل چپکی مسکراہٹ اس کے چہرے کو بہت روشن کر رہی تھی۔

"تم مانو نہ مانو میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اس نے صاف تمہارے اس حسین چہرے پر نظر جما کر ہی کہا تھا کہ جلد آؤں گا، ہائے کاش وہ بے وقوف اپنی منگنی سے پہلے ہی...... مگر ناممکن خاندان سے باہر شادی، ایک تو دادے بزرگ نہ جانے کیا چاہتے ہیں؟ جب مذہب نے اجازت دے دی ہے تو....." لائبہ اپنے ہی قیافے اور اندازے لگا رہی تھی کہ خوشان جو خاموش بیٹھی تھی بول پڑی۔

"تم خوامخواہ کی کوشش ہو رہی ہو، ایسا کچھ نہیں ہے۔" حالانکہ اس کا دل سارے پچھلے منظروں میں الجھا "ہے..... ہے" کی رٹ لگا رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا کہا ایک مہینے کے لیے جا رہی ہو؟ تمہارا دماغ درست ہے؟" لائبہ نے حیرت اور صدمے سے خوشان کو دیکھا اور چلائی۔

"بھئی کیا ہے ایک ماہ میں قیامت تو نہیں آ

اٹھنے لگے۔

"خوشان ڈیئر میں تم سے یہ پوچھ رہی ہوں، مس خوشان صدیقی مسز زراب علی شاہ کو پسند کرلی ہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" خوشان نے بہت آہستگی سے کہا مگر لائبہ شاہ کی ڈارک براؤن آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں کہ خوشان کے چہرے پہ بکھرے رنگ اس کے الفاظ کی نفی کررہے تھے۔

"وہ تو یہ سب کیسے ہوگیا؟" وہ ان دونوں کے ہی کتنے قریب تھی مگر محبت کا یہ کھیل کتنی خاموشی سے مگر کتنی تیزی سے کتنا آگے تک بڑھ گیا تھا اور اسے ہی خبر نہ ہوسکی۔

"خوشان یہ سب کیسے ہوا؟" اپنے لبوں پہ آیا سوال اس نے پوچھ لیا۔

"کیسے؟ پتہ نہیں۔" خوشان نے آہ بھر کر کہا۔

"تم نے کبھی بھی نہیں بتایا؟" لائبہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بتاتی کہ تمہارا وہ کزن بقول تمہارے فضول، بگڑا، لکھوا جس کی ایک عدد منگیتر بھی ہے مجھے اچھا لگنے لگا ہے، مجھے اس شخص سے محبت ہوگئی ہے جو رسم و رواج کے علاوہ زنجیروں رشتوں کی زنجیروں میں قید ہے نہیں میں اتنی بے وقوف اور کم ظرف نہیں ہوں کہ اپنی غرض کے لیے کسی کی آنکھوں کے سب رنگ چھین لوں، میری محبت میرے لیے کافی ہے۔" خوشان نے لائبہ کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

"مگر تمہیں خبر نہیں ہے وہ بھی......" لائبہ نے خوشان کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیں۔

"ہاں یہ میری خوش نصیبی ہے اور بدنصیبی بھی۔" خوشان کے نہ صرف ہونٹ بلکہ آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

"ہاں مگر کوشش تو کی جاسکتی ہے ناں، کیا خرافات ہیں، اونچ نیچ، رسم و روایت کی ان دیواروں میں دراڑ ڈال کر راستہ بنانے کا سہرا اس بگڑے کے سر ہی سجتا ہو، قسم سے اسے خبر ہو جائے نہ کہ تم بھی تو وہ تو پاگل ہو جائے، ویسے پاگل تو اب بھی ہے کہ ان دونوں کی چیخ رہا ہے کل صبح کی فلائٹ سے۔" لائبہ نے شاید تصور کی آنکھ سے ہی اس کی درگت بنتی دیکھ کر لطف لیا تھا۔

"مگر میں ابھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے اسے یا کسی کو بھی کوئی پریشانی ہو۔" خوشان نے لائبہ سے کہا تو لائبہ نے اسے بے وقوف کا لقب دے کر گلے لگالیا۔

☆☆☆

بہت یقین رہا تھا جو وفاؤں کا
بدل گیا ہے وہ رخ دیکھ کر ہواؤں کا

"کیا میں نے کب تم سے کسی مدد کا کہا ہے، اپنے آپ سے ہی لگے ہوئے ہو، اتنی دیر سے میرا مغز چاٹ رہے ہو، بہتر ہوگا کچھ دیر اپنی اس زبان کو اور اس بے چارے وجود کو آرام دے لو تاکہ تمہارا یہ خناس بھی کم ہو اور یہ کیا میرے پیچھے سائے کی طرح لگ گئے ہو۔" لائبہ نے سلاد سجا کر فریج میں رکھ کر پلٹی تو سر پہ کھڑے زراب کو دیکھ کر جھنجلا گئی، جو مسلسل کچن میں موجود اس کے صبر اور برداشت کا امتحان لے رہا تھا، جبکہ لائبہ اس کی بے چینی اور بے تابی پہ محظوظ ہو رہی تھی۔

"اچھا میں ایک شرط پہ تمہاری جان چھوڑوں گا کہ تم میری مدد کرو گی ڈیئر کزن۔" زراب نے کہا تو لائبہ نے "سوچوں گی" کہہ کر جان چھڑوائی۔

"اچھا میں صرف آدھے گھنٹے بعد پھر سے تمہارے سامنے ہوں گا۔" زراب نے احسان

کرنے والے انداز میں کہا اور لاؤنج میں ہی صوفے پر کمبل لے کر ڈھیر ہوگیا۔

خوشان نے لاؤنج میں قدم رکھا تو ٹھٹک گئی صوفے پہ کمبل تانے بیٹھا وہی تھا، کچن میں سامان بناتی لائبہ اپنے کام میں مشغول تھی اس لیے خوشان دبے پاؤں بالکل سائیڈ سے نکلی، ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا کہ زراب کی آواز پہ ٹھٹک گئی۔

جو ساری عمر مجھ سے دور دور چلا رہا
وہ آس پاس یوں بکھرا ہے جیسے خوشبو ہو
بس اس امید پہ خوابوں میں عمر کاٹی ہے
میں آنکھ کھول کر دیکھوں تو سامنے تو ہو

"زراب یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس کے شعر گنگنانے کے بلند آواز میں گانے پہ لائبہ نے مڑ کر دیکھا تو سامنے سرخ چہرے سمیت خوشان اور چوکھٹ پہ کھڑے مسکراتے زراب پہ نظر جمادی۔

"ارے تم کب آئیں؟" لائبہ نے خوشان سے پوچھا جو فقط زرد سی کھڑی تھی۔

"ابھی...... میں پھر آؤں گی۔" خوشان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

رخصت ہوا تو آنکھ ملا کر نہیں گیا
کیوں کیا ہے یہ بھی بتا کر نہیں گیا
رہنے دیا نہ اس نے کسی کام کا مجھے
اور خاک میں بھی مجھ کو ملا کر نہیں گیا

"زراب کے بچے۔" شعر ختم ہونے ہی لائبہ کی دھاڑ سنائی دی تھی اور خوشان گیٹ سے نکلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ راستے یہ بندہ بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے۔

☆☆☆

"ایسا لگ رہا ہے میدان جنگ میں فتح کا جھنڈا لہرا کر واپس جا رہے ہو۔" لائبہ نے زراب کے ہونٹوں پر چمکتی مستقل مسکراہٹ اور کالی سیاہ آنکھوں میں چمکتے جگنو دیکھ کر کہا۔

"ہاں محبت کی بازی میں جیت کا اپنا ہی نشہ ہے، کسی کو چاہنا اور پھر اس چاہ کو پالینا بھی تو خوش بختی ہے، بس دعا کرو آگے بھی تمام مراحل اسی قدر آسانی سے طے ہو جائیں، ایسا لگ رہا ہے دو ہفتوں میں دو سو سال کا سفر دو پل میں طے کیا، زندگی اتنی حسین اتنی خوبصورت......" زراب نے سرخ گلاب کے پھولوں سے بھرے پودے پہ نظریں جمائے ہوئے کہا تو چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے لائبہ نے اس کی محویت توڑتے ہوئے کہا۔

"کون......؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس کی جس کا نام لوں گا تو تم خونخوار بلی میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاؤ گی کہ اپنے رومز لے سے نام کیوں لیا؟ لائبہ تم میرا اعتبار کیوں نہیں کر لیتی چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، آسمان زمین ایک ہو جائیں میں سید زراب علی شاہ وقوں سے کبھی نہیں پھروں گا اور نہ ہی لائبہ شاہ کی عزیز از جان اکلوتی سہیلی محترمہ خوشان علی صدیقی کو بھی دھوکہ نہیں دوں گا، اب چلیں؟" اس نے چائے کا خالی کپ لائبہ کو تھما کر کہا تو وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یعنی اسے الہام تو نہیں ہوگا کہ میں شام کو چلا جاؤں گا، خدا حافظ ہی کہہ دیں آؤں۔" زراب نے مسکرا کر شرارت سے اس کی طرف دیکھا، مگر شاید خوشان صدیقی کو الہام ہونے لگے تھے، جبھی ٹھیک چند منٹ بعد وہ ہی لان میں گلاب کے بھرے بھرے سرخ سرخ پھولوں کے بوجھ سے جھکے پودوں کے پاس بہت بوجھل سی بیٹھی تھی، چہرہ پرملال اور آنکھیں بہت اداس لگ رہی تھیں اور

مگر ایک وہی تھا جو مسلسل مسکرا رہا تھا، اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو ہنسنے کی تلقین اور مسکرانے کی نصیحت کر رہا تھا اور وہ بے چاری مسلسل مسکرانے کی کوشش میں آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سارے راستے مزاب لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، ائیر پورٹ سے ٹیکسی لے کر وہ سیدھا سادات ہاؤس کی طرف رواں تھا، مین روڈ پر ٹرن لیتے ہوئے خوشنان صدیقی کی نم آنکھوں مگر مسکراتے لبوں کے تصور میں کھوئے مزاب نے سامنے سے آتے ٹرالے اور اس کے ہارن کی تیز آواز سنی کہ ایک دھماکے سے وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ایک لائحہ عمل اللہ تعالیٰ کا بھی ہے جس کے آگے سب بے بس ہیں۔

☆☆☆

"لائبہ دیر نہیں ہو گئی؟" خوشنان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یار تم تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہو رہی، ملتان پہنچ کر سب سے پہلے فون کرے گا، مجھے سو فیصد یقین ہے اور ائیر پورٹ سے بھی تو فون کیا ہی تھا، تو ذرا صبر کرو۔" لائبہ نے بے چارگی سی شکل لیے خوشنان کی طرف دیکھا اور خود مسکرانے لگی، بظاہر وہ شرارت کے موڈ میں تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، فون کی تیز بیل نے اس کے قدموں اور خوشنان کے دل کی دھڑکن کو بہت تیز کر دیا اور اگلے ہی پل میں لائبہ شاہ کی دلدوز چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔

امی اپنے کمرے سے دوڑتی ہوئی آئی تھیں، ابا جان جو ناسازی طبع کی وجہ سے گھر پر ہی آرام کر رہے تھے گھبرائے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے [illegible] اور پیلی رنگت سب کہہ رہی تھی، خوشنان پتھر کی ہو گئی تھی اور وہ ریسیور ہاتھ میں لیے ابا جان نے جو خبر سنی تھی وہ ان کے حواس بھی گم کر گئی تھی، مزاب علی شاہ ایکسیڈنٹ میں خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔

لائبہ شاہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی، امی جان اکلوتے بھانجے کی اچانک موت پر سسکیاں بھر رہی تھیں اور خوشنان صدیقی خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی، اپنے کمرے میں بند وہ سسک رہی تھی کہ سب کے سامنے وہ کیونکر آنسو بہاتی، کس حوالے سے، کس تعلق کی بنا پر، وہ مزاب علی شاہ کی جدائی پر بین کرتی۔

"مزاب علی شاہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، تم نے مجھے خوابوں کی شاہراہ پر اکیلا اور ادھورا چھوڑا ہے۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور پھر کانچ جیسے نازک سپنوں کی ٹوٹی کرچیوں کے زخم دل پر اور روح پر سہتی وہ بے دم ہو گئی تھی اور بند ہوتی آنکھوں میں روشن روشن مسکراتی، چمک کرتی، محبت سے بھری دو آنکھوں نے اپنا عکس چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

چند گھنٹوں میں ہی سب رشتہ دار خواتین سادات ہاؤس اور مرد حضرات ہسپتال میں تھے، مگر شدید حادثات میں وہ ڈیڈ ایکسیڈنٹ کے تحت کیس تھے، اس لیے خاصا انتظار کرنا پڑا تھا اور ان اذیت ناک لمحوں کا پل پل عجیب کیفیت سے بھرپور تھا، جائے وقوعہ پر سامان اور سفری بیگ سے ملنے والے شناختی کارڈ وغیرہ سے پولیس نے مزاب کا نام پتہ معلوم کیا تھا، مگر اب ہسپتال میں کوا کسی کو بھی ان قیامت خیز لمحوں کی اذیت کا اندازہ نہ تھا، پولیس گویا اپنا فرض ادا کر کے بری الذمہ ہو گئی تھی، وہ سب [illegible] سے بے خبر تھے، پھر اٹھارہ گھنٹے بعد نعش ان کے حوالے کر دی گئی تھی مگر اس حالت میں کہ قابل شناخت حالت میں نہ تھی، ٹرالے نے جس بے دردی سے ٹیکسی کا غذ کا گولا بنا دی تھی اس سے زیادہ برا حشر تو پوسٹ مارٹم کے نام پر اس انسان کا کیا تھا جو ذرا سی خراش آنے پر واویلا کر دیا کرتا تھا مگر اب اتنی چیر پھاڑ پر وہ تو خاموش تھا مگر سارا درد، تکلیف، غم اس کے پیاروں کے دل پر زخم لگا گیا تھا، جس کے چند گھنٹوں بعد ہی شہر خاموشاں میں ایک اور کتبے کا اضافہ ہو گیا تھا، جس پر لکھا نام دور سے نظر آ رہا تھا سید مزاب شاہ۔

☆☆☆

سات سال کے اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں، لائبہ شادی کے بعد ملتان چلی گئی تھی، اظہر بھائی کمپنی کی طرف سے سعودی عرب سدھار گئے اور خوشنان صدیقی اپنی بے قراری بے چینی لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلی گئی تھی، جبکہ خوبان کی شادی ہو گئی تھی اور وہ کراچی میں رہائش پذیر تھی۔

خوشنان جس اذیت ناک سوچوں اور تکلیف دہ یادوں سے جان چھڑا کر سات سمندر پار آئی تھی وہ تو اب بھی ہر دم اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔۔۔۔۔ سوچ کر رہ جاتی بھلا لوگ کس طرح بھلا دیا کرتے ہیں یا بھول جایا کرتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن و دل پر لگے زخم گہرے ہوتے جا رہے تھے اور یادوں کے دیمک بھی، مزاب شاہ کو بھلانے میں اس نے خود کو بھلا دیا تھا مگر نہ بھولا تھا وہی ایک شخص، باقی سب کچھ یادداشت سے مٹ گیا تھا۔

☆☆☆

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخم دل بھی تمہارے ہوں گے دور
آج ان کو کوئی خبر کر دو
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

خوشنان نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسی لیے لائبہ کو بھی خط لکھ دیا تھا، جسے پا کر لائبہ خوش بھی تھی مگر ساتھ ہی بے طرح اداس بھی۔

خوشنان صدیقی نے اسلام آباد ائیر پورٹ پر قدم رکھا تو گویا ہوائیں بھی اسے خوش آمدید کہتی لگیں اور جانے پہچانے راستوں سے گزرتے ہوئے خوشنان صدیقی اکیلی نہیں تھی، مزاب شاہ کی یاد کی صورت اس کے ساتھ تھا۔

مما اپنی لاڈلی کی گم صم حالت پر از حد پریشان تھیں، ڈیڈی بھی اس کی اس حالت پر فکرمند تھے انہوں نے اس کی بڑھتی ہوئی خاموشی، بیزاری اور اکتاہٹ کے پیش نظر ہی تو اسے امریکہ بھیجا تھا کہ ماحول کی تبدیلی ہی اس میں کوئی پوزیٹو چینج لے آئے مگر جب سے وہ آئی تھی مما کی پریشانی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، حد درجے کی خاموشی، آنکھوں کی ویرانی اور تو اور آدھی آدھی رات کو اٹھ کر لان میں ٹہلنے کا شغل مما کو سراسیمہ کر گیا تھا، حالانکہ امریکہ سے انہیں اپنی فرسٹ کزن جن کے ہاں خوشنان رہی تھی نے ہر بار ہی فرسٹ کلاس کی خبر دی تھی اور خود خوشنان سے بھی جب بات ہوتی وہ انہیں خوش ہی لگتی، مگر اب مما سمجھ رہی تھیں کہ انہوں نے اسے خود سے دور کر کے غلطی کی تھی، وہ وجہ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں جس کی بدولت ان کی پیاری بیٹی ذہنی و اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تھی۔

☆☆☆

مریم شاہ کو خاندان بھر میں امتیازی حیثیت دی جانے لگی تھی، سادات ہاؤس میں

کرنے کی حیثیت و اہمیت وہی تھی جو ایک مٹن جاتی اکلوتی بہو کی ہوا کرتی ہے، اس کا حکم سر آنکھوں پر ہوتا اور کیوں نہ ہوتا آخر کو وہ شاہ کبیل کے لاڈلے سپوت کی منگیتر تھی، وہ خود تو اس دنیا میں نہیں رہا تھا مگر اس کی بدولت سمرینہ شاہ کا مقام متعین ہو گیا تھا اور اسی تعلق کی بنیاد پر ہی سمرینہ شاہ کو سادات خاندان کی طرف سے عزت، احترام، محبت اور پیار ملا تھا۔

تلخ لہجے اور کڑوی زبان والی سمرینہ شاہ جسے تراب علی شاہ نے اپنے ماں باپ کی خواہش پر بغیر کسی زور کے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا اس وقت جب خاندان اور لمبی چوڑی برادری میں موجود لڑکیوں نے دبے دبے انداز میں بابھر با دل اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بھی محض یہی کہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کی کالی گھنیری زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ کر تراب علی شاہ اس کی محبت میں گرفتار ہے، تبھی تو وہ کسی قدر مغرور ہو جاتی تھی، سرد مہر اور سب کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنے والی سمرینہ شاہ اس وقت ہاتھ میں پکڑی تصویروں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بھلا خوشان صدیقی میں ایسی کیا بات ہے؟ کہ اس کی تراب کی پرسنل ڈائری تک ہے۔

تصویروں کی پشت پر لکھے تراب کے خوبصورت تحریر میں اشعار اور عکس اس لڑکی کے لیے اس کے دلی جذبات کے آئینہ دار تھے، محبت میں ناکامی تو اس کا مقدر رہی تھی، چاہے وہ تراب کو پا لیتی تب بھی، شکست تو اس کا نصیب تھی اور محبت جیسی جیتی کا ہنر دیتی ہے تبھی اس نے اپنے اردگرد بکھری تشنگی محبتوں کو ان کی منزل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سفید چادر میں لپٹی سمرینہ ایک بزرگ کی

طرح خاندان بھر کے فیصلے کرنے کی مجاز تھی، لائبہ کی بیٹی معذور پیدا ہوئی، اکمل بھائی کے دوسرے بیٹے کے دل میں بھی سوراخ تھا، اسماء کے تلے اوپر چار بچے ہوئے مگر زیادہ عرصہ نہ جی سکے اور یہ سب شاید کزن میرج کے شاخسانے بتائے جا رہے تھے، مگر بڑوں کے آگے بولنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور سمرینہ شاہ سوچ رہی تھی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خواہ مخواہ کے رسم و رواج کا خاتمہ ہو، دین و مذہب کی روشنی میں زندگی کی راہیں استوار کی جائیں اور اپنی سوچ عملی شکل اس نے صالح کے حق میں فیصلہ کر کے ہونے دی تھی، جو اپنے آفس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور خود راسیہ بھی کی برسوں پرانی منگنی کے باوجود اس سے شادی پر رضامند ہو گئی تھی، اس فیصلے پر جہاں مختلف قسم کے اعتراضات نے سر اٹھایا تھا وہیں کچھ چہروں پر شادابی اور دلوں میں اطمینان اتر گیا تھا۔

☆☆☆

مما خوشان کی ساس کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر حاضری دینے جا رہی تھیں، انہوں نے خوشان کو بھی بمشکل راضی کیا تھا کہ وہ بھی چلے تا کہ ماحول اور آب و ہوا کی تبدیلی ہی اس پر اپنا خوشگوار اثر ڈال دے، پھر انہوں نے لائبہ سے ملنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا، کیونکہ ملتان وہاں سے تھوڑا ہی آگے تھا، لائبہ کے بچوں سے ملنے کا بھی اسے بہت اشتیاق تھا، یوں وہ بھی ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی۔

"حضرت شاہ" کے مزار پر چادر چڑھانے اور عرس میں شامل ہونے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور آج تو شاہ صاحب کے دربار کے خاص مجاور نے سارے احاطے میں چراغ روشن کیے تھے اور یہ بہت حیران کن بات تھی، یہاں

آنے والے جانتے تھے کہ سائیں تو ہر وقت مراقبے میں ہی رہتا ہے، کسی نے بھی اسے کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا، آنے والے سائیں جی سے دعا کروانے آتے مگر بہت کم ایسا ہوا تھا کہ سائیں جی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔

سائیں جی تو چراغ روشن کرنے کے بعد اپنی جگہ بیٹھ کر پھر سے اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، آنکھیں بند کیے گردن جھکائے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سائیں جی کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔

خوشان نے مما اور آنٹی رخسانہ کے ہمراہ جیسے ہی درگاہ کے احاطے میں قدم رکھا تو گلاب، موتیے اور پھر اگربتیوں کی مہک ہوا میں رچی ہوئی تھی، لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی، جس نے خوشان کو الجھن ہونے لگی تھی، کہاں کہ وہ اتنی بھیڑ میں گھس کر دونوں خواتین کے ساتھ آگے تک جاتی اس لیے وہ دور سے ہی دعا وغیرہ پڑھ کر اس نے مما سے کہا تو آنٹی نے اسے برگد کے درخت کے پاس بنے بینچ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے کو کہا۔

وہ بینچ پر جیسی بڑی سی چادر میں لپٹی سمٹ کر بیٹھی سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی، لوگ اپنے اپنے من کی مراد پوری ہونے کی دعا کر رہے تھے مگر وہ سوچ رہی تھی۔

کیا
کوئی ایسی دعا بھی ہے
جو اس کے من کو شانت کر دے
اس کے دل سے تراب شاہ کی یاد کو نکال دے
کاش کوئی دعا کوئی ورد ایسا ہو
تراب شاہ، جس کے کرنے سے میں تمہیں بھول جاؤں
کاش اے کاش

آنسو اس کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیوں کی صورت میں گر رہے تھے، وہ اردگرد سے بے نیاز شاید کسی معجزے کی منتظر تھی کہ اسے اپنے وجود پر گہری نظروں کا احساس ہوا تھا شاید وہ خود سے بھی بے خبر بیٹھی تھی گھبرا کر نظریں اردگرد دوڑائیں مگر کون اتنا فارغ تھا کہ اس پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا، مگر وہاں کوئی ہے تو ضرور، خوشان کی چھٹی حس پوری طرح کام کر رہی تھی، بینچ سے اٹھ کر چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ آگے بڑھی تھی کہ ڈھیر سارے گلاب کے پھولوں نے اس کے قدموں کی سمت بدل دی۔

سفید براق لباس میں کاندھوں پر صاف ستھری شال ڈالے مودب انداز میں بیٹھے سائیں جی نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی، ہونٹ ورد سے خالی تھے، آنکھیں ہنوز بند تھیں، بڑھی ہوئی داڑھی اور کاندھوں تک آتے کالے بال، مگر وہ جسم کی حد درجے معصومیت و پاکیزگی لیے جو چہرہ خوشان صدیقی کے سامنے موجود تھا اسے تو وہ ایک پل میں ہی پہچان گئی تھی۔

"تراب شاہ" خوشان کے ہونٹوں سے نکلنے والا نام فضا میں مرتعش ہوا تو چراغوں کی لو اور تیز ہو گئی، گلاب اور موتیے کی مہک کچھ اور بڑھ گئی، سرخ گلاب اور موتیے کی پاکیزگی میں نورانیت جھلکنے لگی، اس کے پاؤں تو زمین پر جم گئے اور دل کی دھڑکن سرپٹ دوڑنے لگی، شاید زمین کی گردش رک گئی تھی۔

"تراب......!" اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سرگوشی کی تھی۔

"تراب! یہ دیکھو میں ہوں خوشان۔" اس کا لہجہ خود بخود بھیگ گیا، آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

اگلے ہی پل بند آنکھیں کھلیں، وہ دن جگمگ

کرتی آنکھوں نے آنسوؤں سے تر چہرے کا احاطہ کیا پھر اپنا کیلا ہاتھ دیکھا اور اسے سینے پر رکھ لیا تھا، روشن آنکھیں ایک بار روشنی کی تلاش میں اندھیروں کے سفر پر روانہ ہو گئی تھیں اور ادھر خوشان کے ہونٹوں سے ایک ہی نام نکل رہا تھا، تراب شاہ.....تراب شاہ۔

"بیٹا کیوں تنگ کرتے ہو سائیں کو؟ جنہیں روحانی روشنی مل جائے ناں انہیں مادی دنیا کے اندھیروں میں نہیں گھسیٹے، عشق الٰہی اور عشق حقیقی تک رسائی آسان نہیں اور جنہیں قرب خدا نصیب ہو جائے ان کے لئے اس فانی دنیا میں کوئی کشش نہیں رہتی۔" دربار کے گدی نشین نے نرمی سے اسے سمجھایا اور سسکتی ہوئی خوشان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"مگر یہ یہاں؟" سوال خود بخود لبوں سے نکلا تھا۔

"چند سال پہلے ہائی وے کے نزدیک زخمی حالت میں ملا تھا، شاید حادثے کے وقت اپنی جان بچانے کے لئے گاڑی سے چھلانگ لگانے سے سر پہ شدید چوٹ کی بدولت یا پھر موروثی اعصابی کمزوری کی وجہ سے یہ اپنی سمجھ بوجھ اور یادداشت سے ہاتھ دھو بیٹھا، اپنے طور پر تو ہم نے اس کے وارثوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی، اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے بارے میں جاننے میں مدد دیتی، پھر ظاہری بات ہے ہم اسے یہاں لے آئے اور چند دنوں میں ہی ہمیں ادراک ہو گیا کہ بندہ اپنے اصل تک پہنچ گیا، اللہ سے جڑ بیٹھا اور اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے یہ تو اب اور راستے کا مسافر ہے۔" وہ خوشان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولے، شاید وہ ادراک کی سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگ گئے تھے کہ یوں بھی اس بے حال سی لڑکی کا کیا تعلق ہے اس سائیں کے ساتھ۔

واپسی کے لئے پلٹتے ہوئے خوشان صدیقی اپنی روح وہیں کہیں چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

رات کو خوشان صدیقی کی آنکھیں بند ہوتے ہی گویا روشنی روح تک در آئی تھی، برگد کے درخت تلے وہ تراب علی شاہ سے ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی، چراغ جلاتی، موتیے کی کلیاں چنتی، کبھی ہنستی، کبھی روتی، کبھی تتلیوں اور کبھی جگنوؤں کے پیچھے بھاگتی۔

پھر وہ تھک گئی اور ایک رات تتلیوں کے تعاقب میں نکلی تو وہ واپسی کا راستہ ہی بھول گئی، اس کی پرسکون نیند سوتی کی آنکھوں پہ کسی خواب کا بوجھ نہ تھا، اس رات کی صبح صدیقی ولا میں بہت عرصے بعد سب جمع تھے، نم آنکھوں اور دکھے دل سمیت سب خوشان صدیقی کی جوان موت پہ افسردہ تھے، اس کی تعریفیں کر رہے تھے، اسے یاد کر رہے تھے اور ان سب سے بے نیاز خوشان صدیقی کے لبوں پہ ایک آسودہ مسکراہٹ لئے آنکھیں بند کیے آخری منزل پہ جانے کے لئے تیار تھی۔

اور کسی کو بھی خبر نہ ہو گی کہ شام کے لوکل اخبار کے ایک کالم میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی۔

"حضرت شاہ کے مزار پہ ہی رہنے والے سائیں بابا کی حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ....." اس کے آگے وہی لکھا تھا جو ایسے موقع پر اخبار والے لکھتے ہیں، مگر کوئی نہیں جانتا تھا دو الگ الگ راہوں کے مسافر آخر کو اپنی ایک منزل کی طرف رواں ہو گئے تھے، ایک عشق حقیقی کے ذریعے اور دوسرا عشق مجازی کے لیکن جاتے ہوئے دونوں ہی سرخرو تھے۔

☆☆☆

"چلو بچے کب سے آواز یں دے رہی ہوں مگر تم میں سے کوئی سنتا ہی نہیں۔" روش نے چھت کی ریلنگ سے نیچے دیکھتے ہوئے اپنے تینوں بچوں سے کہا، جو بہت مگن اور خوش نظر آرہے تھے، اسی لئے انہیں خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ کب روش سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔

"بس مما آنے ہی لگے تھے مگر......" آٹھ سالہ جینال نے کچھ کہتے کہتے رک کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، جو اس کی ادھوری بات کو سمجھ گئی اور اس کی دلچسپی کا مقصد بھی جانتی تھی۔

"جینال! آپ کے بابا آنے والے ہیں، کومل اور آدم کو لے کر نیچے چلو، میں آرہی ہوں۔" روش نے سنجیدگی سے کہا، تینوں بچے سر ہلا کر خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے، روش نے نیچے سے آتی آوازوں اور شور پر ریلنگ کے نیچے جھانکا تھا، ٹرک سے سامان اتر رہا تھا، مزدور سامان اٹھا اٹھا کر اندر رکھ رہے تھے۔ سامان اٹھانے اور گھسیٹنے کی آوازیں مل کر عجیب سا شور پیدا کر رہی تھیں۔

"ہوں، نئے کرائے دار آ گئے ہیں۔" روش نے گہری سانس لی اور کسی سوچ میں ڈوبی نیچے اتر آئی، کومل اور آدم ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی توجہ ٹی وی سے زیادہ باہم کھیلنے میں تھی، جبکہ جینال اپنی ڈرائنگ بک پر جھکی ہوئی تھی، روش تینوں کو مصروف دیکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"مما نئے کرائے دار آ گئے ہیں، کیا ہمیں نیچے لان میں جانے کی اجازت ملے گی۔" جینال نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کافی دیر سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا، کیونکہ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا، کرائے داروں کے آتے ہی ان تینوں کا نیچے بڑے سے لان میں جانا منع ہو جاتا تھا۔

"جینال اپنے بابا سے پوچھ لینا مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو۔" اپنی ہی سوچوں میں پھنسی روش نے چڑ کر جواب دیا تھا اور کچن میں جاتے ہوئے اس کی نظر اس کھڑکی پر پڑی جس سے نیچے والے پورشن کا ٹی وی لاؤنج صاف نظر آتا تھا، روش نے پاس جا کر اچھی طرح جائزہ لیا، کھڑکی مضبوطی سے بند تھی، مداخلت کا امکان نہیں تھا، روش اطمینان بھری سانس لیتی کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

"کیوں درخشندہ بیگم مانتی ہیں ناں اتنے کم کرائے میں اتنا بڑا اور عالیشان گھر ڈھونڈنا ہمارا ہی کام تھا۔"

قیوم صاحب نے اپنی باریک سی آواز میں کھنچتے ہوئے فخریہ گردن اکڑائی تھی، دھان پان سے قد و قامت کے قیوم صاحب کی شخصیت دیکھنے میں ہی کافی مظلوم اور مسکین ٹائپ لگتی تھی اور اوپر سے باریک آواز اور جی حضوری والا انداز، ان کی شخصیت کو مزید کمزور دکھا کر پیش کرتا تھا۔

درخشندہ بیگم پنجاب سے بچپن کے لک بھگ، سرخ و سفید رنگت کی مالک، اونچا لمبا قد و قامت اور فربہی مائل جسم کے ساتھ ساتھ بہت بارعب خاتون بھی تھیں، کچھ جوانی میں ان کے حسن کا رعب اور کچھ ان کی دبنگ شخصیت کے سامنے قیوم صاحب بالکل ہی اپنا آپ چھوڑ بیٹھے تھے، اسی لئے ان کا گزارہ بہت اچھے طریقے سے ہوا تھا، دونوں کے پانچ بچے تھے، بڑے دو بیٹے شادی شدہ اور دیار غیر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش و خرم آباد تھے، خوش و خرم بھی اسی لئے کیونکہ ماں اور بہنوں سے دور تھے، ورنہ جب تک ان کی بیویاں یہاں پر رہتی تھیں زندگی میدان جنگ کا منظر پیش کرتی تھیں، ماں بیٹیوں نے مل کر اپنے اپنے شادی شدہ بیٹے جو بہانے بنا کر باہر چلے گئے تھے، کیا پتہ انہیں بھی ہوب سکھانے یاد کرائے ہوں گے۔

دراصل ہماری ہیروئن کلاس، گھریلو خواتین کو آگے بڑھنے کے مواقع نہیں ملے ہوتے اسی لئے ان کے دماغ کی ساری زرخیزی اور توانائی گھریلو سیاست اور سازشوں میں استعمال ہوتی ہے۔

دونوں بیٹیاں خیر سے شادی شدہ، اور اسی شہر میں آباد تھیں اسی لئے تو آئے روز میکے کا رخ کیے رکھتی تھیں، جہاں ان کے آنے پر بھابھیوں کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں اور وہاں ہی دوسری طرف ان کے میکے جانے پر شوہر اور اس کے گھر والے شکر کا کلمہ پڑھتے تھے اور جتنے دن وہ میکے رہتی تھیں ان کے سسرال میں ہر دن عید کا اور ہر رات شب برات ہوتی تھی، خوشی ہی اتنی ہوتی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی اور ان کے واپس آنے پر سب جب کی بکل اوڑھے جنگ کا انتظار کرنے لگتے تھے۔

یہ تو تھیں شادی شدہ بیٹیوں کی کہانی، اب آتے ہیں سب سے چھوٹی اور دسویں (اس لئے کہ قد و قامت میں باپ پر گئی تھی مگر سراپے پر ماں پر) نازو کی طرف، جس کی عمر نکلی تھی مگر شادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ تیس سے اوپر نکل جانی تھی۔

بڑی دونوں کی باری بھی رشتے ڈھونڈنے میں ماتھوں کے پسینے آ گیا تھا، مگر نازو بیگم کی باری کا رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے، درخشندہ بیگم تھک ہار کر مایوس ہونے لگی تھیں، ان دونوں ماں بیٹی کا خیال تھا کہ اس کے حسن سے جل کر (جو پہلے ہی جا ہوا تھا) رشتے داروں نے تعویذ کروا دیئے ہیں، رشتے پر بندش ہے، نازو خود کو کسی بھی طرح حسینہ عالم سے کم نہیں سمجھتی تھی اسی لئے بھی کسی طرح بھی اپنے آئیڈیل سے کم پر تیار نہیں ہوتی تھی اور اسی وجہ سے اس کے ناخنوں سے جوانی کا سنہرا موسم پھسلتا جا رہا تھا۔

"ہوں گھر تو کافی اچھا اور بڑا ڈھونڈا ہے، مگر عجیب سی خاموشی اور ویرانی ہے یہاں، سنا ہے اوپر والے پورشن مالک مکان نے اپنے پاس ہی رکھا ہے، صرف نیچے والا ہی ہمیں استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔"

درخشندہ بیگم نے نازو کے ساتھ سارے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے، لاؤنج کے کونے میں بنی اوپر کے پورشن کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، یہ لاؤنج بہت بڑا تھا اور سیڑھیاں بالکل کونے میں تھیں، باقی گھر سے اس حصے کا کوئی تعلق نہیں تھا، کیونکہ یہ گھر بہت بڑا اور وسیع تھا۔

"بیگم ہمارے لئے نیچے کا پورشن بھی کافی ہے، ہم تین ہی تو بندے ہیں، ویسے بھی ہمیں نے کچھ عرصہ ہی یہاں رہنا ہے، جب تک ہمارا گھر بن نہیں جاتا ہے، میں تو حیران ہوں کہ اتنے عالیشان گھر کا، اتنا کم کرایہ، مالک مکان ملک سے باہر ہے، اسی لئے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، جتنا بھی کرایہ ہو۔" قیوم صاحب نے پراپرٹی ڈیلر کے لفظ دہراتے ہوئے فخریہ کہا تھا اور اپنے کارنامے پر کچھ زیادہ ہی اکڑ رہے تھے اور یہ بات درخشندہ بیگم کو کچھ زیادہ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"خیر ایسا بھی کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دے رہا، لگتا ہے یہ شہر کا پوش ایریا ہے مگر یہ گھر کچھ ہٹ کر بنا ہوا ہے اور پھر اتنا بڑا کہ بندہ اس میں گم ہو کر رہ جائے۔"

درخشندہ بیگم نے قیوم صاحب کے خوشی کے غبارے سے ہوا نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں آپ نے دیکھا تھا اس عورت اور بچوں کو کیسے ہمیں دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گئے تھے،

ڈیٹنگ سے، کوئی تمیز طریقہ ہی نہیں ہے کہ ہم لوگ نئے آئے ہیں، ہمارا بوجھ لینے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔" نازی نے اوپر نظر کی تو اسے چھت پہ کھڑی ایک عورت اور بچے نظر آئے تھے، مگر ان کو دیکھتے وہ بھی اندر چلے گئے تھے، نازی کو یہ بات بہت بری لگی تھی تو وہ اس کا منہ پھول گیا تھا۔

"وٹج کر...... بڑا علاقہ ہے ناں، یہاں کے لوگوں کے بھی دماغ بڑے ہوں گے، تو بھی اب یہ اپنے محلوں جیسی سوچ چھوڑ دے، پھر سے جانا ہو گھر بھی ای پوش ایریے میں بننے والا ہے، ابھی سے سیکھ لے ان جیسی حرکتیں کرنا۔" درخشندہ بیگم نے بیٹی کو سمجھایا تھا جو برے برے منہ بنا کر رہ گئی تھی، دونوں بیٹوں کے حق آرزو بہت باقاعدگی سے آتے تھے، جن سے درخشندہ بیگم نے کمیٹیاں ڈال کر اتنا جوڑ لیا تھا کہ کسی بھی اچھے ایریے میں گھر لے سکتے تھے، اسی لئے انہوں نے اپنا آبائی گھر فروخت کر کے پہلے سے خریدے گئے پلاٹ پر تعمیری کام شروع کروا دیا تھا، وقتی رہائش کے لئے اسی جگہ کو ترجیح دی گئی تا کہ پاس رہ کر اپنی نگرانی میں کام کروایا جا سکے۔

خوش قسمتی ان کے پلاٹ سے کچھ دور ہی انہیں اسی ایریے میں مناسب دو کنال کا گھر بہت کم کرائے پر مل گیا تھا۔

سدا بچت کے شوقین اور کنجوس میاں بیوی نے کم کرائے کی وجوہات ڈھونڈے بغیر اور آس پاس والوں سے پوچھے بغیر چھ ماہ کے ایڈوانس کرائے پر یہ گھر لے لیا تھا اور اب اس بڑے سے گھر میں پھرتے دونوں اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی لاپرواہی اور چشم پوشی کتنی بھاری پڑنے والی تھی ان

☆☆☆

زوبی نے کمرے میں جھانکا، تینوں بچے سو چکے تھے، زوبی نے ان کے کمرے کی لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی، بیڈ پہ دراز احمد ایک بازو آنکھوں پر رکھے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آج اتنی جلدی نیند آ گئی؟" زوبی نے لحاف کھول کر احمد کے اوپر ڈالا اور وائٹ بلب جلا کر خود بھی سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

"ہوں! آج بہت تھک گیا ہوں۔" احمد نے غنودگی میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"آپ کو پتا ہے کہ نئے کرائے دار آ گئے ہیں۔" زوبی نے کروٹ کے بل احمد کی طرف منہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"ہوں! کافی عرصے سے بیچ والا پورشن خالی پڑا ہوا تھا، ایک دن تو کرائے دار آنے ہی تھے۔" احمد نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

"جمائل کے وہ ہی سوالات، کیا جواب دوں اسے؟ بچے ہیں ڈر بھی سکتے ہیں۔" زوبی نے اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم پریشان مت ہو، میں بچوں کو ہینڈل کر لوں گا، جمائل میری بات سمجھ جائے گی۔" احمد نے غنودگی میں اپنی محبوب بیوی کو تسلی دی تھی، تو زوبی آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے سوچتے خود بھی نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔

☆☆☆

نازی چھجے سے لان کا بہت غور سے مشاہدہ کر رہی تھی، لان کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود لان میں مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوئے تھے، لان کے بیچ میں بہت خوبصورت سنگ مرمر کا فوارہ بھی لگا ہوا تھا، نازی لان میں چکر لگا رہی تھی جس وقت اس کی نظر

سامنے والے ٹیرس پر پڑی، جو یہاں سے صاف نظر آتا تھا، نازی نے اپنی ہم عمر لڑکی کو بچوں سمیت دیکھا، اسے دیکھ کر لڑکی نے بچوں کو اندر بھیج دیا تھا، اسی اثناء میں اس کا شوہر آ گیا اور دونوں عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے باتیں کرتے وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

"عجیب لوگ ہیں یہاں کے، ملنا تو دور کی بات سلام کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔" درخشندہ بیگم لان چیئر پر آ کر بیٹھیں تو نازی بڑا سا منہ بنا کر ماں سے مخاطب ہوئی تھی، جو تھوڑا سا چلنے کی وجہ سے ہی پھولی سانسوں کے ساتھ بولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تو گولی کو مار گولی، پہلے کسی کام والی کا بندوبست کرنا پڑے گا، اتنے بڑے گھر کی صفائی ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔" درخشندہ بیگم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا، نازی کو کام کرنے کی عادت نہیں تھی، اکیلے ان سے کام ہوتا نہیں تھا۔

"اماں! یہاں کوئی ہمیں جانتا نہیں ہے اور نہ ہم کسی کو، آس پاس کے گھروں سے ملنا ملانا ہو گا تو کام والی بھی مل جائے گی اور ہو سکتا ہے کوئی اچھا اور امیر گھر سے رشتہ بھی مل جائے۔" نازی نے دور کی کوڑی لائی تھی، اماں نے بے زاری سے سر جھٹکا تھا۔

"اماں کیا مصیبت ہے، آپ غریبوں کے محلے گلیوں سے نکل آئی ہیں، جہاں ایک گھر کی خبر سب کو ہوتی ہے، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، یہ شہر کا مشہور اور مہنگا علاقہ ہے یہاں کے طور طریقے بھی ذرا اور طرح کے ہوں گے، میرے خیال سے تو ایسا کرتے ہیں کل کوئی اچھی سی ڈش بنا کر آس پاس کے گھروں میں دے کر آتے ہیں اس طرح انہیں ہمارا اور ہمیں ان کا پتا چل جائے گا۔" نازی نے اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو اب پڑوسیوں سے تعلقات بنانے کے لئے فضول کا خرچ کرنا پڑے گا، یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" درخشندہ بیگم نے نیم رضا مندی سے جواب دیا تھا، دونوں ماں بیٹی حسب عادت بہت زور و شور سے گفتگو کرنے میں مگن تھیں، یہ جانے بغیر کہ کسی اور کے کانوں میں بھی ان کے الفاظ پڑ رہے تھے۔

"چلو جی کل سے ایک اور ڈرامہ شروع ہونے والا ہے، ہمیشہ کی طرح ہی۔" زوبی جو اپنے ٹیرس پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی، نیچے سے آتی آوازیں سن کر منہ بنا کر خود سے بولی تھی اور پھر سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے اٹھ گئی، آنے والی صبح اس کی سوچ اور توقع کے مطابق ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

"ہائے ہائے قیوم صاحب، کس جنم کا بدلہ لیا ہے جو ہم معصوم ماں بیٹی کو یہاں لے آئے۔" درخشندہ بیگم جو نازی کے ساتھ ابھی پڑوس کے گھروں سے ہو کر آئی تھیں اور وہاں سے ملنے والی معلومات نے دونوں ماں بیٹی کے اوسان خطا کر دیے تھے، اب دونوں لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی زور و شور سے قیوم صاحب کی جلد بازی پہ تبصرے کر رہی تھیں۔

زوبی نے نیچے سے آتی آوازوں پر لاؤنج کی طرف کھلنے والی کھڑکی جو ذرا سی کھلی ہوئی تھی، کو سختی سے کھینچ کر بند کرنا چاہا، مگر پھر بھی وہ ذرا سی کھلی رہ گئی تھی، زوبی کو ڈر تھا کہ کہیں بچے کچھ نہ سن لیں، بچوں کو سمجھانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

"آج آ جانے دو تمہارا باپ، کرتی ہوں اس سے بات خود تو صبح کے نکلے شام ڈھلے گھر آتے

ہیں، بچپے اتنے بڑے اور خوفناک گھر میں ہم ماں بیٹی تنہا پڑے رہتے ہیں۔" رخشندہ بیگم غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح قیوم صاحب ان کے سامنے آ جائیں۔

"اب کیا ہوگا؟" نازی نے خوفزدہ سے لہجے میں ماں سے پوچھا۔

"تو پریشان مت ہو بچی، تیری ماں ابھی زندہ ہے۔" رخشندہ بیگم نے نازی کا اڑا ہوا رنگ دیکھا تو اسے گلے لگا کر تسلی دینے لگی۔

"ان وینگ خاتون کے سامنے بھلا کون دم مار سکتا ہے۔" زرش نے کھڑکی کی اوٹ سے بمشکل ہنسی ہونے کی ناکامی کا غصہ خود کلامی کر کے نکالا تھا۔ اسی وقت قیوم صاحب کی بائیک کی آواز سنائی دی، بیرونی گیٹ کی چابی ان کے پاس تھی، جسے کھول کر وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاتے تھے۔

"کیا بات ہے آج ماں بیٹی میں بڑا جذباتی سین چل رہا ہے۔" قیوم صاحب نے اندر آتے ہوئے کہا، نازی ماں سے لپٹی بیٹھی ہوئی تھی، قیوم صاحب تھکے ہارے سے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"اب آپ کی باری ہے اس جذباتی سین کا حصہ بننے کی۔" زرش نے جل کر سوچا تھا اور کھڑکی کی باریک درز سے نیچے جھانکا تھا، جہاں سے وہ تینوں صاف نظر آ رہے تھے۔

"قیوم صاحب! آپ نے اچھا نہیں کیا اس عمر میں میرے ساتھ۔" رخشندہ بیگم دانت کچکچاتے ہوئے بولی تھیں۔

"مگر میں نے ایسا کیا کر دیا بیگم؟" قیوم صاحب اس الزام پر ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"بس رہنے دیجئے، کیا قصور ہے نہیں آپ، جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔" رخشندہ بیگم کا انداز جلالی تھا۔

"آخر پتا تو چلے کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ کیوں آج مزاج گرامی سوا نیزے پر ہے؟" قیوم صاحب نے سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آج میں اور نازی خاص طور پر گھیر بنا کر پڑوس کے گھروں میں گئے اور وہاں جا کر جو کچھ پتا چلا اس نے تو ہمارے ہوش ہی اڑا دیے۔" رخشندہ بیگم بولنا شروع ہو گئیں۔

"او اچھا سمجھ گیا، تو آپ دونوں اس وجہ سے پریشان ہو رہی ہیں۔" قیوم صاحب کی سمجھ میں اصل کہانی آ گئی تھی، اسی لئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آرام دہ حالت میں بولے۔

"اچھا تو آپ سب کچھ جانتے تھے، یعنی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔" رخشندہ بیگم نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا تو وہ گڑبڑا کر رہ گئے۔

"نہیں نہیں بیگم صاحبہ! آپ کے سر کی قسم، مجھے تو خود یہاں آ کر پتا چلا تھا، جس جس کو پتا چلا وہ حیران ہو کر یہی پوچھتا ہے کہ آپ لوگ "آسیب زدہ" گھر میں رہتے ہیں اور ایسے گھورتے ہیں جیسے خدانخواستہ ہم خود ہی آسیب ہیں۔"

قیوم صاحب جو کئی ہی اتنے دنوں سے لوگوں کی باتیں اور رویے برداشت کر رہے تھے سب کچھ بتاتے ہوئے بولے۔

"اور کیا پڑوس کے گھروں نے بھی سب ہی بتایا ہے کہ یہ گھر کبھی بھی زیادہ عرصے کے لئے آباد نہیں ہوا ہے، جو بھی آیا ہے نقصان اٹھا کر ہی

کیا ہے، اس گھر کے آسیب بہت خطرناک ہیں، ہائے کہیں میری جوان اور خوبصورت بیٹی پہ آسیب کا دل آ گیا تو؟" رخشندہ بیگم نے نازی کو خود سے چپٹاتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا تھا، ڈرنے کے باوجود اپنے لئے جوان اور خوبصورت جیسے الفاظ سن کر نازی اندر ہی اندر خوشی سے سرشار ہو گئی۔

"استغفار، بڑی خوبصورت ہو گی تو کسی کا دل آئے گا نا، لوگ بھی کیسی کیسی فرضی کہانیاں بنا لیتے ہیں۔" زرش نے ان کا ڈرامہ طویل ہوتے دیکھ کر اکتاتے ہوئے سوچا تھا اور واپس اندر کی طرف مڑ گئی تھی۔

"ہاں بیگم! میں نے بھی لوگوں سے کم و بیش ایسی ہی باتیں سنی ہیں، مگر تم ڈرو مت، لوگ کہانیاں بھی بنا لیتے ہیں، وہ تمہارے سامنے ہی تو اوپر والی منزل پر میاں بیوی بچوں سمیت رہتے ہیں، اس کا شوہر ملا ہے مجھے کئی بار، بتا رہا تھا کہ کافی عرصے سے ہیں یہاں پر، اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ بھی چھوڑ کر چلے جاتے۔" قیوم صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں مگر ابا، وہ تو بہت عجیب سی عورت ہے آج دونوں میاں بیوی اپنے ٹیرس پر کھڑے ہمیں دیکھ کر باتیں کر رہے تھے۔" نازی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم خود ہی ان سے سلام دعا کرو، ان سے دیوار سے دیوار ملی ہے، وہ ہی ٹھیک سے بتا سکتی ہے۔"

"ہاں کہنے کو تو آپ ٹھیک ہیں میں نے بھی بہت بار، ادھر سے ادھر اسے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے، کافی مغرور سی لگتی ہے، وہ تو کسی کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہے۔" رخشندہ بیگم نے تائید بھی کی اور ایک اعتراض بھی جڑ دیا تھا، اندر سے خوفزدہ ہونے کے باوجود ان کی کچھ تسلی بھی ہوئی تھی۔

"اور ویسے بھی ہم نے چھ مہینے کا ایڈوانس کرایہ دیا ہوا ہے اور تقریباً اتنا ہی وقت ہمارے گھر کی تعمیر میں لگے گا۔"

نازی بہت خوفزدہ نظروں سے ادھر سے ادھر دیکھتی ماں باپ کو سن رہی تھی، اس کے ذہن میں بہت سی فلموں اور ڈراموں میں دیکھے گئے سین گھوم رہے تھے، خوف کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی، نازی نے دوپٹہ اچھی طرح سر پر لپیٹ لیا اور دل ہی دل کر مختلف سورتیں پڑھ کر خود پر دم کرنے لگی۔

☆☆☆

جنائل، آدم اور دانیال کے ساتھ چھت پر بال سے کھیل رہی تھی، جب ایک زوردار ہٹ سے بال اڑتی ہوئی سیدھا لان میں واک کرتی نازی کے سر پر جا لگی، بچے سہم کر دور کھڑے ہو گئے، جنائل نے آدم اور دانیال دونوں کو منع کیا کہ ماما کو نہیں بتانا ہے، جب آنٹی اندر چلی جائیں گی تو وہ خود جا کر بال لا دے گی۔

وہ تینوں خاموشی سے ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھ گئے تھے، کپڑے استری کرتی زرش نے ان کی خاموشی اور شرافت سے تینوں کو بیٹھے دیکھا تو حیران نظروں سے دیکھتی، کندھے اچکا کر رہ گئی۔

جبکہ جنائل نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا، ماں کو مصروف دیکھ کر اس کا ارادہ چپکے سے بال واپس لانے کا تھا۔ مگر ابھی حالات سازگار نہیں تھے، اس لئے وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

نازی جو بہت عرصے سے لان میں ادھر سے ادھر چکر لگا کر ٹھنڈی ہوا کے مزے لے رہی

تھی اور اس وقت ان باتوں کا اثر بہت کم ہو چکا تھا اس لئے وہ ذرا بہت آرام اور حوصلے سے سارے گھر میں پھر رہی تھی۔

اسی وقت نیلے رنگ کی بال بہت زور سے اس کے سر پر لگی تھی، نازی بھی کہ ٹیرس پر سے بچوں کے کھیلنے اور بولنے کی آوازیں کافی دیر سے آرہی تھیں، یہ بال بھی ان کی ہی ہو گی مگر جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ٹیرس پر کوئی نظر نہیں آیا، نازی نے حیران نظروں سے سامنے والے ٹیرس کو دیکھا تھا جہاں اکثر عورت اور اس کے بچے نظر آتے تھے مگر آج وہ بھی پڑا ہوا تھا اچانک اس کے ذہن میں آسیب کا خیال آیا اور وہ خوفزدہ ہو کر بال وہاں ہی پھینک کر اندر کی طرف بھاگی۔

"اماں.....!" پھولی سانسوں کے ساتھ نازی نے ماں کو آواز دی تھی۔

"کیا ہوا ہے کیوں اتنے زور سے چلا رہی ہو، ڈر کے میرے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ گئی۔" رخشندہ بیگم نے کچن سے نکلتے ہوئے غصے سے پوچھا تھا۔

"اماں..... میں لان میں چکر لگا رہی تھی کہ آسیب نے مجھے بال دے ماری، سچ میں اماں، یہاں ضرور کچھ ہے۔" نازی نے خوفزدہ لہجے میں کہا تو رخشندہ بیگم ٹھٹک گئی تھیں۔

"باؤلی ہوئی ہے کیا؟ آسیب کیا فٹ بال کھیلتے ہیں، یا تجھے پھینک کر چیک کر رہے تھے؟ عقل سے بھی کام لیا کر، غور سے دیکھو اس پاس کے کسی گھر سے آئی ہو گی۔" اماں نے دیکھے بغیر کرنے کا سارا غصہ نازی پر نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"نعیم صاحب سے کہوں گی آج بازار سے کچھ لے آئیں، بہت شوق ہے کچھ پکانے کی، رجل

اب آجاؤ ذرا سے کام جو نے والا ہے۔" رخشندہ بیگم نے رات کا کھانا بنانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے، لاؤنج کے صوفے میں دھنستے ہوئے نازی کو بھی آواز دی، وہ دونوں ماں بیٹی انڈین سوپ ڈراموں کی دیوانی تھیں۔

نازی نے سر ہلاتے ہوئے ٹی وی آن کیا، ڈرامے میں پوجا پاٹ کا کوئی سین چل رہا تھا، ٹی وی کا والیوم بہت اونچا تھا، سارے گھر میں بھجن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد نازی کو اچانک خیال آیا کہ وہ جلدی میں داخلی دروازہ بند کرنے نہیں آئی تھی، نازی اٹھی اور اس کا اندازہ درست نکلا، داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا، نازی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کرنا چاہا جب اس کی نظر بے خیالی میں ہی لان کے اس حصے پر پڑی، جہاں وہ بال چھوڑ کر خوفزدہ ہو کر بھاگی تھی، وہ بری طرح چونک گئی تھی، لان میں بال موجود نہیں تھی، خوف کی شدید لہر اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔

"اماں.....!" وہ بے اختیار چیختی ہوئی اندر بھاگی تھی۔

☆☆☆

"آدم یہ بال....." جمائل نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے آدم کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کی بال تھی۔

"ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو میں جلدی سے بھاگ کر لے آیا۔" آدم نے فخریہ اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

"اچھا جب ماما سے مت کہنا، ورنہ وہ ڈانٹیں گی بغیر اجازت کسی کے گھر جانے پر۔" جمائل نے بھائی کو سمجھایا تو وہ سمجھداری سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

زرش نے مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ نیچے سے اونچی آوازیں اس کے ارتکاز کو توڑ رہی تھیں۔

پوجا پاٹ اور بھجن کی تیز آوازیں بڑے سے گھر میں گونج رہی تھیں، زرش جھنجلاہٹ میں توبہ استغفار کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"ان دونوں ماں بیٹی کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ نماز کا وقت ہے۔"

زرش جلی کٹی کچن میں آ کر چائے کا پانی رکھنے لگی کیونکہ احمد ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا، احمد کے نماز پڑھنے تک زرش چائے بنا کر لے آئی، احمد تینوں بچوں کو پاس بٹھائے باتیں کر رہا تھا زرش بھی کپ پکڑا کر پاس ہی بیٹھ گئی۔

"پاپا پتا ہے آج میں نے کیا کیا؟" آدم نے معصومیت سے باپ کو متوجہ کیا اور بال لانے کی ساری کہانی سنانے لگا۔

"اف آدم! میں نے منع کیا تھا ناں کہ....." جمائل نے آدم کو غصے سے ٹوکتے ہوئے گھورا تھا، مگر ماں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چپ ہو گئی، زرش کے چہرے پر خفگی نمایاں تھی اور وہ تیز نظروں سے تینوں کو گھور رہی تھی۔

"آپی نے سب کو بتانے سے منع کیا تھا، پاپا کو تو نہیں۔" آدم نے معصومیت سے کہا تو احمد بے ساختہ ہنس پڑا، زرش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ در آئی جسے چھپانے کے لئے اس نے سر جھکا لیا تھا، احمد نے آدم کو اٹھا کر بے ساختہ پیار کیا تھا۔

"میں نے منع کیا ہوا ہے ناں آپ تینوں کو پھر بھی۔" زرش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"سوری ماما، ہم نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔" جمائل نے شرمندگی سے کہا تو احمد نے زرش کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بچوں سے باتیں کرتا انہیں دھیرے دھیرے سمجھانے لگا۔

زرش جانتی تھی کہ بچے باپ سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی سختی سے بھی زیادہ ہیں، وہ خاموشی سے چائے کے سپ لینے لگی۔

☆☆☆

"امی یہ نازی کیا کہہ رہی ہے؟ کیا سچ میں یہ گھر آسیب زدہ ہے؟" رخشندہ بیگم کی دونوں بیٹیاں مع بچوں کی فوج کے اماں کے بلانے پر دوڑی چلی آئی تھیں، اس بڑے سے عالیشان گھر کو دیکھ کر دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں مگر نازی کی زبانی اس کے آسیب زدہ کا سن کر ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی اور اب وہ خود بھی خوف کا شکار ہو کر ماں کو سمجھا رہی تھیں۔

"اماں! اس بات کو معمولی مت سمجھیں، ایسی چیزوں کے اثرات بہت برے ہوتے ہیں، اگر آپ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو۔" بڑی والی بیٹی فصیح نے کہا تو اس سے چھوٹی روحینہ نے بھی حصہ لیا تھا۔

"ہاں امی، میری بات مانیں تو کسی عامل سے رجوع کریں، اپنی حفاظت کے لئے کوئی تعویذ وغیرہ بنوالیں، آپ بھول گئیں عابدہ باجی کی بیٹی پر جن عاشق ہو گیا تھا اور وہ کیسی عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی تھی، بیچاری کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اسی وجہ سے۔" رامینہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے مثال بھی دی تھی۔

"ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، مگر میں کسی عامل کو نہیں جانتی۔" رخشندہ بیگم نے پریشانی سے کہا تھا جبکہ نازی کی حالت خوف سے پتلی ہو رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں ایک بہت ہی پہنچے ہوئے عامل بابا کو، مگر پیسے ٹھیک ٹھاک لیں گے۔" رامینہ

نے کہا تو رخشندہ بیگم سر ہلا کر رہ گئیں۔ اس دن مجبوری بھری ہی دونوں بہنیں مختلف بہانے کر کے رو رہ جانیں گئیں۔ آسیب زدہ گھر میں رات گزارنے کا حوصلہ ان دونوں میں نہیں تھا۔

☆☆☆

بہار کی آمد تھی، رنگ رنگ کے دلفریب پھول اپنے جوبن پر تھے، درختوں پر شگوفے پھوٹے سجے، بہار کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ احمد شام کو جلدی گھر آ گیا تھا۔ زرش نے بہت خوبصورت ست رنگی دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو پشت پر کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ دونوں چھت پر واک کر رہے تھے، جب احمد نے رک کر زرش کے خوبصورت ہاتھوں میں ست رنگی چوڑیاں پہنائی تھیں، تو فضا میں ہوا کے سنگ اس کی کھلکھلاتی ہنسی، چوڑیوں کی کھنک اور اڑتے بالوں کی خوشبو کے سنگ دور تک پھیل گئی تھی۔

احمد محبت بھری نظروں سے زرش کو دیکھتا، ریلنگ سے ہٹ گیا، دونوں دھیمی سروں میں باتیں کرتے چھت پر ٹہلنے لگے۔

لان میں کرسی پر بیٹھی چائے پیتی نازی نے شوخ ہنسی اور چوڑیوں کی کھنک کی آواز پر چونک کر اوپر دیکھا، جہاں اسے ست رنگی آنچل لہراتا ہوا نظر آ رہا۔

خوف کی شدت سے اس کی دھڑکنیں تھم سی گئی تھیں اور وہ ماں کو پکارتی بے اختیار اندر کو بھاگی تھی۔

☆☆☆

"اچھا ٹھیک ہے، دور کیا بتایا انہوں نے؟" رخشندہ بیگم فون پر بات کرتے کرتے ایک نظر بخار میں جلتی نازی پر بھی ڈال رہی تھیں، چہرے پر پریشانی واضح تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں باجی؟" فون بند ہوتے پر نازی نے نقاہت زدہ لہجے میں پوچھا تھا اس دن خوف سے اسے بخار چڑھ گیا تھا اور اس کے بتانے پر رخشندہ بیگم نے رابعہ کو جلد آنے کو کہا تھا۔

"رابعہ گئی تھی عامل بابا کے پاس، انہوں نے بتایا ہے کہ بہت سخت آسیب ہے یہاں، تعویذ اور دم کر کے پانی بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ جلد از جلد یہ گھر چھوڑ دیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔" رخشندہ بیگم نے ساری تفصیل بتائی، جسے سن کر نازی مزید خوف زدہ ہو گئی۔

"اب کیا ہوگا؟" اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

"پریشان مت ہو، کل رابعہ کا میاں ساری چیزیں دے جائے گا۔" رخشندہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے لگیں، تو نازی بھی اکیلے کمرے سے خوفزدہ ان کے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی۔

"یہاں بیٹھو میری بچی، میں تیرے لئے جوس لے کر آتی ہوں۔" رخشندہ بیگم اس کے ڈر کو سمجھ چکی تھیں، اس لئے اسے صوفے پر بٹھا کر جوس لینے چلی گئیں۔

"یہ پی لے، کیا حالت ہو گئی ہے تیری۔" اماں نے جوس کا گلاس اس کے لبوں کو لگایا، پھر بڑبڑانے لگیں۔

"رابعہ بتا رہی تھی کہ عامل بابا نے بہت سخت چلہ کاٹا ہے، پھر پتا چلا ہے ان کو کہ اس گھر میں ایک ہندو عورت اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے، مگر ہمیں تین مہینے ہو گئے ہیں آج تک کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ان لوگوں سے۔" رخشندہ بیگم نے باقی کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"لو جی، اس ہندو عورت سے نقصان کیا پہنچے گا، ہر وقت تو روتی رہتی ہیں اور یہ انڈین ڈرامے

میں پوجا پاٹ دکھا رہی ہوتی ہیں، ہندو عورت ہوتی تو اس مناسبت پر ان دونوں کی داسی بن گئی ہوتی، اس کی زبان کو اتنی سناتی پہنچاتے پر۔" غصے سے تیز تیز ہانڈی میں چمچ چلاتی زرش نے پیچھے سے آتی آوازوں کو سن کر کہا تھا۔

"اماں آپ بھولی رہتی ہیں، پچھلے ہفتے اب کی بائیک کی ٹکر ہو گئی تھی، ابو نئی والے بھائی کا وہاں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، تب مستقل بیمار رہنے لگی ہیں اور تو اور میرا کوئی رشتہ بھی نہیں آ رہا۔" نازی نے سب واقعات کو ملا کر ایک خوف ناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

"یہ تو ایسے رہی ہے جیسے پہلے تو رشتوں کی لائن لگی ہوئی تھی، تو بے لوگ بھی کیسی کیسی جھوٹی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔" زرش نے آنے کو کہاں مارتے ہوئے ہنس کر سوچا تھا۔

"ہاں، کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔" رخشندہ بیگم نے بھی غور سے واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔

تو عام سے معمولی واقعات بھی بڑے اور خاص نظر آ رہے تھے، انسانی فطرت بھی عجیب ہے اپنے دماغ کے کرشمے سے ایسے ایسے کردار اور واقعات تخلیق کرنے لگتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، مگر ہم اپنے وہم اور شک پر تصدیق کی مہر کسی نہ کسی طرح سے ضرور لگا دیتے ہیں۔

خوف کا تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے، خوف کسی ڈر یا چیز کا نام نہیں ہے، خوف ہمارے اندر کی کیفیت کا نام ہے، جسے ہم مختلف چیزوں، لوگوں اور واقعات کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں اور وہم خوف میں ایسا ہے جیسے جلتی پر تیل، خوف کو بڑھاتا چلا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہم ساری زندگی کسی نہ کسی خوف یا وہم کا

شکار ضرور ہوتے ہیں، چاہیں ہم مانیں یا نہ مانیں۔

☆☆☆

"رخشندہ بیگم کہاں ہو بھئی، غضب ہو گیا؟" قیوم صاحب بہت گھبرائے ہوئے سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"یا الٰہی خیر، کیا ہوا قیوم صاحب؟ آپ کے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟" رخشندہ بیگم نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا تھا۔

"زیر تعمیر دکان کی دوسری منزل دوران تعمیر گر گئی ہے، کئی مزدور بھی شدید زخمی ہوئے ہیں، شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔" قیوم صاحب نے نازی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے تفصیل بتائی تھی۔

"ہائے میرے اللہ، یہ کیا ہو گیا؟" رخشندہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اماں یہ ضرور اسی آسیب کی کارستانی ہو گی، ضرور اسے ہمارا عامل بابا سے رابطہ کرنا پسند نہیں آیا ہے۔" نازی نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

دو ہفتے پہلے رابعہ کے بھیجے تعویذ بابا نے گھر کے کونے کونے میں دبا دیئے گئے تھے، پانی کا چھڑکاؤ بھی کر دیا تھا، رخشندہ بیگم اور قیوم صاحب نے چونک کر نازی کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں، نازی کی بات میں دم ہے، میں ابھی فون کر کے عامل بابا سے پوچھتی ہوں۔" رخشندہ بیگم نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"مگر بیگم!" قیوم صاحب نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"آپ چپ کریں، آپ نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔" رخشندہ بیگم نے قیوم صاحب کو ٹوکتے ہوئے کہا اور فون پر عامل بابا سے بات کرنے

لگیں، جنہوں نے ایک گھنٹے بعد حساب لگا کر بتانے کا کہا، اب وہ تینوں بے صبری سے بیٹھے وقت گزرنے کا انتظار کر رہے تھے، اب آگے کا لائحہ عمل بابا کے بیان پر منحصر تھا۔

☆☆☆

آج پھر اس گھر میں بہت بے ہنگم سا شور مچا ہوا تھا، مزدور سامان اٹھا اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کر رہے تھے، عامل بابا نے آسیب کی طاقت اور غصے میں ہونے کا بتا کر ایک چلہ کاٹنے کو کہا تھا اور اس کے لئے کافی بڑی رقم مانگی تھی، اگر نہیں تو پھر یہ گھر فوری طور پر چھوڑنے کا کہا تھا، رخشندہ بیگم نے سوچا تھا کہ کون سا ذاتی گھر ہے جس پر اتنا پیسہ لگایا جائے، انہیں یہی بہتر لگا کہ پرانے محلے میں کرائے پر گھر لے کر اپنے نئے گھر کی تعمیر مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے، دو مہینے کا کرایہ یہاں ہی چھوڑا اور فوراً گھر چھوڑنے کو ترجیح دی اور چار مہینے بعد وہ دوبارہ سے وہ لوگ اپنے پرانے محلے جا رہے تھے، سارا سامان لوڈ کروا کر بڑے سے خالی گھر پر نظر دوڑاتے وہ گیٹ کو تالا لگانے لگے۔ جب ساتھ والے گھر سے دو تو میاں بیوی اپنے تینوں بچوں سمیت گھر سے باہر نکلے، وہ بھی سامان لوڈ کروا رکھ کر اپنے بچوں کو کار میں بٹھایا اور دونوں ان کی طرف بڑھ گئے۔

"آپ لوگ بھی یہاں سے جا رہے ہیں؟" مرد نے آگے ہو کر مخدوم صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے اس گھر کا اوپر والا پورشن تین سالوں سے کرائے پر لیا ہوا ہے۔" اس مرد نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جن کے ٹیرس سے ان کا لان صاف نظر آتا تھا۔

"دراصل نیچے والا سارا گھر لاکڈ ہے کیونکہ مالک مکان ملک سے باہر ہیں مگر سال میں ایک بار ضرور آتے ہیں۔" اس کی بیوی نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اکثر آپ لوگوں کو دیکھتی تھی، مگر اس گھر کے اتنے قصے مشہور ہیں کہ ہمت نہیں پڑی آپ کے گھر آنے کی، ویسے بھی یہاں جو بھی آتا ہے ایک یا دو مہینے سے زیادہ نہیں رہتا ہے، آپ تو پھر بھی چار مہینے رہ گئے ہیں یہاں۔" لڑکی نے اپنے نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا تھا۔

"کیا آپ کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوا یا کوئی نقصان پہنچا ہو؟" رخشندہ بیگم نے تجسس سے پوچھا تھا۔

"نہیں ایسا تو کبھی کچھ نہیں ہوا، ہاں مگر کبھی کبھار چلنے کی آوازیں، بچوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں، یا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو، مگر کبھی دیکھا کچھ نہیں ہے۔" اس لڑکی نے خوفزدہ نظر گھر پہ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا ہم تو جب سے آئے تھے نقصان پہ نقصان اٹھا رہے ہیں۔" رخشندہ بیگم نے مبالغہ آرائی کی تھی۔

"اچھا اب ہم چلتے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہیں۔" اس مرد نے انہیں خدا حافظ کہا اور چلے گئے، ان کے جاتے ہی ان تینوں نے بھی بڑے سے عالیشان گھر پہ آخری نظر ڈالی اور چلے گئے۔

☆☆☆

شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے، زورش اور احمد نے چھت کی ریلنگ سے جھانک کر نیچے دیکھا سب لوگ جا چکے تھے، حسب روایت دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے اتر آئے، سارے گھر پہ ہو کا عالم طاری تھا، تینوں

بچے لان میں ازرخ، حوری اور رازی سے کھیلنے لگے تھے اور یہ آزادی تب تک تھی جب تک نئے کرائے دار نہ آ جاتے، احمد اور زورش لمبے سے پورچ میں چکر لگاتے ہوئے ساتھ ساتھ ایک نظر بچوں پر بھی ڈال رہے تھے۔

"آج اتنے دنوں کے بعد بچے آزادانہ کھیل رہے ہیں۔" احمد نے بچوں کو خوش دیکھ کر کہا۔

"یہ تو ہے۔" زورش نے تائید کی۔

"تم نے بچوں پہ پابندی بھی تو اتنی لگا رکھی تھی۔" احمد نے اسے یاد دلایا۔

"ابھی اتنی احتیاط و پابندی تھی پھر بھی کیا کیا باتیں نہیں بن گئیں ہیں۔" زورش نے منہ بنا کر کہا تو احمد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یہ تو فطری چیز ہے کہ جو نظر نہیں آتا اس سے خوف تو محسوس ہوتا ہی ہے۔" احمد نے ایمانداری سے تجزیہ کیا تھا۔

"مگر احمد! آپ کو نہیں لگتا کہ یہ انسان کچھ زیادہ ہی وہمی اور توہم پرست ہوتے ہیں، اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا نقصان کرنے والے، جھوٹے اور دغاباز، جیسے وہ عامل بابا، پیسے بٹورنے کے لئے جھوٹ پہ جھوٹ بولتا رہا۔" زورش نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں یہ تو ہے مگر کچھ غلطی ہم سے بھی ہوئی، بچوں کا بال اٹھانا اور پھر ازرم کا بال واپس لے کر آنا اور جب ہم چہل قدمی کر رہے تھے، تمہاری چوڑیوں کی کھنک اور لہراتا دوپٹہ دیکھ کر کوئی بھی ڈر سکتا تھا، جبکہ یہ بھی سیڑھیوں پر قدم رکھ کر۔" زورش نے مڑ کر بڑے سے ویران لاؤنج پر نظر ڈالی تھی، سارے گھر میں سناٹے کا راج تھا اور نئے کرائے دار آنے تک ایسا ہی رہنا تھا۔

زورش نے مسکرا کر دیکھا تھا اور سیڑھیوں پہ چلتے ان سب کے وجود غائب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اک جہاں اور ہے

سدرۃ المنتہیٰ

پچیسویں قسط کا خلاصہ

رات کے پچھلے پہر امرکلہ اور علی گوہر کا آمنا سامنا ہوتا ہے، وہ اسے کہتی ہے میرے راستے میں مت آنا، ہماری منزل الگ ہے۔

امرت، سالار کو لے کر گاؤں کے لیے نکل جاتی ہے۔

اور امرکلہ کو اپنے گھر چھوڑ دیتی ہے، امرکلہ کا اس کے گھر میں بہت اچھا وقت گزرتا ہے،

امرکلہ اور امرت کی تفصیل سے بات ہوتی ہے فون پہ، جس کے آخر پہ وہ اپنے کھوئے ہوئے باپ کے بارے میں سوچتی ہے اور ماں کے پاس واپس جانے کی تیاری کر لیتی ہے اسے سادھنا کو ڈھونڈنا ہے۔

بچوں کی کلاس کے اندر بہت شور ہے، امرت باہر بیٹھی ہے گاڑی میں، جب فرید حسین اسے رشتہ ٹھکرائے جانے کا شکوہ اور شکریہ ادا کرتا ہے، اس کا کہنا ہے جب وہ دوسری بار رشتہ بھیجے گا تو اس نے انکار نہیں کرنا۔

اب آپ آگے پڑھیے

چھبیسویں قسط

"اماں..... خدا کے لیے۔" وہ جھلا کر باہر نکل گئی۔

"امر کلہ سن لو، میں تمہاری کسی مسلمان سے شادی نہیں کروں گی۔" وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں، نہ میں کسی مسلمان سے شادی کروں گی نہ کسی کرسچن سے، نہ کسی ہندو سے۔"

"کیا تمہارا چرچ جانے کا ارادہ ہے امر کلہ؟"

"کتنی سنگدل ماں ہیں آپ۔" وہ پھیکی سی مسکرائی۔

"میں اتنی پارسا نہیں ہوں کہ چرچ چلی جاؤں۔"

"اتنی پارسا ہوتی تو نماز پڑھتی، نماز اگر نہ سہی تو کلمہ تو پڑھ ہی لیا تھا۔"

"پھر تو مزار، کیا، کیوں جاتی ہے امر کلہ؟"

"آپ مزار پہ کیوں جاتی تھیں اماں؟"

"میں تو مجبور تھی کوئی امید نہیں باندھ لی تھی تیرے ملنے کی۔"

"تو میں بھی جیسی مجبور تھی، کوئی امید نہ باندھ لی تھی میرے۔"

"کس کے ملنے کی؟" ماں ایسا سوال کرنے سے پہلے سو بار سوچتی، انہوں نے ایک بار نہ سوچا۔

"ماں اور بیٹی کے درمیان لحاظ کا پردہ ہوتا ہے۔" وہ اس بار کچھ کہہ نہ سکی۔

"میں مجبور تھی پر......"

"میں نے کچھ نہیں مانگا، میں بغیر مانگے ہی بھر لی تھی۔"

"امر کلہ بیٹی! تمہیں کچھ نہیں ملا نہ تمہیں کچھ نہیں ملا، تمہیں مانگنا چاہیے تھا۔" سکھی نے چار جملے ہی سنے تھے۔

"تم نے کیوں نہیں مانگا؟"

"مجھے خود نہیں پتہ کہ میں کیوں بھری ہوں اور مجھے کیا چاہیے، مجھے کچھ نہیں چاہیے شاید، مجھ پر بے مہریاں ہو جاتی ہیں، کھانے بیٹھے کو دل چاہتا ہے، بیٹھے کو دل جاتا ہے۔"

"مجھے کام پہ جانا ہے۔" وہ چادر لے کر نکل گئی۔

"دیکھا سکھی تم نے یہ نہیں بدلتی، یہ نہیں میری بات سنتی، یہ نہیں سنے گی۔"

"بات ایسے نہیں کی جاتی جیسے تو کرتی ہے نگار۔"

"پھر بات کیسے کی جاتی ہے، تجھے تو بات کرنی آتی ہے نا۔"

"میرے بھی منہ سے لفظ نکلتے ہیں تیرے بھی منہ سے لفظ، تو شاید الوکھا بولتی ہے، تو ہی بول۔"

"اسے وقت دے نگار۔"

"ہاں تاکہ وہ بوڑھی ہو جائے، ابھی سے خود کو کیسے بگاڑ دیا ہے اپنی پروا ہی نہیں کرتی، بے فکری ہے صدا کی۔"

"تو اس کی دوست امرت سے کہہ کہ نگار وہ اسے سمجھائے۔"

لے، وہ تو خود شادی کے لیے تیار نہیں ہوتی، اسے کرے گی؟"

"وہی کرے گی اسے، میں بات کروں گی، کبھی کی سمجھائے اسے تو پریشان نہ ہوا کر۔"

اسی وقت فون دو بار، بجا تھا، فون بھول گئی تھی، اس نے اٹھایا، سکھی نے فون تھامنے سے کہا تھا۔

☆☆☆

جیل کی سلاخوں کے پیچھے موت کی بات ہو رہی تھی۔

موت کی ہی ہو سکتی ہے، قیدی کی ہی ہو سکتی ہے محبت کی بری لگتی ہے، وہ قیدی سمجھا گیا تھا جوانی کے معاشقوں کی باتیں کر رہا تھا، بھوری آنکھوں والی چٹلیاں نچا کر، بھورے بالوں والا قیدی کھسیانے ہوئے پر ہنس دیا تھا، بھورو اور پھر اپنا ہاتھ دیکھا۔

"میری زندگی کی لکیر لمبی ہے اور کہتے ہیں تجھے پھانسی ہو جانی ہے، ہی ہی ہی، ہاہا۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنستا تھا۔

"اوے کھوتے، ہاتھ پڑھنے کا ناٹک کرنے والے، قاتل تجھے پھانسی تو ہو گی، تیرے پیچ کو بھی ہو گی، سفید داڑھی والا اس کی بک بک سے جلتا تھا، کل چار بندے تجھے گنتی کے، وہ نوجوان، ایک سفید داڑھی والا ریخ لیے والا بزرگ ایک بالکل ہی بھورے بالوں اور آنکھوں والا نوجوان، ایک نیا جذباتی اور ایک سمجھایا ہوا او جبر عمر چور، ایسے استے جوڑے لگے ہیں، مارے تجھے سدھر کے نہیں معاشقوں سے باز نہیں آتا تو سفید داڑھی والا جس نے غیرت کے نام پہ قتل کیا تھا اور جیل ہو گئی تھی ہر کسی کو غیرت دلوانا اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔"

"ابے او کھوتے کی اولاد و، ابے او چور کے پتر خود چور بند کر اپنی بک بک۔" بھورے بالوں والا پھر ہنسا۔

چور کا منہ بن گیا تھا۔

"ساری عمر رب نے چوری کا کھلایا۔"

"او رب کو نہ دے، نہ کھا سے، سارا تیرا کیا دھرا ہے لفنگے، اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آیا ہے۔"

"تو بھی تو چاچے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آیا ہوا ہے۔" منہ بسور کر کہا۔

"او میں بے غیرت کا قتل کر کے آیا ہوں، میں کوئی تیرے جیسا لچا چور لفنگا نہیں ہوں، جیل میں بھی نماز پڑھتا ہوں۔" یہ جملہ اس نے زبردستی سے ادا کیا تھا۔

"او رب ہی جانے نماز کا رعب نہ جھاڑ چاچے، بڑے دیکھ لیے ہوئے ہیں نمازی ہم نے۔" بھورے بالوں والے شوکی نے مداخلت کی، ورنہ اس کا پہلا کام جھپٹا دوسرا آنکھوں کی چٹلیاں نچانا اور لطیفے سنانا، نمبرا ہاتھ کی لکیروں کے جنتر منتر پڑھتے رہنا اور چوتھا بک بک بولنا تھا۔

اور ایک نوجوان تھا جو چپ ہی رہتا تھا زیادہ دونہ، تازہ واردات کر کے آیا تھا، پہلی واردات لگی تھی اس کی سہما ہوا خیالوں میں کھویا ہوا رہتا تھا، تھا بھی کوئی نیس کے اندر۔

اور بھورے بالوں والا پنچنیس کے برابر، دو قتل کیے تھے اس نے، پہلا کر کے بھاگ گیا،

سارہ اسد داؤد

مریم کالج سے آئی تو دیکھا سامنے صحن میں سکینہ کے ساتھ زلیخا خالہ بیٹھی ہوئی تھیں، انہیں دیکھتے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑنے لگے، مارے باندھے انہیں سلام کیا، ابھی انہوں نے جواب دیا ہی تھا کہ وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، وہ جانچتی نظروں سے اس کی پشت کو گھورنے لگیں۔

"تمہاری بیٹی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، جھٹ سے سلام کرنے کا فرض ادا کیا اور یہ جا وہ جا۔" وہ ناگواری سے بولیں۔

"نہیں خالہ! ایسی بات نہیں، اصل میں وہی گرمی ہے اوپر سے پڑھائی بھی وہی مشکل ہے، تھکاوٹ ہو جاتی ہے، روزانہ آتے ہی کچھ دیر آرام کرتی ہے، کھانا بھی ٹھہر کر کھاتی ہے۔" سکینہ نے بیٹی کی طرف داری کرتے ہوئے جلدی سے بات بنائی تو وہ سر جھٹک کر دوبارہ باتوں میں مصروف ہو گئیں جبکہ سکینہ نے ایک کڑی نگاہ کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی مریم پر ڈالی تھی، یہ تو انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ مریم کو زلیخا خالہ ایک آنکھ نہیں بھاتی ہیں اور اس موضوع پر ان دونوں کی آپس میں تکرار بھی ہو جاتی تھی۔

مریم کے بقول زلیخا خالہ کا ادھر کی بات ادھر کرنے میں کوئی ثانی نہیں تھا اور وہ جان بوجھ کر بات اتنی ہوتی نہیں تھی جتنی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کرتی تھیں، اس لئے اس کا خیال تھا کہ سکینہ کو ان سے میل جول کم کر دینا چاہیے تھا لیکن سکینہ اس بات پر نہیں آتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ بائیس سال سے وہ اور زلیخا خالہ اسی محلے میں رہ رہی ہیں اتنا پرانا ساتھ ہے، دن رات کا آنا جانا ہے، وہ کیسے انہیں آنے سے منع کر سکتی ہیں۔

اس پر مریم کے پاس جواب تھا کہ اس بات سے زیادہ انہیں یہ بھی فکر ہے کہ اگر وہ ان کی طرف نہ آئیں تو اس کو محلے کی اور خاص طور پر تائی امی کی خبریں کون دے گا اور وہ تائی امی کی برائیاں پھر کس کے سامنے کریں گی لیکن یہ وہ صرف سوچ سکتی تھی ان سے کہہ نہیں سکتی تھی، کیونکہ کہنے کی صورت میں امی کی جوتیاں کون کھاتا۔

"سچی بات ہے خالہ! میں نے تو اب خالدہ سے میل جول رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے، اپنے آپ کو سمجھتی پتہ نہیں کیا ہے، بیٹا پڑھ کر نوکری کیا لگ گیا اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، میری بھی کوئی گری پڑی نکلتا ہے جو وہ یوں باتیں کرتی پھرتی ہے، اونہہ...... بڑا ناز ہے اسے بیٹے کی ماں ہونے پر، اگر زوہیب پڑھا لکھا، برسر روزگار ہے تو میری بچی بھی پڑھی لکھی ہے اس میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔"

وہ یونیفارم بدل کر ابھی بستر پر آ کر بیٹھی ہی تھی جب اسے سکینہ کی آواز سنائی دی، اپنے اور زوہیب کے ذکر پر وہ ٹھٹک سی گئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے بارے میں سوچنے لگی، زوہیب اس کا تایا زاد تھا، گو کہ اس کے دل میں زوہیب سے متعلق کوئی بہت خاص قسم کے جذبات نہیں تھے، لیکن تو وہ ماں اور تائی کی لڑائی جھگڑوں سے خائف ہوتی اس بارے میں سوچتی ہی نہ تھی اور دوسرے وہ لئے دیئے رہنے والی اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ زوہیب کے لئے دل میں نرم گوشہ ضرور رکھتی تھی، اس کی سلجھی ہوئی شائستہ طبیعت اور کردار کی اچھائی سے وہ متاثر ضرور تھی لیکن اگلے ہی لمحے جو تھوڑے بہت جذبات اس کے دل میں ابھرے تھے سکینہ کی آواز نے ان پر اوس پھیر دی تھی۔

"خالہ اسے جا کر کہہ دیتا کہ یہ اس کی بھول

ہے کہ میں اس کے ساتھ رشتہ کرنے کی خواہش مند ہوں، اگر اسے کوئی چاہ نہیں ہے تو مجھے بھی کوئی چاہ نہیں اس سے رشتہ کرنے کی ہے میری جوتی۔" نخوت سے بولتی سکینہ کی باتوں سے اس کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

یقیناً اب پھر زلیخا خالہ نے تائی امی کا کوئی پیغام ان تک پہنچایا تھا اور اسے پکا یقین تھا کہ آدھے سے زیادہ الفاظ کا خود زلیخا نے اضافہ کیا ہوگا۔

"پتہ نہیں امی اور تائی امی کی یہ سرد جنگ کب ختم ہوگی۔" اس نے تاسف سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"امی اور چچی جان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دونوں دوسروں کے کانوں سے سنتی اور دوسروں کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو سچ مانتی ہیں اور ایسا شروع سے ہے۔" زوہیب اپنے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے مضطرب سے انداز میں بولا۔

"میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے امی اور چچی کے آپس میں اختلافات ہی دیکھے ہیں، کچھ دن کے لئے صلح ہوتی ہے پھر کسی معمولی سی بات پر ناراضگی ہو جاتی ہے اور محلے والوں کو ایک چٹ پٹا موضوع مل جاتا ہے۔" وہ قدرے بے بسی سے بولا تو جمیلہ نے لمحہ بھر کے لئے اسے دیکھا انہیں اس پر ترس آیا اور ہمدردی محسوس ہوئی، وہ پڑھا لکھا سمجھدار اور ماں کا انتہائی فرمانبردار بیٹا تھا اس لئے ماں کے منہ پر بدلحاظی کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتا تھا، ایک دو دفعہ اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ خواہ مخواہ میں لوگوں کی باتوں میں نہ آیا کریں اور چچی سے جلدی بدگمان نہ ہوا کریں لیکن ان پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا ایک وہ رفعہ تو وہ مجھ سے الجھ پڑی تھیں پھر اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

"اچھا بیٹا تم پریشان نہ ہو، تم مجھے عاصم کی طرح عزیز ہو، میں اس پہلو پر سوچتی ہوں، انشاء اللہ مل کر اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیں گے، ابھی تو بیٹھو، میں چائے لے کر آتی ہوں، اب پرسکون ہو جاؤ اور سمجھو کہ تمہارا مسئلہ میرا ہے۔" وہ اپنے مخصوص نرم، ہموار لہجے میں بولیں، ان کے لہجے کی مٹھاس اور اپنائیت سے اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔

"بہت شکریہ آپ کی محبت کا، ابھی میں چلتا ہوں دفتر سے سیدھا ادھر ہی آیا ہوں امی کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی، پھر کبھی آؤں گا جب عاصم بھی ہوگا پھر اکٹھے چائے پئیں گے۔" وہ اٹھتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا بالکل تم گھر جاؤ، تھوڑی دیر زیادہ ہو جائے تو ماؤں کو فکر شروع ہو جاتی ہے، پھر امی کو بتا کر آنا کسی دن۔"

"جی آنٹی جی ضرور۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور سامنے اپنے گھر کی طرف چل دیا، جمیلہ چائے پینے کے دوران مریم اور زوہیب کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆☆☆

جمیلہ جس محلے میں رہتی تھیں یہ ایک مڈل کلاس لوگوں کا محلہ تھا، کچھ کی مالی حالت قدرے بہتر تھی کچھ ایسے تھے کہ گزر اوقات ابھی ہو جاتی تھی جبکہ کچھ قدرے خراب مالی حالت میں گزر بسر کر رہے تھے اس محلے میں زیادہ تر خاندان ایسے تھے جن کو کئی سالوں سے ساتھ رہتے ایک دوسرے کو جانتے تھے، جمیلہ شروع سے ہی اسی محلے میں رہتی تھیں، وہ قریبی سرکاری سکول میں پڑھاتی تھیں، انہوں نے گھر میں اکیڈمی بھی کھولی

ہوئی تھی جہاں شام کو وہ بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی تھیں، تقریباً محلے کے سارے بچے ہی ان سے ٹیوشن پڑھتے تھے کیونکہ یہاں رہائش پذیر زیادہ تر خواتین پڑھی لکھی نہیں تھیں اگر کچھ پڑھی تھیں تو وہ بھی واجبی سا ہی۔

جمیلہ بڑی سلجھی نہایت ٹھنڈے اور سلجھے ہوئے مزاج کی تھیں، سارے محلے میں ان کی عزت تھی اور ان کی بات کو اہمیت دی جاتی تھی، وہ اپنے محلے میں آپی جی کے نام سے مشہور تھیں، ان کے گھر کے سامنے زلیخا کا گھر تھا جنہیں سب چھوٹے بڑے زلیخا خالہ کہتے تھے، انہیں محلے کی کن سن لینے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی بہت بری عادت تھی، زلیخا خالہ کے ساتھ خالدہ کا گھر تھا اور جمیلہ کے گھر سے تین گھر چھوڑ کر سکینہ کا گھر تھا وہ دونوں آپس میں دیورانی جیٹھانی تھیں۔

خالدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا زوہیب تھا جبکہ سکینہ کی تین بیٹیاں تھیں اور مریم سب سے بڑی تھی، خالدہ اور سکینہ کی آپس میں کوئی خاص نہیں بنتی تھی کیونکہ دونوں مزاج کی تیز اور جلد غصے میں آ جانے والی تھیں، شدید نوعیت کا جھگڑا تو ان میں کبھی نہیں ہوا تھا لیکن معمولی معمولی باتوں سے وہ ایک دوسرے کے خلاف دل میں گانٹھ باندھ لیتیں، ناراض ہو جاتیں لیکن پھر صلح بھی کر لیتیں، ماؤں کی آپس کی تکرار سے بچے لاتعلق رہتے، ان کے آپس کے اختلافات کے باوجود بچوں کی آپس میں بہت بنتی تھی، جب بھی ان کی آپس میں کوئی ناراضگی ہوتی تو وہ اپنے اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے ملنے سے روکتیں لیکن آپی جی کی اکیڈمی میں تو سب پڑھنے آتے تھے اس لئے یہاں وہ جی بھر کر باتیں کرتے کیونکہ آپی جی کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ انہیں آپس میں میل جول رکھنے کی تلقین کرتیں اور ہمیشہ انہیں یہی سمجھاتیں کہ وہ اچھے بچوں کی طرح آپس میں کبھی نہ جھگڑیں اسی لئے وہ سب کی پسندیدہ تھیں، خاص طور پر زوہیب اور مریم تو ان کے بہت قریب تھے، زوہیب ان کے بیٹے عاصم کا دوست تھا جبکہ مریم ان کی بیٹی صبا کی دوست تھی اس لئے ان کی طرف ان کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا، زوہیب مریم سے تین سال بڑا تھا، کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کرتے ہی اسے فوراً ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی تھی، مریم بی ایس سی کے فائنل ایئر میں تھی، زوہیب کو مریم شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی گو کہ ان کے درمیان کوئی جذباتی تعلق تو نہیں تھا لیکن وہ جب بھی اپنی شریک حیات کا تصور کرتا تو ہمیشہ تصور کے پردے پر مریم کی ہی شبیہ لہرائی، کچھ دنوں سے خالدہ گھر میں اس کی شادی کا تذکرہ کر رہی تھیں، چونکہ اس کی خواہش مریم سے شادی کرنے کی تھی لیکن وہ ماں کے شدید ردعمل کے ڈر سے اس موضوع پر ان سے بات نہیں کر پایا تھا۔

خالدہ اور سکینہ میں تو شروع سے کوئی خاص نہیں بنتی تھی لیکن اصل بات جس نے زوہیب کو پریشان کیا ہوا تھا کہ تقریباً دو ماہ سے ان دونوں نے ایک دوسرے سے آنا جانا چھوڑا ہوا تھا، ایک دوسرے سے بول چال بھی بند تھی، اصل بات تو اسے پتہ نہیں تھی کہ اس دفعہ اتنی شدید ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟ اس لئے اس نے جمیلہ سے بات کی تھی اور انہیں یہ کام سونپا تھا کہ وہ خالدہ سے اس موضوع پر بات کریں اور یہ بھی پتہ کرنے کی کوشش کریں کہ ان کے درمیان کیا ناراضگی ہے۔

"آج تو جمعہ ہے کل سکول بھی جانا ہے، اتوار والے دن خالدہ کی طرف جا کر زوہیب کی

شادی کے متعلق بات شروع کر کے رکھتی ہوں وہ دونوں کی رائے جاننے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ دل ہی دل میں پروگرام ترتیب دیتی گھر کے دیگر کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

آج الوار تھا جمیلہ کا خالدہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا، چونکہ چھٹی تھی اس لئے عاصم اور صبا ابھی تک سو رہے تھے وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام نپٹا کر ابھی فارغ ہی ہوئی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے زلیخا خالہ تھیں، سلام دعا کے بعد وہ انہیں اندر لے آئیں۔

"ارے بیٹھو جمیلہ! کسی تکلف میں نہ پڑنا، سامنے سے ہی تو آئی ہوں، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" جمیلہ کو اٹھتے دیکھ کر زلیخا نے روکا۔

"تب بیٹھیں خالہ میں ابھی آئی ہوں میں سامنے ہی تو باورچی خانہ ہے۔" وہ جھٹ پٹ ان کے لئے اسکواش بنا لائیں۔

"جی خالہ! آپ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھیں۔" وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ خالدہ آج کل زوہیب کے لئے رشتے دیکھ رہی ہے، زوہیب ماشاء اللہ دیکھا بھالا شریف لڑکا ہے، میری بچی کو تو تم جانتی ہو جو غلطیاں چھوڑ کر رہتی ہے اور اس کی بیٹی شبانہ کو بھی جانتی ہو تمہارے ہی اسکول میں پڑھتی ہے۔"

"جی...... جی بالکل۔" جمیلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں چاہ رہی تھی کہ خالدہ زوہیب کے لئے شبانہ کا رشتہ مانگ لے، خود سے کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لئے سوچا کہ تم سے بات کروں۔" وہ اصل مقصد کی طرف آئیں۔

"تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔"

"جی...... جی میں آپ کی بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔" جمیلہ نے پرسوچ انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس کسی طرح یہ رشتہ ہو جائے، زوہیب جیسا لڑکا میری بچی کو داماد کی صورت مل جائے تو اور کیا چاہیے، تم خالدہ سے بات کرو گی تو وہ ضرور اس بات پر غور کرے گی اور تمہاری رائے کو اہمیت بھی دے گی۔" زلیخا کی بات اور ان کے انداز پر وہ ٹھٹک سی گئی تھیں۔

"بس تم نے جلد ہی خالدہ سے ضرور بات کرنی ہے۔" انہوں نے ایک دفعہ پھر انہیں مخاطب کیا۔

"جی اگر مناسب موقع ملا تو بات کروں گی۔" جمیلہ نے فی الوقت انہیں ٹالا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے گھر کی طرف چل دیں جبکہ جمیلہ خالدہ کی طرف جانے کا ارادہ بدل کر سنجیدگی سے ذہن میں اور ہی سوچ پر غور کرنے لگیں۔

☆☆☆

سکینہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو سامنے بیٹھی خالدہ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر جھٹ سے مسکراہٹ کی جگہ تیوری نے لے لی جبکہ جواباً خالدہ کے ماتھے پر بھی ویسی ہی شکن ابھر آئی، جمیلہ کے گھر آمنا سامنا دونوں کو ہی قطعی پسند نہ آیا خود سکینہ اب واپس تو جا نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس طرح تو خالدہ کے سامنے ان کی سبکی ہوتی کہ انہیں یہاں دیکھ کر وہ بیٹھ بھی نہ سکیں۔

"میں اس سے ڈرتی ہوں کیا؟" انہوں نے دل میں سوچا اور مارے باندھے ان کی جانب سے تھوڑا سا رخ پھیر کر فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں، جمیلہ کو ان کے تاثرات پر تاسف کے ساتھ ساتھ ہنسی آ گئی۔

خواہ مخواہ میں ان دونوں عورتوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے آپس میں بیر ہی باندھ لیا تھا اور ان کی لڑائی میں ان کے بچے پس رہے تھے لیکن اس چیز کا ان کو احساس نہیں تھا۔

"آپ نے مجھے یہاں اس کی شکل دیکھنے کے لئے بلایا تھا۔" تھوڑی دیر بعد ہی سکینہ، جمیلہ کو مخاطب کر کے بولیں، ان کے یوں ترش ہو کر بولنے سے خالدہ کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ خود کو بہت اچھی بہت خوب چیز سمجھتی ہو ہاں۔" خالدہ کیوں پیچھے رہتیں جھٹ سے میدان جنگ میں کود پڑیں۔

"میں نے آپ دونوں کو اس لئے اکٹھے بلایا ہے کہ آپ دونوں ہمیشہ آمنے سامنے لڑنے کی بجائے اپنے اپنے گھروں سے دوسرے لوگوں کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغام بھیجتی رہتی ہیں جس کا لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے جس سے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے اب آپس میں جو گلے شکوے ہیں ان کو ایک دوسرے سے بات کر کے ختم کریں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔" جمیلہ وہاں سے اپنی بات کہہ کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں۔

جمیلہ کی بات پر دونوں لمحہ بھر کے لئے خجالت محسوس کرتی خاموش سی ہو گئیں لیکن تھوڑی دیر بعد ہی دونوں میں اونچی خاصی تو تو میں میں شروع ہو چکی تھی۔

"ابھی خیر! انی آپ نے بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ ڈال دیا ہے اللہ ہی خیر کرے۔" جمیلہ جائے وکھ کر دوسرے کمرے میں بیٹھے عاصم اور صبا کے پاس آئیں تو عاصم ان سے مخاطب ہوا۔

"بھڑوں کے چھتے پر نہیں شہد کی مکھیوں کے چھتے پر ہاتھ ڈالا ہے اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ جب ایک دفعہ شہد کی مکھیاں قابو میں آ جائیں تو پھر شہد کی صورت میں کتنا فائدہ پہنچاتی ہیں یہ بھی حال ان دونوں کا ہے، دل کی بری نہیں ہیں بس ذرا زبان کی کڑوی ہیں اور دوسروں کی باتوں میں آ جانے والی ہیں، ایک دفعہ ان کے گلے شکوے دور ہو جائیں تو راوی چین ہی چین لکھے گا، انشاء اللہ۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" دونوں یک زبان ہو کر بولے تو وہ مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں، اتنے میں عاصم کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔

"کیا حالات ہیں؟" زوہیب کا میسج تھا۔

"دعا کرو بات جنگ کی صورت اختیار کرنے کی بجائے مذاکرات میں داخل ہو جائے۔" جواباً عاصم نے میسج کیا۔

جمیلہ نے آج ان دونوں کو اپنی طرف بلایا تھا جس کا عاصم اور صبا نے زوہیب اور مریم کو بھی بتایا تھا، اس لئے وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں بیٹھے بے چینی سے منتظر زوہیب نے تو چونکہ خود جمیلہ سے اس بارے میں بات کی تھی اس لئے اسے تو زیادہ ہی بے چینی تھی۔

"کیا تم نے زلیخا خالہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ بیٹے کی نوکری لگتے ہی خالدہ کی گردن میں سریا فٹ ہو گیا ہے، بہت نخرے والی ہو گئی ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، سارا محلہ گواہ ہے کہ مجھ میں نہ پہلے غرور تھا وہ نہ اب ہے۔"

"ہاں! میں اس بات سے انکار نہیں کرتی کہ میں نے تمہارے بارے میں رکھ کہا لیکن

ابتدا تو تم نے کی تھی نا، مجھے تو غصہ آنا ہی تھا۔"

"لو جی، میں نے کس بات کی ابتدا کی؟ بتاؤ تو ذرا۔" خالدہ نے سوالیہ نظروں سے سکینہ کو دیکھا۔

جمیلہ چائے لے کر آ گئیں تو ان کے گلے شکوے جاری تھے اور اب بنیاد وہی بات کھلنے والی تھی جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف دل میں کدورت رکھے ہوئے تھیں، وہ چائے کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

"تم نے زلیخا خالہ کے سامنے کہا کہ میں تو بہت اونچے گھرانے میں اپنے بیٹے کی شادی کروں گی اور سکینہ کی بیٹی تو اس قابل نہیں کہ میں اپنے بیٹے کا رشتہ کروں اس سے۔" سکینہ جواباً جھٹ سے بولیں۔

"خدا کا خوف کرو، میں نے یہ سب کب کہا ہے۔" خالدہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

"بلکہ تم نے یہ کہا تھا کہ خالدہ کا بیٹا جتنا بھی پڑھ لکھ جائے رہے گا تو خالدہ جیسی جاہل عورت کا بیٹا اور میں تو ایسی عورت کو کبھی اپنی بیٹی نہ دوں۔" خالدہ بھی دو بدو بولیں۔

"لو بھئی، یہ تو وہ بات ہو گئی، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، تو کیا تم نے میری بیٹی کے بارے میں باتیں نہیں کیں؟ اور تو اور اس کے کردار پر بھی انگلی اٹھائی۔ میں پوچھتی ہوں کیا عیب دیکھا تم نے میری بیٹی میں جو اس پر الزام تراشی شروع کر دی۔" سکینہ کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا، اس کی بات پر تو خالدہ تڑپ ہی گئیں۔

"سکینہ! میری ایک بات یاد رکھنا، ہمارے آپس میں جتنے بھی اختلافات ہوں، شاید تمہارے نزدیک میں بہت بری ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ میں کبھی مریم کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی کجا کہ اس کی کردار کشی کروں، وہ

ہمارے خاندان کی عزت ہے، مجھے اپنی بچیوں کی طرح عزیز ہے اور مجھے وہ دل سے پسند ہے۔" خالدہ بولیں تو ان کا لہجہ سچائی لیے ہوئے تھا۔

"اسی لئے تو میں نے زلیخا خالہ کے ذریعے مریم کے رشتے کے لئے پیغام بھجوایا تھا لیکن تم نے اتنی باتیں کیں اور اس کے بعد مجھ سے ناراضگی بھی کر لی تو مجھے بھی غصہ آ گیا کہ اگر تم مجھے نہیں بلاتی تو میں کیوں بلاؤں۔" انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید وضاحت دی، ان کے اس بات پر جمیلہ نے چونک کر بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ان کو دیکھا تھا، یعنی ان کی بھی یہی خواہش تھی جو وہ سب کی تھی اور سکینہ کو تو ان کی بات پر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"لیکن زلیخا خالہ نے تو مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا، اصل میں بات یہ ہے کہ میری تو خود بھی خواہش تھی کہ اگر مریم کا رشتہ تمہارے ہاں ہو جائے تو میری بیٹی میرے قریب ہی رہے گی لیکن میں سوچتی تھی کہ پتہ نہیں تم اس بارے میں کیا سوچ رکھتی ہو، اس لئے میں نے زلیخا خالہ سے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ وہ تمہارے خیالات جاننے کی کوشش کریں اور کچھ دنوں بعد انہوں نے مجھے یہ سب کہا جو میں نے تمہیں بتایا ہے، جب انہوں نے کہا کہ تم نے مریم کے کردار پر باتیں کیں ہیں تو مجھے تم پر غصہ آیا اس لئے میں تم سے ناراض ہو گئی۔" سکینہ کے لہجے میں تاسف اور ندامت یک بیک محسوس کی جا سکتی تھی۔

"تو میرا اندیشہ صحیح تھا، زلیخا خالہ ان دونوں کے درمیان غلط فہمیاں ڈال رہی تھیں۔" جمیلہ نے دل میں سوچا اور ان سے مخاطب ہو گئیں۔

"ایک منٹ، اب میری بات سنیں، مزید گلے شکوے ختم کریں اور یہ سوچیں کہ اگر آپ

دونوں نے یہ سب باتیں کہیں نہیں تو پھر یہ سب باتیں کس نے بڑھا چڑھا کر آپ تک پہنچائی ہیں؟" جمیلہ کی بات پر دونوں پر سوچ انداز میں چپ کی چپ رہ گئیں اور عین اسی لمحے زلیخا خالہ جمیلہ کے گھر آ گئیں، انہوں نے ان دونوں کو جمیلہ کے گھر آتے دیکھا تو مارے تجسس کے ان سے رہا نہیں جا رہا تھا اس لئے سن گن لینے کے لئے وہ ان کے گھر آئی تھیں۔

جمیلہ نے ایک نظر انہیں دیکھا، معاملہ سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا تھا، جس نے ان کے درمیان غلط فہمیاں ڈالی تھیں وہ اپنی ٹوہ لینے کی عادت سے مجبور خود ہی چل کر ان کے گھر آ گئی تھیں۔

"ادھر ہی آ جائیں خالہ۔" جمیلہ انہیں ان دونوں کے پاس ہی لے آئیں۔

"اب تمہی کی باتوں سے مجھے تو یہی سمجھ لگی ہے کہ آپ دونوں اپنی زیادہ تر باتیں زلیخا خالہ کے سامنے کرتی ہیں اور ان کے ذریعے ہی ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچائی جاتی ہیں تو اب خالہ تو پاس ہی موجود ہیں ان کے سامنے بات واضح کر لیں۔" جمیلہ کے کہنے پر یکدم ہی زلیخا خالہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

کچھ لوگ زلیخا جیسے ہوتے ہیں جو چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور دوسروں کے درمیان رنجشیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مزید لڑائی جھگڑے کو طول دیتے ہیں لیکن اسی دنیا میں کچھ لوگ آپی جمیلہ جیسے مخلص بھی ہوتے ہیں جو کہ لوگوں میں لڑائی ہوتی دیکھ کر ان میں صلح کرواتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں جمی میل صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی کوشش وہ اس وقت بھی کر رہی تھیں۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں، خالہ سامنے ہی

بیٹھی ہے پوچھ لو ان سے، میں نے مریم کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، کیوں خالہ؟" خالدہ نے سکینہ اور زلیخا کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا تو وہ سکینہ بھی ان سے استفسار کرنے لگیں اور پھر تو پوچھنے کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔

زلیخا خالہ تو پہلے ہی گھبرا گئی تھیں اب تو ان کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے، ان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں جب آ گئی سے زیادہ باتیں تو انہوں نے سن گھڑت بنائی تھیں۔

"بھئی مجھے اپنے گھریلو معاملات سے دور ہی رکھو، خود آپس میں تمہارا اتفاق نہیں ہے تو دوسروں کو کیوں درمیان میں گھسیٹتی ہو، مجھے کیا پتہ کہ کیا ہو گی تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف باتیں، مجھے تو کچھ نہیں پتہ۔" وہ ایک دم سے اٹھیں، جب کوئی جواب نہ بن پایا تو الٹا انہیں ہی سنا کر وہ اپنے گھر کا رخ کرنے لگیں۔

بات اتنی سی تھی اندیشہ ہائے مجم نے اسے بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے برسوں پہلے یہ شعر اقبال نے کسی اور پس منظر میں کہا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں موجود ایسے کرداروں کے لئے ہی کہا گیا ہو، جمیلہ تاسف سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہیں اور وہ دونوں تو حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں گھری ہوئی تھیں، کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، جمیلہ نے بھی بولنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اب بات تو ان کے سامنے کھل ہی چکی تھی۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے، زلیخا خالہ کو میری بیٹی سے کیا دشمنی تھی جو انہوں نے ایسے سوچا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سکینہ دکھ سے بولیں۔

"مجھے تو خود حیرت ہو رہی ہے، اتنے برسوں کا ساتھ ہے، میں تو دل سے ان کی عزت کرتی تھی اور وہ، جو کبھی ہیں مان بھی چکی تھی کہ اس عمر میں وہ جھوٹ کیوں کہیں گی، افسوس ہو رہا ہے ان کی سوچ اور ذہنیت پر۔" خالدہ بھی کف افسوس ملتے ہوئے بولیں۔

"اگرچہ یہ آپ دونوں کا ذاتی معاملہ ہے لیکن بات چونکہ میرے گھر میں میرے سامنے چل رہی ہے، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔" جمیلہ نے باری باری دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی آپی جی، آپ ضرور کہیں بلکہ آپ تو ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں ہمیں مشورہ بھی دیں۔" سکینہ فوراً بولیں تو خالدہ نے بھی ان کی تائید کی۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ اگر زلیخا خالہ نے باتیں کی ہیں تو انہیں یہ حق کس نے دیا؟ آپ دونوں نے، کیونکہ چھوٹے موٹے اختلافات تو ہر گھر میں ہر رشتے میں ہو ہی جاتے ہیں لیکن اپنے گھر کی بات کو گھر میں ہی نمٹانا چاہیے بجائے اس کے کہ دوسروں کے سامنے واویلا کیا جائے اس سے دوسروں کو آپ کے معاملات میں بولنے کا موقع مل جاتا ہے، اس محلے میں ہم سب کو کئی برس گزر گئے رہتے ہوئے، اتنے موسم آئے گئے ہم اکٹھے ہی ہیں، سب ایک دوسرے کی عادات سے واقف ہیں، اس لئے انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور چھوٹی سی بات کو ہوا دے کر آپ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا دیا اور یہ بات کہ زلیخا خالہ نے ایسا کیوں کیا تو ہم سب کو ان کی فطرت کا پتہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے کی باتیں کرنے کی عادت ہے، یہ سادہ سی بات ہے جو آپ کے سامنے جو کسی کی برائی کر سکتا ہے وہ کسی اور کے سامنے آپ کی برائی بھی کر سکتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے، میل جول رکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ضرورت کے تحت اور اپنے معاملات میں تو قطعاً شامل نہیں کرنا چاہیے اور آپ دونوں نے اپنے بچوں کے رشتے جیسے نازک معاملے میں ان کو شامل کیا بگاڑ تو پیدا ہونا ہی تھا، اس لئے اب آئندہ کے لئے محتاط رہیں۔" انہوں نے سلیقے سے اپنی بات ان تک پہنچائی کہ انہیں برا بھی نہ لگے اور اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے۔

انہوں نے دانستہ شاہدہ والی بات کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ ضرورت کسی کی کہی بات اچھالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر معاملہ سیدھی طرح سلجھ رہا ہو تو کسی کی پردہ پوشی کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

"بات تو آپ کی صحیح ہے خوامخواہ میں چھوٹے موٹے اختلافات پال کر پھر ان کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کچھ نہیں ملتا الٹا لوگ الزام تراشی ہی کرتے ہیں، وقتی طور پر ہمدردی کرتے ہیں اور پھر پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے ہیں۔" خالدہ شرمندہ شرمندہ لہجے میں بولی تو سکینہ نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"چلیں اب اس بات کو یہیں ختم کریں اور ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف کر لیں، چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے میں گرم کر کے لاتی ہوں پھر کر بیٹھے ہیں آپ تب تک اپنے بچوں کی شادی کی تیاریوں پر غور کریں۔" جمیلہ نے مسکرا کر کہا تو وہ دونوں بھی مسکرا دیں تو وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں، صبا اور عاصم دونوں کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے اور بظاہر اندر سے آتی آواز میں سب ٹھیک ہو جانے کی ہی نوید سنا رہی تھیں۔

جمیلہ نے باہر نکلتے ہوئے سامنے صحن میں بیٹھے عاصم اور صبا کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ دونوں بھی خوش ہو گئے۔

"یقیناً اب یہ صلح کتنے دن چلے گی اور یہ طوفان کتنے دن خاموش رہتا ہے۔" عاصم نے سکینہ اور خالدہ کی لڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا خدشہ بیان کیا۔

"فکر نہیں کرو، فی الحال طوفان تھم چکا ہے اور دوبارہ متوقع طوفان آنے سے پہلے ہی ہم زوہیب اور مریم کے رشتے کی زنجیر سے اس طوفان پر بند باندھ دیں گے، پھر وقتاً فوقتاً اختلافات کی صورت میں جتنی بھی طوفانی لہریں ابھریں اس زنجیر تک پہنچتے پہنچتے خود ہی نرم پڑ جایا کریں گی۔" جمیلہ نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے عاصم کے انداز میں ہی وضاحت کی تو ان دونوں کے ہونٹوں پر بھی آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی پھر وہ چائے گرم کرنے چل دیں جبکہ ان دونوں نے جلدی سے اپنے اپنے موبائل اٹھائے۔

"تمہارے لئے بہت اچھی خبر ہے، شام کو تمہاری طرف آ کر تفصیل سے بتاؤں گی۔" صبا کا میسج پڑھتے ہی مریم سکون آمیز کیفیت میں گھر گئی تھی۔

"مبارک ہو، مذاکرات کامیاب ہو گئے۔" دوسری طرف عاصم کے مختصر سے میسج نے زوہیب کو اندر تک سرشار کر دیا تھا۔

بعض دفعہ مختصر اور عام سے الفاظ اندر تک خوشیوں کے پھول کھلا دیتے ہیں کیونکہ ان میں چھپا پیغام اور مفہوم خوشیوں کا پیامبر بن کر آتا ہے۔

جواباً عاصم کو کامیابی کا نشان بنا کر میسج بھیجتے ہوئے دل سے اٹھتی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا گھیراؤ کیا تھا۔

☆☆☆

"رطابہ میری پیاری بہنا جلدی سے یہ میری شرٹ پریس کر دو اور ہاں دو کپ چائے ساتھ میں کباب بھی فرائی کر لینا، صولت آیا ہوا ہے ہم نے کہیں جانا ہے۔" غارب نے شرٹ اس کی طرف اچھالی اور جلدی سے حکم صادر کرتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا تو رطابہ کی طرف اچھالی ہوئی شرٹ اس کے کاندھوں پہ لاڈلے بچے کی طرح سوار ہو گئی۔

"مجھ سے نہیں اتنی خدمتیں ہوتیں، رطابہ یہ کرو وہ، رطابہ وہ کرو اب دوست آ رہے ہیں چائے بنا دو، پانی پلا دو، کمرے کی ڈسٹنگ کر دو، رطابہ نہ ہوئی بے دام غلام ہو گئی مجھ سے نہیں ہوتے یہ سب کام بیگم لے آؤ۔" وہ کورا جواب دے کر پھر سے مووی دیکھنے میں مگن ہو گئی۔

"بیگم تو تمہیں یہاں سے نکالنے کے بعد ہی آئے گی کیونکہ امی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے پہلے تمہیں رخصت کریں گی بعد میں بہو گھر میں قدم رکھے گی ورنہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے اس گھر میں تمہاری ایک عدد بھابھی جلوہ افروز ہو جائے اور میں اپنے ساتھ ساتھ تمہاری بھی خوب خدمت کرواؤں مگر وائے حسرت، فی الحال تو مجھے اپنی پیاری بہنا کی ہی منت سماجت کرنی ہے۔" وہ مسکینیت بھرے لہجے میں بولا تو رطابہ کو اس پر ترس آ گیا اور اسے گھورتے ہوئے کچن کا رخ کیا تو غارب بھی مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف ہو لیا۔

ادھر رطابہ نے گریجویشن مکمل کی اور ادھر چھوٹی خالہ اس کا رشتہ لئے نازل ہو گئیں خالہ کے پڑوس میں بڑی اچھی فیملی رہتی تھی لڑکا وکیل تھا اور والد افسر تھے، چھوٹے بہن بھائی ابھی پڑھ رہے تھے رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا لڑکے نے ایک دو بار رطابہ کو خالہ کی طرف آتے جاتے دیکھا تو فوراً ماں سے پسندیدگی کا اظہار کیا اور لڑکے کی والدہ وقت ضائع کیے بغیر رطابہ کی خالہ کے پاس سوالی بن کر جا پہنچیں، خالہ کے بچے چونکہ ابھی رطابہ سے چھوٹے تھے اس لئے ان کا تو کوئی حق ہی نہیں بنتا تھا وہ فوراً بڑی بہن کے گھر رطابہ کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں اور انہیں ہر طرح سے قائل کرنے لگیں، آرزو کی بھی ان لوگوں سے دو چار بار بہن کے گھر ملاقات ہو چکی تھی انہیں بھی وہ ہر لحاظ سے ٹھیک لگے تھے اسی لئے فوراً ہی شوہر سے بات کر کے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا رطابہ کے آگے پڑھنے کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، بس ذہن میں ماں کا ایک فقرہ لئے خوشی خوشی شوہر کے گھر میں قدم رکھا کہ بیٹی اب تم جہاں جا رہی ہو اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا، تمام فکروں پریشانیوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے نئے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

نیا گھر اپنا گھر جس کو وہ خوشیوں کی آماجگاہ سمجھ کر چلی جا رہی تھی ساس سسر کی اپنائیت، چھوٹی نند کا ساتھ، دیور کی شرارتیں اسے کسی رویوں کی طرف سوچنے ہی نہ دیتے، سب سے بڑھ کر روحیل کا خوبصورت ساتھ جس کی ہمراہی میں

اسے دنیا حسین تر دکھائی دیتی، دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزرا، روحیل نے اسے خوب گھمایا پھرایا اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو فرض اولین کی طرح پورا کیا، اس کے خوبصورت لمحوں میں ڈوبے جیتے زندگی بھر خوش رکھنے کے وعدے، مخمور نگاہیں دن بھر اس کے ہونٹوں پہ مسکان بکھیرے رکھتے۔

"پتا نہیں کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو سسرال کو قید خانہ اور سسرالی رشتوں کو بوجھ سمجھتی ہیں میری دوست افرا کی شادی میری شادی سے کچھ عرصہ

تھل ہی ہوئی ہے مگر ہمیشہ زبان پہ شکوے ہی رہتے ہیں جب کہ مجھے تو اس کی باتیں زہر لگتی ہیں ایک نمبر کی جھوٹی لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے سسرال کی خامیوں کو ہی موضوع سخن بنا کر رکھتی ہیں۔'' روجیل کے سینے پہ سر رکھے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی اور وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کی معصوم باتوں پہ مسکرائے جا رہا تھا کب باتیں کرتی کرتی وہ نیند کی وادیوں میں گئی اسے پتا ہی نہ چلا۔

☆☆☆

شادی کے دو ہفتے بعد کھیر پکائی کی رسم ادا کی گئی اور شائستہ خاتون بہو کے سپرد گھر کر کے کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گئیں۔

''ویسے بھی رطابہ بیٹا یہ گھر ہے لیکن اب تمہارا ہے اپنا گھر سمجھ کر اسے سنوارو، نکھارو سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' ساس کے منہ سے یہ فقرے سن کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا چہرے پہ خوشی دمکنے لگی، اتنے بڑے گھر کی مالکن صرف میں ہوں یہ میرا اپنا گھر ہے جہاں میری مرضی چلے گی جو دل چاہے پکاؤں جب دل چاہے اس کی سیٹنگ بدلوں کیونکہ یہ میرا گھر ہے، خوشی سے سرشار اس نے شائستہ خاتون کے ہاتھ چوم لیے تو وہ بھی اچھے سراں میں مسکراتی اپنے بیڈروم کی طرف ہو لیں، اپنے گھر کا خوبصورت احساس لیے وہ خوابوں کے محل میں سفر کر رہی تھی کہ روجیل نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''رطابہ اب اٹھ بھی جاؤ ناشتے کی ٹیبل پہ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''مجھے ابھی ناشتہ نہیں کرنا مجھے نیند آ رہی ہے میں بعد میں کر لوں گی۔'' نیند سے بوجھل آواز میں اپنا فیصلہ سنا کر وہ پھر سے نیند کی لپیٹ میں جانے لگی تو روجیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا کر بٹھا دیا۔

''بیگم صاحبہ آپ کے ناشتے کی بات نہیں کر رہا ہیں، سب لوگ ٹیبل پر اس انتظار میں ہیں کہ کب تم ان کو ناشتہ سرو کرو۔''

''مگر ناشتہ تو امی بناتی ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''امی بناتی تھیں، تمہیں شاید یاد نہیں کہ کل امی نے تمہیں یاد کرا دیا تھا کہ یہ گھر اب تمہارا ہے اب اس گھر کی تمام تر ذمہ داری تمہاری ہے اٹھ کر جلدی سے ناشتہ بناؤ، پہلے ہی دن سب کے سامنے شرمندہ کروا دیا۔'' ناراض لہجے میں کہتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا، یہ سب سن کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر کچن کا رخ کیا سب ٹیبل پر اس کے بنائے گئے ناشتے کے منتظر تھے، وہ شرمندہ ہوتی جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

''بھابھی پلیز جلدی کریں میری وین آنے والی ہے بس منٹ رہ گئے ہیں خالی پیٹ میرا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' قدرے منہ پھلائے تنزیلہ نے فرمان جاری کیا تو اس نے پھرتی سے دو سلائس سینک کر انڈا ہاف فرائی کر کے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی ساتھ ہی چائے کا پانی دوسرے چولہے پر رکھ دیا۔

''رطابہ جلدی سے اپنے ابو کے لیے ناشتہ لے آؤ شوگر کی ٹیبلٹ صبح سے لی ہوئی ہے۔''

''جی امی بس ابھی لے کر آئی۔'' ساس کی آواز پر ہاتھ پاؤں مزید پھول گئے۔

جیسے تیسے کر کے سب کو مطلوبہ ناشتہ کروایا اور سب چہرے پہ خفگی کا تاثر لیے اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ ہو گئے اس نے شکر کا سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف رخ کیا کہ اب سکون سے اپنی نیند پوری کر لوں گی۔

''بیٹا جلدی سے صفائی کا کام کر کے فارغ ہو جاؤ ورنہ لنچ بھی ناشتے کی طرح لیٹ ہو جائے گا۔''

''مگر امی صفائیوں کے لیے تو بشریٰ (ملازمہ) آتی ہے نا۔''

''بشریٰ آتی تھی مگر اب نہیں آئے گی میں نے اسے کل ہی فارغ کر دیا تھا سارے گھر کا کوڑا کرکٹ کونوں کھدروں میں کر دیتی تھی، بالکل بھی صفائی سے کام نہیں کرتی تھی وہ تو مجبوری میں اس سے کام لینا پڑتا تھا اب تم آ گئی ہو تو، اپنے گھر کو سنبھالو سلیقے صفائی سے اس کو چمکا دو جانے کب سے نے اپنے گھر کو کیسا سنوار کر رکھا ہے، سدرہ کے کمرے کی ڈسٹنگ اچھی طرح کر لینا بے حد نفاست پسند ہے بے ترتیبی اسے ہرگز گوارا نہیں باقیوں کی تو خیر ہے۔'' وہ حکم صادر کیے جا رہی تھیں اور وہ حیرانی سے منہ کھولے ان کی باتیں سنے جا رہی تھی۔

''اور ہاں کھانے میں اپنے ابو کے لیے مونگ کی دال پتلی سی بنانا وہ سادہ کھانا ہی پسند کرتے ہیں، باقی سب کے لیے چکن بنا لینا، چاول بالکل نرم اور پتلی ہونی چاہیے ورنہ اشعر کا موڈ آف ہو جائے گا۔'' سب کی پسند ناپسند سے آگاہ کر کے وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں اور وہ اپنے گھر کو سنبھالنے کے چکر میں ایسی گھن چکر بنی کہ اپنے آپ سے ہی بیگانہ ہو گئی، گھر کی صفائی ستھرائی، ڈسٹنگ، فرمائشی کھانے بنانے پکانے وہ ہلکان ہو کر رہ گئی۔

کتنے دن بعد وہ دو دن کے لیے میکے میں رہنے آئی تھی، ماں کی گود کا لمس اسے نیند کی وادیوں میں لے گیا تو آرزو اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر اس کی پسند کا کھانا بنانے چلی گئیں شام کو وہ سو کر اٹھی تو فریش ہو کر امی کے پاس کچن میں چلی آئی۔

''واہ بڑی پیاری مہک آ رہی ہے۔'' پتیلیوں کے ڈھکن کھول کھول کر دیکھنے لگی۔

''اتنے دنوں بعد میری بیٹی آئی ہے تو اس کی پسند کے کھانے بھی نہ بناؤں۔'' انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر سنک میں دھرے برتنوں کو کھنگالنے لگی تو آرزو نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند کر دی۔

''خبردار جو یہاں کسی کام کو ہاتھ لگایا چند دن کے لیے آئی ہو تو اب آرام کرو۔''

''ارے چھوڑیں امی اتنا سا کام کرنے سے کیا ہوتا ہے اور سچ پوچھیں تو اب فارغ رہا ہی نہیں جاتا، ہاتھوں کو ہر دم متحرک رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' اس نے پھر سے پلیٹیں کھنگالنی شروع کیں تو وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

''ارے واہ امی آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ہماری پرانی ماسی جو اتنے عرصے سے کام کر رہی تھی اس نے ہمیں پھر سے جوائن کر لیا ہے۔'' عارب شرارت سے مسکراتا ہوا کچن میں داخل ہوا تو اس نے پلٹ کر گیلے ہاتھوں سے اس کے بال بکھیر دیے۔

''یہ ماسی تمہیں اب جوائن نہیں کر سکتی کیونکہ اب اس ماسی کو اس کا اپنا Permanent گھر مل چکا ہے، اس لیے تم کہو تو تمہارے لیے نئی ماسی کا انتظام کر دیتی ہوں، روجیل کی بڑی پیاری پیاری کزنز ہیں۔'' امی اس کا مطلب سمجھ کر اتنے سے مسکرائیں اور عارب ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کچن سے نکل گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی کپڑوں کا ڈھیر لاؤنج میں استری اسٹینڈ پہ پڑا تھا اس نے کپڑے پھیلانا شروع کیے، عارب ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا ساتھ ساتھ رطابہ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔

بیکے بعد وہ گھر سے عظیرا اور جاذب کی آمد نے اسے مزید مصروف کر دیا اور وہ جو اپنا بھی کبھار کچھ خیال کر لیا کرتی تھی ان حالوں سے بھی گئی۔

شذرا کی شادی ہوئی تو آئے روز اس کی میکے میں آمد حال سے بے حال کر دیتی۔ شائستہ کا حکم ہوتا کہ میری بیٹی کے آنے پر کسی چیز میں کوئی کمی نہ ہو اور وہ اس کو پورا کرنے کے لئے اپنی پوری جان لگا دیتی۔ سسر کو وقت پر ناشتہ کھانا، شائستہ خاتون کے حکم، اشعر کے دوستوں کی فرمائشیں اور روحیل کے خیال رکھنے میں کب دن طلوع ہوتا اور کب رات کے سناٹے گونجنے لگتے اسے خبر ہی نہ ہوتی۔

بچوں کو بھی وہ مکمل وقت دے رہی تھی ہاں اگر نظر انداز ہو رہی تھی تو وہ اس کی ذات تھی اور اسے اپنی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا گھر اس کے محمود سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

شذرا کی طبیعت کچھ دنوں سے ناساز تھی اور وہ میکے رہنے آئی ہوئی تھی۔ صبح سے بھابھی سے فرمائشی پروگرام شروع ہوتا اور رات تک جاری رہتا۔ رطابہ پیشانی پر بل ڈالے بغیر مسکراتی ہوئی نند کی خدمتوں میں لگی رہتی۔ کچن فرائیڈ رائس بنانے کے لئے اس نے جلدی جلدی سبزیاں کاٹیں، کچن دھو کر چھلنی میں رکھا ساتھ ہی بھیگے ہوئے چاول ابالنے کے لئے رکھ دیئے۔ اس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے کبھی کبھی وہ اپنے آپ پر حیران ہوتی کہ شادی سے پہلے اتنی سست اور کام چور لڑکی میں سسرال میں آ کر کیسی بجلی بھر گئی کہ سب کام منٹوں میں کر دیتی ہے کوئی عذر نہیں کوئی نخرہ نہیں۔ یہ سب امی کی تربیت کا نتیجہ ہے ان کی نصیحتوں اور سوچ نے میرے ذہن و دل پر نقش کر رکھا ہے میں بھی اپنی ماں کی تربیت پر حرف نہیں آنے دے سکتی۔ امی نے مجھے پورے مان اور بھروسے سے اپنے گھر بھیجا ہے کہ میں اپنی خدمت گزاری و سلیقہ مندی سے سب کے دل جیت لوں اور واقعی مجھ سے آج بھی خوش ہیں گھر میں کبھی تناؤ کی فضا قائم نہیں ہوئی روحیل کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی سب کو میرا کام پسند آتا ہے کسی کو مجھ سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہیں۔ کتنی خوش نصیب ہوں میں کہ مجھے قدر کرنے والا سسرال ملا۔ امی کے لفظوں سے وہ اکثر یہ جملے سنا کرتی تھی۔

"عورت کا گھر صرف گھر والے سے نہیں ہوتا گھر والوں سے ہوتا ہے، مرد تو صبح کا گیا رات کو گھر میں گھستا ہے لڑکی کو رہنا تو سسرال والوں کے ساتھ ہوتا ہے اسے ہمیشہ گھر والوں سے بنا کر رکھنی چاہیے تاکہ گھر میں کسی قسم کی رنجش جنم نہ لے اور اس کی ذات سے دوسرے بھی سکون میں رہیں اور وہ خود بھی ذہنی طور پر پرسکون رہے گی اور لڑکی ذہنی طور پر پرسکون ہو گی تو مرد بھی ذہنی اذیت سے بچا رہے گا، زندگی خوشگوار ماحول میں گزرے گی اور اس کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا۔" وہ امی کی باتیں یاد کر کے مسکرا رہی تھی چاولوں کا پانی باہر نکلنے لگا تو چولہے کی آنچ دھیمی کر کے وہ شذرا کے کمرے میں اس سے یہ پوچھنے چل دی کہ وہ رات کا مینیو بھی بتا دے تاکہ تھوڑی بہت اس کی بھی تیاری کر لے وہ دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ شذرا کی بات سن کر ٹھٹک گئی۔

"مکلاوے کے بعد جب میں یہاں سے گئی تو چند دن بعد ہی فرحان کی امی نے مجھ سے چولہے کی رسم کروانے کے بعد چابیاں میرے ہاتھ میں تھما دیں کہ "لو بہو آج سے یہ گھر تمہارا ہے سنبھالو اپنا گھر۔" میں نے کمال دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چابیاں واپس ان کے ہاتھوں میں منتقل کر دیں۔"

"امی آپ اس گھر کی بڑی ہیں ساری عمر اس گھر میں گزاری ہے میں کل کی آئی کیسے اس گھر پر اتنی جلدی اپنا حق جتا سکتی ہوں، یہ گھر آپ کا ہے آپ کے ہوتے ہوئے میں اس گھر کو سنبھالتی کیا اچھی لگوں گی۔" میری بات سن کر انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔

"میں بے وقوف تو نہیں تھی جو اپنا گھر سمجھ کر اپنے آپ سے ہی بے نیاز ہو جاتی، بھابھی کی مثال میرے سامنے تھی سارا دن ہمارے اور گھر کے کاموں میں گھن چکر بنی رہتی ہیں، اپنے آپ کو انہیں کبھی آئینے میں دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملی یہ تو روحیل بھائی کی شرافت ہے جو وہ اچھے رف حلیے میں رہنے والی بیوی کو برداشت کر رہے ہیں، مجھے ایسی نوکری اور گھر نہیں چاہیے جہاں انسان کی اپنی آزادی اور ذات ہی ختم ہو رہی ہو سارا دن گھر کے کاموں میں الجھ کر رات کو جب شوہر کے آنے کا ٹائم ہو تو میں سر جھاڑ منہ پہاڑ اس کو ملوں اور وہ میری اجڑی صورت دیکھ کر باہر راستے تلاش کرنے لگے نہ بابا نہ مجھے ایسا اپنا گھر نہیں چاہیے، میرا گھر وہی ہو گا جو میرے شوہر کی کمائی سے بنے گا جہاں میں پوری آزادی کے ساتھ حکمرانی کروں گی۔" شذرا روانی سے بولتی جا رہی تھی۔

"بہت اچھا کیا کوئی ضرورت نہیں ہے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی، ساری زندگی سسرالیوں میں جھونک دو پھر بھی یہ کہاں اپنے بنتے ہیں ساس بہو کا رشتہ ساس بہو کا ہی رہتا ہے، اب میری بہو کو ہی دیکھ لو کیسی چلتر ہے میں نے چابیاں پکڑائیں اور فوراً ہی تھام لیں، پورے گھر پہ قبضہ جما رکھا ہے، ہر چیز میں اس کی مرضی چلتی ہے، جو دل چاہے ہمارے سامنے پکا کر رکھ دے، صبر و شکر کا گھونٹ کر کے اندر اتار لیتے ہیں، ماں نے سمجھا کر جو بھیجا ہو گا کہ جاتے ہی سب کچھ اپنی مٹھی میں کر لینا۔"

"جی..... ہاں ہمیں یہ چالاکیاں نہ آئیں کیسے آسانی سے سب کچھ آتے ہی بہو کے ہاتھوں میں تھما دیا۔" شائستہ خاتون نے گہری سانس بھری اور باہر کھڑی رطابہ اپنی جگہ بکھر کر رہ گئی اس کا سر چکرا کر رہ گیا، اس کے ذہن میں کئی فقرے گردش کر رہے تھے۔

"عورت کا گھر صرف گھر والے سے نہیں گھر والوں سے ہوتا ہے۔"

"میری بچی سسرال والے ہی اب تمہارے ہیں ان سب کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"ساری زندگی سسرالیوں میں جھونک دو پھر بھی یہ کہاں اپنے بنتے ہیں ساس بہو کا رشتہ ساس بہو کا ہی رہتا ہے اب میری بہو کو ہی دیکھ لو کیسی چلتر ہے میں نے چابیاں پکڑائیں اور اس نے فوراً ہی تھام لیں۔" لفظوں کی تکرار اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی، وہ اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹتی آنکھوں سے تواتر سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتی بے جان وجود کے ساتھ دوبارہ کچن میں داخل ہو گئی، اس کا ذہن عجیب الجھن کا شکار ہوا ہوا تھا وہ اس سوچ میں پڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی عظیرا کی تربیت اپنی ماں کی سوچ کی نہج پر کرے یا شائستہ خاتون کی، آنکھوں میں نمی لئے وہ رنجیدہ دل کے ساتھ مسلسل سوچتے ہوئے باقی ماندہ کام سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

"شیدے دی ووہٹی اپنے شہری یار نال بھاگ گئی۔" یہ فقرہ تین دن سے پنڈ کے ہر فرد کے منہ پہ تھا، ہر محفل میں دہرایا جاتا اور آج بھی گویا گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔

"بے چارہ شیدا! کسی نوں منہ وکھانے لائق نہیں رہا۔" امجد نے تاسف سے سر ہلا کر ماتھے پر آیا پسینہ انگلیوں سے پونچھ کر کہا۔

"ہور نئیں تو کیا، بے چارہ تین دن سے کار (گھر) سے باہر نہیں آیا۔"

"اللہ بچائے ایسی جی کڑیاں توں جناں توں نے اپنی عزت دی کوئی پروا نا اپنے کار والے دی۔" (اللہ بچائے ایسی لڑکیوں کو، جنہیں نہ اپنی عزت کی کوئی پروا، نا اپنے گھر والے کی) بشیر خدا بخش سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"مینوں تے شروع دن توں اوس دے چال چلن ٹھیک نہیں لگدے سی۔" (مجھے تو شروع دن سے اس کے چال چلن ٹھیک نہیں لگ رہے تھے) جاوید عرف جیدا نے تاش کا پتہ پھینکتے ہوئے گویا سچ کی بات کی۔

"سچ کہا اے، شہر دیاں کڑیاں، ایس تے کوئی بھروسہ نہیں۔"

"آ...... ہا...... بے چارہ شیدا۔" امجد سر اوپر کر کے آسمان پہ اڑتے پرندے کے غول دیکھ رہا تھا، جو اپنے اپنے آشیانے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

اوائل مئی کی تپتی دوپہر کے بعد عصر کا وقت تھا، سنہری دھوپ دیواروں پر چڑھ کر سورج کی تپش کا اثر زائل کر رہی تھی، جبکہ ماحول میں ابھی بھی گھٹن اور حبس تھا۔ اس چھوٹے سے پنڈ کے غربت کی چکی میں پستے غیرت مند جفاکش مزارعے اور کسان دن بھر کے کاموں سے تھکے ہارے معمول کی طرح رفیق عرف فیقے کی دکان کے آگے بنے چوپال پر بیٹھے اپنی دوسری گپ شپ میں مصروف تھے۔ نوجوانوں میں تاش کی بازی لگ چکی تھی اور بڑے زور و شور سے رشید عرف شیدے کی بیوی کے کارنامے پر تبصرہ کر رہے تھے، جو گھر چھوڑ کر منہ اندھیرے نکل گئی تھی۔ کرم دین قریب ایک چارپائی پہ بیٹھا گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا، دل میں جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا، جانے کیوں وہ مجرم بنا سر جھکائے بیٹھا تھا شاید اس لیے کہ۔

"او چاچا جی!" فیقے نے ہاتھ اس کے کندھے پہ مارا، وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

"تیری نوں (بہو) بھی تو شہر کی ہے ناں؟" اس نے گویا یاد دہانی کروائی۔ کرم دین کا دل دھک دھک کرنے لگا، بظاہر خود کو پرسکون کرتے وہ دوبارہ آہ بھر کر رہ گیا۔

"میری مان تو نظر رکھ، ان شہر دی کڑیاں دا کوئی بھروسہ نہیں، کتے تیری پگ بھی مٹی میں نہ ملا دے۔" وہ ہمدردانہ انداز میں مشورہ دینے لگا۔ کرم دین کے دل میں ہول سا اٹھا، مگر لب بستہ خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا۔ گاؤں کے کچے گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، نیلگوں آسمان کی نارنجی سرخی کو دیکھتے ہوئے، کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

"امجد کی نئی نویلی دلہن شیدے کی بیوی کی طرح...... لاحول ولا......" وہ خود اپنے تصور پر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"کی سوچ رہے ہو کرمو چاچا؟" امجد حقے کا ایک کش لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔ حقے کی گڑگڑ اور آسمان پر اڑتے اپنے گھر جاتے چیل کوؤں کی کائیں کائیں ماحول کو اپنے اثر میں لے رہے تھے۔

"کج نہیں پتر! اینویں تھکاوٹ ہو رہی

"اے... زرا کار (گھر) جا کے آرام کر لوں تھوڑا۔" وہ بجھے سے چہرے پر آیا جیسے پوچھتا اٹھ گیا۔ کندھے انجانے بوجھ سے جھکے اسے ضعیف بنا رہے تھے۔

"چاچا جی! لگدا اے میری بات سے جی برا ہو گیا اے، پر رب جانے میری نیت بری نئیں۔ شہری پڑھی لکھی کڑیاں دا ابھر رستہ نئیں چنگا۔" نیچے نے ہانک لگائی۔ کرم دین کے قدم جم سے گئے۔ دل پہ بھاری بوجھ لیے وہ اپنی بیکل ڈولتی سنبھالتا آگے بڑھ رہا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے دل میں وسوسوں اور اندیشوں کا سیلاب امڈ رہا تھا اور پاؤں ان دیکھے طوفان سے اکھڑ رہے تھے۔ منزل کا فاصلہ طے کر کے آج وہ ہانپ سے گئے تھے۔ لکڑی کا پھاٹک عبور کرتے اس کے کانوں میں رضیہ کی تیز آواز آئی۔

"کیوں رے نواب زادی، رحمان کے رہندا اے تیرا؟! اجا کم کر دے کھیتوں موت پے رہی اے۔ (رحمان کہاں رہتا ہے تیرا، اتنا سا کام کرتے موت پڑ رہی ہے)۔" وہ خونخوار نگاہوں سے چولہے سامنے چوکی پہ بیٹھی امثال کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ جو سوکھی ٹہنیوں اور لکڑیوں سے چولہا جلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ دھوئیں کی وجہ سے کھانس کھانس کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ کرم دین ایک نظر دونوں پہ ڈال کر پرسوچ انداز میں دائیں طرف بنے باڑے میں بندھے مویشیوں کو دیکھنے چلا گیا۔ جہاں امینہ بالٹی لیے بھینسوں کا دودھ نکال رہی تھی۔ کرم دین کو آتے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

"سلام ابا، آ گئے آپ۔" آنکھوں میں یاس۔ امینہ کے لب و لہجے میں بہت ٹھہراؤ تھا۔ کرم دین بس سر ہلا کر رہ گئے۔

امثال کے کھانسنے اور رضیہ کی خشمگیں آواز یہاں تک آ رہی تھی وہ جلدی جلدی دودھ نکال کر بھینسوں کے آگے چارہ ڈالتی باہر آ گئی۔ ہاتھ دھو کر بالٹی اندر رکھی اور امثال کی مدد کو آ گئی۔

"لائیں بھابھی! میں کر دوں۔" وہ قریب پڑی دوسری پیڑھی گھسیٹ کر بولی۔

"ہٹ پرے ہو۔" رضیہ نے امینہ کو گھورا۔

"کر نہ دے تو آپے ہی نواب زادی نوں، چار دن وچھان رہے گی تے آپے سکھ جاوے گی اوہنے۔" وہ تیز تیز نلکا چلاتی ہوئے گھڑے میں پانی نکال رہی تھی، ساتھ ہی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"آپا...... میں......" امینہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے مگر آپا کے درشت لہجے نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سارا دن اس موئے مشین (موبائل) نے گل کر دے رہ جگیں ہوندا اچار دے اچار بنانے ہاتھ ٹوٹتے نے مرن جوگی دے۔" وہ طنزیہ نظر امثال پہ ڈالتی آخری جملہ چھوڑنے لگی، اسی دوران اندر سے بخار میں تپتی دواؤں کے زیر اثر سوئی چھوٹی کے رونے کی آواز آئی تو وہ کپڑے چھوڑ کر فوراً اندر کو بھاگی۔ امینہ اس کی نقل لگی لیکن پل کھائی چھوٹی رکھتی امثال کے قریب کھسک آئی۔

"بھابھی جی!" آواز میں بے بسی تھی، امثال بمشکل اس کا افسردہ چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپا کی باتوں سے جی برا مت کیا کرو، وہ دل کی بری نہیں۔" چھوٹی کے رونے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور ساتھ میں رضیہ کی بےزار بڑبڑاہٹ بھی۔ امثال ایک نظر نیچے لکڑی کے آدھ کھلے دروازے کو دیکھنے لگی۔ رضیہ باہر نکل رہی تھی، اس نے فوراً رخ موڑ کر دھیان ہاتھ میں

پکڑے پھونکنے پہ لگایا مگر تب تک روٹی جل چکی تھی۔

"بھابھی!" امینہ نے جلدی سے اسے اشارہ کیا اور رضیہ سے دیکھ لیے اور ایک نظر رضیہ کو دیکھا، جو پریشانی سے چھوٹی کا بخار چیک کر رہی تھی۔

"دیکھ کیا رہی اے، چل اٹھ، چھوٹی کا فیڈر بنا دے۔" امینہ کے دیکھنے پر وہ بےزاری سے بخار سے تپتی اور بے تحاشا روتی چھوٹی کو بازو میں جھلاتی بولی۔ امینہ جلدی سے اندر بھاگی، چھوٹی کا فیڈر بناتے اس نے صحن کا بلب بھی روشن کر دیا۔ امثال نے اداسی سے زرد ٹمٹماتے بلب کو دیکھا جو صحن روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

"اری کمبخت کتھے مری پڑی ہو؟" امثال فون کان سے لگائے احمد سے بات کر رہی تھی، جب باہر سے آپا کی تیز آواز آئی، وہ جلدی سے بات ختم کر کے فون رکھنے ہی لگی تھی، مگر آپا کی تیز جانچتی نظروں نے دیکھ لیا، جانے کیوں وہ خود بھی چور سی بن گئی۔

"جلد دیکھو...... مشین (موبائل)؟" وہ تیکھے پن سے موبائل کو دیکھنے لگی۔

"ہاں تو مشین ہی ہے، تو گل کس نال رہی سی اے؟" وہ مشکوک ہوئی۔ امثال نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا مگر آپا ہاتھ اٹھا کر منع کرنے لگی۔

"دیکھ بتا رہی ہوں تجھے، اے بے حیائی چھڈ دے، شریف لوکاں دی کڑیاں جلدی اجڑ دے طور طریقے سکھ، تے چھوڑ دے اے شہر دے چلن۔"

"آپا! میں تو احمد سے......"

"بس بس۔" رضیہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی، امثال ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

"جیہڑیاں میں نے جاندی اے نئی نئی شہر دی کڑیاں نوں، پڑھنی رہے بہانے دی گل چھڑے ازاندے نے، مجنوں جیسی طرح پڑھ لے۔ (جیسے میں تو جانتی نہیں تم شہر کی لڑکیوں کو، پڑھائی کے بہانے کیا گل کھلاتی ہو، اچھی طرح پتہ ہے مجھے)۔" وہ زہر خند لہجے میں کہتی امثال کے دل میں خنجر گھونپ گئی۔

"آپا! مہر کر رہی ہیں آپ، کچھ تو اللہ کا خوف کریں۔" وہ بمشکل آنکھوں کی نمی چھپاتی بولی۔ اپنی توہین، اپنی تذلیل، اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

اسی دوران تکیے پہ رکھا موبائل جل اٹھا، سائلنٹ پہ لگے ہونے کی وجہ سے صرف "زوں زوں" کی آواز ابھری، امثال چور سی بن گئی۔ رضیہ نے خونخوار نگاہوں سے تکیے پہ پڑے "زوں زوں" کرتے موبائل کو دیکھا، جس کی جلتی بجھتی سکرین پہ "احمد کالنگ" لکھا آ رہا تھا۔

"لا...... دے ادھر۔" آپا فون لینے کو آگے بڑھی، امثال نے بےساختہ اسے تکیے سے اٹھایا، جو خاموش ہو کر ایک بار پھر سے "زوں زوں" کر رہا تھا۔ امثال نے ایک بےبس نظر اس پہ ڈالی اور "نو" کا بٹن پش کیا۔

"ادھر دے بے۔" آپا نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے برہمی سے کہا۔

"آپا پلیز۔" وہ منت بھرے انداز میں اتنا ہی بول پائی، جس کا آپا پر الٹا اثر ہوا اور موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"ہن دیکھیں، میں اس کا کی حشر کر دی آں۔" وہ ایک نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ اور دوسری قہر آلود نظر امثال پہ ڈالتی، اپنا پراندہ جھلاتی باہر جانے لگی۔

"نکل سکو گی۔" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر مرکوز کیے گلے میں پڑے تعویذ کے دھاگے پر ہاتھ پھیرتا مسکرائے جا رہا تھا۔ اشتال آپا کی پچھلی باتوں کو یاد کر کے اٹھ کر پیچھے جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ جانے کیا ہوا چیمہ "او تیری خیر" کہہ کر ایکدم بھاگ کر پیچھے کو ہوا، اشتال ناسمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی اور پھر...... وہ دھک سے رہ گئی، سامنے ہی کرم دین سیڑھیوں پر کھڑے ہاتھ میں باجرہ اور سوکھی روٹی لیے ہوئے تھے، وہ یقیناً کبوتروں کو دانہ ڈالنے آئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کون سا تاثر تھا، غصہ، بے یقینی، یا کچھ اور، اشتال سمجھ نہ پائی، لیکن کچھ ایسا تو تھا کہ اس گھٹن اور حبس کے باوجود وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ بے قصور ہونے ہوئے بھی وہ خود کو قصور وار سمجھنے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح جادو کی چھڑی گھمائے اور منظر سے غائب ہو جائے۔ کرم دین چند پل بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر چھت کے ایک کونے میں پڑے کبوتروں کے پنجرے کی طرف بڑھ گیا۔ اشتال اٹھی اور تیزی سے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ کرم دین کے اندر وہ بال سا اٹھا۔

"ایہو جئی کڑیاں نوں تے جیندیاں اے زمین وچ دبا دینا چاہی دا (اس طرح کی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دینا چاہیے)۔" اسلم کی آواز کانوں میں گونجی۔ جو اس نے وحید کی بیوی کے بارے بہت رعونت سے کہے تھے، وہ مڑ کر ایک نظر فتی خدا بخش کی چھت کو دیکھنے لگا، جہاں سے کچھ دیر پہلے چیمہ غائب ہوا تھا اور پھر سیڑھیوں کو دیکھنے لگا، جہاں سے اشتال، کانوں میں وحید کی آواز اور الفاظ گونج رہے تھے، کچھ دن پہلے کا منظر آنکھوں میں ناچا۔

"ابا آج مجھے معاف معاف کر دیو، ابا، بڑا لگے تے معاف کرنا، اس کڑی دے چھین مہینوں اک اکھ نہیں بھاندے، چھت تے کپڑے سکھاون دے بہانے ای کس نال اکھیاں لا دی پئی اے۔" وہ کرب سے ہاتھ ملتے تیز تیز کانپتی آواز میں بول رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے، امینہ دم بخود سب سن رہی تھی۔

"میری مان ابا، احمد مال گل کر، اس نوں پہلے کر اسے سالانے جتنے کا لگ دیوے۔" وہ جبل کی ہالو کی لمبی چوٹی کا جلدی جلدی جوڑا بنانے لگی۔

"بس کر دے آپا۔" چھوٹی سے رہا نہیں گیا۔

"زبان کو تھوڑا سا لگام دیں۔ کسی کی عزت پر انگلی اٹھانے سے پہلے کم از کم اپنی بیٹی کا ہی خیال کر لیں۔" امینہ اس کی ذہنیت پر افسوس کرنے لگی۔ ابا کچھ بھی بولے بغیر بس چپ چاپ بیٹھے تھے، ایسے جیسے کسی طوفان سے پہلے کی خاموشی ہو۔

"بکواس بند کر، خبردار جے میری دھی دا ناں (نام) لیا تے۔" وہ امینہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔

"میں نے خود دیکھا ان گنہگار آنکھوں سے، اس لچھے چیمے نال۔"

"آپا!" امینہ کا ضبط جواب دے گیا۔ جسے نہ جانے کیوں وہ کپکپا اٹھی، اسی شک کی وجہ سے آپا نے اس کا سکول بھی چھڑوا دیا تھا اور آج......

"اسی شک اور زبان کی وجہ تو اپنا گھر کو بسا نہ سکی، کم از کم اس کا (گھر) تو کچھ رحم کرو۔" دل سے نکلی وہ دو بجنے کے قریب کی الفاظ تھے

کہ بندوں کی کوئی، آپا نے بے یقینی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ابا نے بھی جھٹکے سے سر اٹھایا، جیسے اسے امینہ سے اس بات کی توقع نہ ہو اور آپا، اس کے منہ پر تو گویا طمانچہ لگا تھا، وہ سن ہو کر بے یقین نظروں سے امینہ کو دیکھنے لگی، جسے اتنے سال اس نے کھلایا تھا، پالا تھا اور بڑا کیا تھا اور آج ...... وہ شاک میں تھی۔

"دیکھ لے ابا، اچھی طرح دیکھ لے، کیسے خون چٹا ہو گیا اے۔" صدمے کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، امینہ نے نظریں چرا لیں اور آپا ایکدم اشتعال میں آ گئیں۔

"اس حرافہ آوارہ کی حمایت واسطے، اس واسطے تو مجھ پہ......" غصے میں اول فول بکتی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑی اپنی بہن کا خون کر دے، وہ ایک غیر عورت کے لیے اپنی بہن کو غلط کہہ رہی تھی، اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔

"ابا...... ابا...... سن رہے ہو۔" وہ کلیجہ پیٹتی اونچی اونچی آواز میں رونے لگی مگر کرم دین تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا، اس کی نظریں دائیں طرف تھیں، جہاں اشتال بھیگے آنچلوں، بھیگے پائنچوں والے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں خالی بالٹی پکڑے سیڑھیوں کے آخری زینے پر کھڑی تھی۔ جانے کب سے، بے یقین سی، صدمے سے چور۔

☆☆☆

کچے صحن اور کچے کمروں والے گھر کے باہر رات کا آخری پہر تھا، گہرے جامنی آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے، گھر میں ابھی حبس گھٹن باقی تھا، ماحول میں ہوا کی ہلکی سرسراہٹ تھی، آج چاند کی آب و تاب عروج پر تھی، ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی، جھینگروں کی آواز ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، اس گھر کے سارے مکین بے خبر گہری نیند سو رہے تھے، کرم دین صحن میں چاندنی ہونے کے باعث برآمدے میں چارپائی بچھائے سو رہے تھے، اس کی چارپائی اندھیرے میں تھی، جبکہ چارپائی کے نیچے جوتے اور صحن چاند کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ اسی دوران باہر کی کچی دیوار کوئی پھلانگ کر اندر آیا اور دھپ کی آواز کے ساتھ صحن میں کودا۔ کرم دین کچی نیند سے بیدار ہوا اور یوں ہی لیٹے لیٹے آنکھوں کے جھروکوں سے صحن میں دیکھا، جہاں ایک سایہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا، کرم دین چوکنا ہو گیا، مگر بظاہر بے خبر سویا رہا، وہ سایہ کرم دین کی چارپائی کے قریب آیا، کرم دین نے آنکھیں بند کر لیں اور اسے سویا سمجھ کر پہلے کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے کے آدھ کھلے دروازے کی طرف بڑھا، جہاں اشتال اور امینہ سو رہی تھیں۔ کرم دین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کچھ دیر بعد اندر سے کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں، اس سے پہلے کہ کرم دین اٹھتا، وہ سائے دبے پاؤں چھت کی طرف چلے گئے، کرم دین پسینے سے شرابور ہو گیا، وہ ایکدم اٹھا، چپل پہننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

"ایہو جئی کڑیاں نوں زندہ دفنا دینا چاہی دا۔" اسلم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی، وہ تیزی سے اندر کمرے کی طرف بڑھا، الماری سے پستول نکال کر وہ دبے پاؤں سیڑھیوں کے زینے چڑھنے لگا۔

"ابا احمد مال گل کر، اس نوں پہلے جتنے پہ کا لگ......"

"شہر دیاں کڑیاں دا بھروسہ نہیں چنگا۔"

"شیدے کی وہٹی اپنے شہری یار نال بھاگ گئی۔"

"او چاچا، میری مان تو نظر رکھ اپنی نوں

نے اندر جھانکا تھا، ہمیرہ سنگ ہی تو گئی تھی۔
"اس کی کمی تھی کچھ کیا یہ بھی۔"
"کیا ہو بڑا ہی ہو؟" وہ اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ چکا تھا۔
"تمہیں اس سے مطلب؟" وہ موڈ خراب ہونے کی وجہ سے بدلحاظ ہو رہی تھی۔
"مجھے ہی تو سارے مطلب ہیں، یہ سب کچھ جو تم سے جڑا ہوا ہے۔" اس نے آہستگی سے خود کلامی کی۔
"تم میرے ساتھ کچن میں چلو ضیب، میں تمہیں ابھی چائے بنا کر دیتی ہوں اور کچھ کام بھی ہے تم سے، وہیں بات کر لیتے ہیں۔" سوحنا اسے وہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں کیونکہ ہمیرہ، اپنے خراب مزاج کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی بھی کر سکتی تھی۔
"یہ تو بڑا نیکی کا کام کریں گی آپ جگن وڈا، محترمہ کے بگڑے مزاج کا بھی تو ریزن پتا چلے۔" وہ وہیں اٹکا ہوا تھا، سوحنا نے مختصراً صورتحال بتائی۔
"اس میں کیا مسئلہ ہے، وجیہہ سے بات کر لو، ہو سکتا ہے اس کے پاس کوئی اچھا سوٹ ہو یا وہ تمہیں ارجنٹ تیار کر دے۔" بات ہمیرہ کے دل کو لگی تھی، ضیب اور وجیہہ ان کے خالہ زاد تھے، باپ کا سایہ سر پر نہ ہونے کے سبب کم عمری میں ہی مشقت میں پڑ گئے تھے، ضیب بھی پڑھنے کے ساتھ ساتھ جاب کرتا تھا اور وجیہہ باقاعدہ سلائی سیکھ کر اب اجرت پر لوگوں کے کپڑے سیتی تھی بلکہ ایک بوتیک کے لئے بھی کام کرتی تھی، اسے بہت اچھی Designing آتی تھی، نیٹ سے ڈیزائن اتار کر ایسے ایسے لباس تیار کرتی کہ عقل دنگ رہ جاتی کہ یہ اس چھوٹی سی لڑکی کا کمال ہے۔

ہمیرہ بائیک پر ضیب کے ساتھ ان کے گھر آ گئی، خالہ اسے دیکھ کر خوشدلی سے مسکرائیں، وجیہہ بھی خوش ہو گئی۔
"چلو کسی بہانے تم آئیں تو۔" وہ اسے بٹھا کر اپنے تیار کردہ ڈریسز دکھانے لگی، ایک ڈبل شرٹ والا سوٹ دیکھ کر وہ اٹک گئی (اس وقت ڈبل شرٹ کا فیشن تھا) کریم اور فان کلر کے کمبینیشن میں بہت خوبصورت لباس تھا۔
"اس پہ تو بہت لاگت آئی ہو گی؟"
"ارے نہیں، یہی تو کمال ہے۔" وجیہہ ہنس پڑی تھی۔
"یہ کریم والا سوٹ میرا عید والا ہے، اس کے اوپر یہ فان کلر کا کپڑا لا کر میں نے ڈبل شرٹ اور دوپٹہ بنایا تو یہ بالکل الگ لگنے لگا ہے، تم بھی مجھے اپنے سوٹ دکھانا، میں تمہیں بھی اسی طرح کا بنا دوں گی۔"
اس کے ہنر کی داد دینا لازمی تھی، ہمیرہ خوب تعریف کر کے وہ سوٹ لے آئی، میچنگ سینڈل بھی وجیہہ سے ہی لے لی، ایئر رنگز اور جیولری کے لئے ضیب ہی کے ساتھ گئی تھی، اس کے پاس ٹوٹل دو ہزار روپے تھے جن سے مطلوبہ چیزیں کہاں آتیں، ضیب نے ہی باقی رقم ادا کی تھی، باقی کا دن وہ اپنی تیاریوں میں لگی رہی۔
دوسرے دن ساشا نے اسے بلوانے کے لئے گاڑی بھجوا دی تھی، وہ حنظلہ کے ساتھ وہاں گئی تھی، توقع کے مطابق فنکشن بہت شاندار تھا، ساشا اور اس کا منگیتر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے، کھانے کے فوراً بعد وہ اٹھ گئی۔
"ساشا مجھے اجازت دو، امی نے مجھے گیارہ بجے تک کی اجازت دی تھی اور اب ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں، دو فون آ چکے ہیں امی کے۔"
"تھوڑا سا اور تو رک جاتیں۔" ساشا نے اصرار کیا۔
"نہیں اب جانے دو، پلیز ساشا۔"
"اچھا میں دیکھتی ہوں، کون فری ہے۔" اس نے فون پر بات کی۔
"تھینکس گاڈ موسیٰ آ رہا ہے۔"
"موسیٰ، تمہارے بھائی نا؟" ہمیرہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا، ساشا اکثر اپنے بھائی کا ذکر کرتی تھی، جو امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔
"میرا سویٹ برادر موسیٰ۔"
"اور کب آئے وہ؟"
"دو ہی تو دن ہوئے ہیں، وہ آ گیا ہے۔"
وہ سامنے دیکھتے ہوئے بے ساختہ اٹھی تھی، ہمیرہ نے بھی اٹھتے ہوئے گردن گھمائی اور کچھ دیر اسی زاویے پر ساکت رہ گئی تھی، وہ ایسی ہی چھا جانے والی پرسنالٹی کا مالک تھا۔
شاندار سراپے کے ساتھ، یونانی نقوش سے سجا وہ بے حد خوبصورت چہرہ... وہ ساشا کو ہی بہت خوبصورت سمجھتی تھی پر اس کے بھائی نے تو اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا، ساشا نے باہمی تعارف کروایا تو اس نے ہمیرہ کی طرف دیکھ کر سر کو ہلکے سے خم کیا تھا، ہمیرہ نے بھی اسی طرح سر کو جنبش دی اور رخ پھیر لیا، اس بندے کو تو مزید دیکھنے کا مطلب تھا مسمرائز ہو جانا۔
"تم ڈراپ کر دو گے ہمیرہ کو؟"
"آف کورس اور کوئی فری بھی نہیں ہے اور پھر تمہاری فرینڈ کے لئے مجھے ہی آنا چاہیے۔"
"تھینکس مائے برادر۔" ساشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہمیرہ اور حنظلہ، موسیٰ کے پیچھے چلتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے تھے، موسیٰ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا، یہاں تک کہ گھر آ گیا، گاڑی سے اتر کر ہمیرہ نے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ ہلکا سا مسکرایا، ہمیرہ نے گھبرا کر رخ ہی پھیر لیا اور آگے بڑھ کر بیل بجانے لگی، اسے زندگی میں پہلی بار دل ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا، یہ احساسات تو اس کے لئے بھی نہیں ہوئے تھے، بلاشبہ ساشا کا بھائی چھا جانے والی پرسنالٹی کا مالک تھا، اٹھتے بیٹھتے اس کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ اس کے حواسوں پر سوار رہتا تھا، دو دن بعد وہ پھر دکھائی دے گیا، ساشا کو لینے وہی آیا تھا۔
یونیورسٹی سے باہر آتے ہوئے ساشا حیران تھی۔
"حد ہو گئی یار Unbelievable موسیٰ اور میری خاطر اپنے کام چھوڑ کر مجھے لینے آیا ہے۔" اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گئی۔
"خیر تو ہے بھائی، تم میرے ڈرائیور کب سے بن گئے؟" وہ جواب دیئے بغیر مسکراتا رہا، ایک گہری نگاہ ہمیرہ پر ڈالی تھی۔
"چلو تم بھی چلو ہمارے ساتھ، تمہیں بھی ڈراپ کر دیں گے۔"
"نہیں وہ پوائنٹ آ گیا ہے، میں چلتی ہوں۔" وہ جلدی سے ساشا سے مل کر پوائنٹ کی طرف بڑھی تھی کہ موسیٰ کی آواز کان میں پڑی۔
"ہی سو سویٹ تھم۔" اس کا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا، وہ مڑی بھی نہیں، ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ اس نے کچھ سنا ہے، مگر کہنے والے کو بخوبی پتا تھا کہ وہ جسے سنانا چاہتا ہے، سنا چکا ہے، پھر بار بار اس سے سامنا ہوا، ساشا کی شادی کی شاپنگ ساتھ ساتھ چل رہی تھی تو ایک دو دفعہ وہ سوحنا سے اجازت لے کر اسے بھی ساتھ لے گئی تھی، دونوں بار موسیٰ ہی ساتھ تھا، اس کی بولتی آنکھیں، شوخ مسکراہٹ ہر بار اسے پزل کر دیتی تھیں، ابھی دونوں جب ان

کے فائنل سمسٹرز کو ختم ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا، موسیٰ کا رشتہ لے کر ساشا اور اس کے والدین چلے آئے، سونیا اور شہزاد تو حیران رہ گئے تھے، اچھے سے اچھے اونچے لوگوں میں رشتے داری کا تو انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا، ان سے سوچنے کی مہلت بھی یوں مانگی کہ ساشا کی دیکھا تمکنت اور عجیزہ کے ساتھ پھیرا چھوڑنی نے انہیں شش و پنج میں ڈالا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان کی بیٹی بھی اترا تو نہیں، ایک طرف منیب تھا ان کے بہنوئی کا بیٹا، ان کا سگا بھتیجا، جس کے لئے بچپن سے بھائی، بھابھی نے کہا ہوا تھا، فی الحال وہ جاب نہیں تھا لیکن جلد وہ وہ بھی تو لگا ہوا تھا، دوسری طرف موسیٰ تھا الیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والا، بہت ہی پڑھا لکھا، ماڈ، خوبصورت، اسٹیبلشڈ بزنس مین، جس کے رشتے کے لئے آنکھ بند کر کے ہاں کر دینی چاہیے تھی ہر زبان کا پاس بھی کوئی چیز تھی، پھر شہزاد جاندار انسان تھے، انہوں نے سونیا سے ایک بار عجیزہ سے رائے لینے کے لئے کہا تھا، عجیزہ نے بغیر کوئی ٹائم ضائع کیے موسیٰ کے حق میں رضا مندی دی تھی، تو ان کے دل کو کہاں ہی بھا گئی، وہ لوگ ایسے ہی نہیں آئے تھے۔

"تمہارے ابو نے تمہارے بچپن میں تمہارے لئے منیب کو سلیکٹ کر لیا تھا اب وہاں کیا کہیں گے۔"

"میں نے منیب کے لئے کبھی کچھ محسوس نہیں کیا اور اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اتنا ہائی اسٹینڈرڈ کا رشتہ بھیجا ہے جو میرے خوابوں کی تعبیر ہے، تو میں تو اس رشتے سے کبھی انکار نہیں کروں گی، رہا منیب کا مسئلہ تو وہ آپ لوگوں کا مسئلہ ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" اس کے خود غرض لہجے پر سونیا اسے دیکھتی سوچتی رہ گئیں کہ آخر وہ گئی کس پر تھی، ماں باپ کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں کہ بچپن کے منسوب شدہ رشتے کو جواب دے دینے سے ان کے لئے خاندان میں کتنے مسائل پیدا ہو سکتے تھے، اسے بس اپنی خوشیوں سے غرض تھی، منیب کو علم ہوا تو وہ اس کے پاس چلا آیا۔

"تمہیں میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں؟"

"مثلاً کیا خیال ہونا چاہیے؟" اس نے آگے سے سوال کیا، وہ سینے پہ ہاتھ باندھے بہت اطمینان سے کھڑی تھی، منیب کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر افسردگی سے مسکرایا تھا۔

"تم بہت مطمئن دکھائی دے رہی ہو، ہونا بھی چاہیے، لیکن کتنا ہی روپیہ پیسہ کیوں نہ ہو، محبت کی اپنی اہمیت ہے، وہ تمہیں وہاں سے مل پائے گی۔"

"آف کورس، آفٹر آل یہ پروپوزل موسیٰ کی اپنی مرضی سے آیا ہے۔" اس نے بھی چتون سے جتایا۔

"اللہ کرے جو تم سوچ رہی ہو، ویسا ہی ہو۔"

"دعا کا شکریہ۔" وہ آگے بڑھ کر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی تو وہ واپس مڑ گیا، تھکے تھکے قدموں سے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ۔

☆☆☆

شادی توقع کے عین مطابق بہت شاندار ہوئی تھی، بری کی ہر چیز اس کی پسند کے مطابق لی گئی تھی اور کیا اعلیٰ بری آئی تھی، خاندان کے جو لوگ منیب کے رشتے سے منع کر دینے پر باتیں بنا رہے تھے، موسیٰ اور موسیٰ سے متعلق ہر چیز کو دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبانے پہ مجبور ہو گئے تھے، منیب بھی شکستہ دل کے ساتھ تقریب میں شریک ہوا تھا، جسے سدا اپنی دلہن کے روپ میں سوچا، وہ کسی اور

کی دلہن بن بیٹھی تھی اور کیا دلہن بنی تھی کہ چاند کو بھی شرما دیا تھا، دل کی خوشی چہرے کی خوبصورتی کو مزید بڑھا رہی تھی، ان کے ولیمہ والے دن ساشا کی بارات ہوئی تھی، سب بخیر و خوبی ہو گیا تھا، وہ اپنی نئی زندگی میں بہت خوش تھی، اس کی لگژری لائف میں اتنی آسائش زندگی جیسا اس کے خوابوں کا وہ حصہ تھا جو حسین تعبیر کی طرح حقیقت بنا گیا تھا، ہنی مون کے لئے موسیٰ اسے یورپ کے ٹور پہ لے کر گیا تھا، بہت خوشگوار دن تھے، وہ جیسے شکر کی بڑا آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کا پچھلی زندگی کے متعلق سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، اس نے جم اور کلب جوائن کر لئے تھے، اتنی مصروفیت میں اسے امی سے بھی ملنے کا وقت نہیں ملتا تھا، دنوں ہفتوں ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے، وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی، بچے بیسٹرین اسکول میں جانے لگے، کہیں کوئی کمی نہیں تھی، وہ اپنی مصروفیات میں خوش تھی کہ اس دن موسیٰ کے دوست وقاص کی بیوی شائزہ نے جو عجیزہ کی بھی دوست بن چکی تھی اس سے استفسار کیا۔

"تمہیں موسیٰ کے نئے افیئر کا کچھ پتا ہے؟"

"نئے افیئر، تم کیا کہہ رہی ہو، میں سمجھی نہیں۔" اس نے بہت حیرت سے شائزہ کو دیکھا تھا۔

"مجھے پہلے سے ہی لگ رہا تھا کہ تم لاعلم ہو، بہت زبردست افیئر چل رہا ہے موسیٰ کا شاز مین کے ساتھ، وہ اس وقت ٹاپ ماڈل ہے، موسیٰ اس کے فیشن شو میں گیا تھا اور اس کا اسیر ہو کر رہ گیا، اب تو وہ دونوں بہت کلوز ہو چکے ہیں، وقاص بتا رہے تھے، ہوٹل کے ایک ہی بیڈ روم کو شیئر کر رہے ہیں۔"

عجیزہ کو تھوڑا سا شاک لگا تھا، شاک پر شاک، اسے تو کچھ خبر ہی نہیں ہوئی کہ موسیٰ بدل رہا ہے، وہ اور موسیٰ ایک ساتھ ہوتے ہی کتنا تھے کہ اسے علم ہو پاتا، وہ تو بزنس کے لئے شہروں شہروں، ملکوں ملکوں جاتا رہتا تھا۔

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہماری کلاس میں اس طرح کی دوستی چلتی رہتی ہے، پلیز اسے مزید آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔"

"اس طرح کی دوستی، پہلے وہ جس کی شروعات واری تک بڑھ جانے والی دوستی، وہ مزید آگے کیا بڑھے گی۔" وہ سوچتے ہوئے چونکی تھی۔

"یہ تم نے کہا کہ نئے افیئر کے متعلق، کیا موسیٰ کے اس سے پہلے بھی کوئی افیئرز تھے؟" شائزہ یوں مسکرائی جیسے اس نے نہایت بچگانہ بات کر دی ہو۔

"موسیٰ تو ہمیشہ سے ایسی دوستیاں رکھنے کا عادی ہے، صرف تم ہو جسے اس نے بیوی کا درجہ دیا ہے، پتا تھا کہ تم یوں تو نہیں ملنے والی تو شادی ہی سہی۔"

وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی اور وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ سنتی رہی، وہ تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ موسیٰ کو اس سے طوفانی محبت لاحق ہوئی تھی اور وہ آج بھی اس کی محبت میں مبتلا ہے، کبھی اسے روک ٹوک نہیں کی، بچوں کی تربیت کے حوالے سے کوئی باز پرس نہیں، وہ اس سب کو اس کی محبت سمجھتی رہی جو کہ اصل میں اس کی بے پرواہی تھی، اس کے پاس تو شاید اتنی فرصت تھی ہی نہیں کہ وہ اس پر اور بچوں پر کوئی توجہ دیتا۔

☆☆☆

"یہ شاز مین کون ہے اور تمہارے ساتھ اتنی کیوں پائی جاتی ہے؟" اس نے موقع ملتے ہی موسیٰ پر اٹیک کیا تھا۔

"میری دوست ہے اور وہ میرے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے اس لئے وہ میرے ساتھ پائی جاتی ہے۔" اس نے اپنے اطمینان سے سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے جواب دیا تھا کہ وہ کتنی ہی دیر تو بول ہی نہیں پائی تھی۔

"یہ کس قسم کی دوستی ہے جو بغیر کسی جائز تعلق کے......" موسیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں، تمہارا اور میرا تعلق تو جائز ہے نا، یہ سوچ کر خوش رہا کرو، تمہیں سب کچھ مل رہا ہے، اس لئے آرام سے رہو، میرے معاملات میں بولنے سے پرہیز کیا کرو، میں نے اس کی اجازت کسی کو نہیں دی۔"

"تم میرے ساتھ بے وفائی کرتے رہو اور میں چپ کر کے دیکھتی رہوں؟"

"میں ان فلسفوں کو نہیں مانتا، تمہیں تمہارا حق مل جاتا ہے، تمہارے لئے کافی ہونا چاہیے، تم میری بیوی ہو اور آئندہ، بھی میری بیوی کہلانا چاہتی ہو تو خاموشی سے رہو، میں جیسا ہوں، ویسا ہی رہوں گا، تم سوچ لو، میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو بھی اور نہیں رہنا چاہتیں تو بھی، میں تمہارے لئے اپنی دوستی، اپنی مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا نہ ہی آئندہ تم مجھ سے یہ کوشش کر کے پوچھ گچھ کرو گی، رمیمبر دیٹ آل۔" وہ بہت بلندی سے گری تھی، گر کر چکنا چور ہو گئی تھی، وہ تو اس خوش فہمی میں تھی کہ موسیٰ اس کی محبت میں حبشیوں کے نرغے کو بھلا کر اسے بیاہ لایا ہے مگر نہیں، حقیقت یہ تھی کہ اسے ایسی ہی بیوی چاہیے تھی جو اس کی رنگ رلیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے گزارہ کرتی رہے، اس کے پاس اب راستہ بھی کیا تھا، واپسی کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ان آسائشات کو چھوڑ کر جانا آسان تھا نہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر، اب تو ان بچوں کی خاطر اپنی عزت کی

سے شکایت نہیں کر سکتی تھی، وہ تو اللہ تعالیٰ سے بھی شکوہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اس نے صرف دولت مانگی تھی، محبت تو نہیں، دولت تو اسے بے حساب مل گئی تھی بلکہ موسیٰ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے عزت بھی بے پناہ، تو پھر صرف محبت کے لئے کیا رونا، موسیٰ کی بے وفائی کا بھی کیا گلہ، اس کے پاس جو چیز تھی نہیں وہ اسے کیا دیتا، کہیں قریبی مسجد سے اذان کی آواز ابھری تھی، وہ چونکی، اذان تو پانچ وقتوں میں کوئی بھی کیا اس کے کانوں سے کب ٹکرائی تھی۔

صبح فجر کے وقت تو وہ ابھی گہری نیند میں جانے کا آغاز ہوتا تھا، اس کی صبح تو دس بجے ہوتی تھی، پھر تیار ہو کر ناشتہ کرے، کبھی نہیں، کبھی کھانا جانے، میوزک، گپ شپ، پارٹیز میں بھلا کسی اذان سنائی دیتی ہے اور جب اذان ہی نا سنائی دے تو نماز کا سوچنے کا بھی کسی کو خیال کیسے آتا، شادی سے پہلے بھی وہ باقاعدہ، نماز نہیں پڑھتی تھی، مگر یہ حال بھی نہیں تھا کہ سالوں سے نماز ہی نہ پڑھی ہو، کبھی کبھی کی نماز ادا کر کے دعا مانگنے سے اس کے رب نے اسے یوں نوازا تھا کہ اس کی دلی مراد پوری کر دی تھی، اسے ایک امیر اور خوبصورت شوہر عطا کیا تھا تو اب بھی تو وقت تھا کہ وہ اپنے رب سے گڑگڑا کر موسیٰ کے راہ راست پر آ جانے کی دعا کرتی تو اللہ تعالیٰ اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتا، کیا شک تھا کہ وہ دعا کو قبول کرنے والا توبہ سے خوش ہو کر بخش دینے والا پروردگار اسے یہ سکون بھی عطا کر دیتا، خطا کار سہی مگر اللہ تعالیٰ تو بڑے بڑے گناہگاروں کو بخش دینے والا ہے، شرط پکی نیت کی ہے سو وہ ایک بار پورے اخلاص سے اپنے لئے سکون، سچی خوشی مانگنے والی تھی، وہ ایک بار پھر سجدے میں جھک گئی تھی۔

☆☆☆

تحریم محمود

فرمان رسول ﷺ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! میری مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو روک دیتا ہے لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوشش ناکام بنائے دے رہے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں، اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔"

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات

1۔ حضرت خدیجہؓ، یہ رسول اکرم کی سب سے پہلی بیوی ہیں، نکاح کے وقت آپ کی عمر چالیس برس جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس برس تھی۔
2۔ حضرت سودہؓ، یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ہیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام سکران بن عمرو تھا۔
3۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کے وقت آپ کنواری تھیں اور ازواج مطہرات میں سب سے کم عمر بھی آپ ہی تھیں۔
4۔ حضرت حفصہؓ، آپ حضرت عمرؓ کی بیٹی ہیں، آپ بہت سخی اور عبادت گزار خاتون تھیں۔
5۔ حضرت زینب بنت خزیمہؓ آپ بہت سخی اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں، آپ غریبوں کی ماں کے نام سے بھی مشہور تھیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام عبداللہ بن جحشؓ تھا۔
6۔ حضرت ام سلمہؓ آپ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی غریب محتاج کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتیں، آپ کے پہلے شوہر کا نام ابو سلمہؓ تھا۔
7۔ حضرت زینب بنت جحشؓ آپ بہت مالدار خاتون تھیں آپ کا پہلا نکاح حضرت زیدؓ سے ہوا تھا، پردے کا پہلا حکم ان کی شادی پر ہی آیا تھا۔
8۔ حضرت ام حبیبہؓ ہجرت مدینہ میں یہ بھی شامل تھیں اور حبشہ گئی تھیں، حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے نصرانی سے مسلمان ہونے کے بعد آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پیغام دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبول کرنے پر نکاح کا بندوبست بھی خود نجاشی نے کیا۔
9۔ حضرت جویریہؓ یہ ایک لڑائی میں جو (بنی مصطلق کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے) میں قید ہو کر آئی تھیں، حضرت جویریہؓ کے پہلے شوہر کا نام مسافع بن صفوان تھا۔
10۔ حضرت میمونہؓ ان کے پہلے شوہر کا نام خویطب تھا۔

ا۔ حضرت صفیہؓ یہ ایک لڑائی میں قید ہو کر آئی تھیں اور ایک صحابی کے حصے میں دی گئی تھیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مول لے کر آزاد کر دیا اور پھر نکاح فرمایا، یہ حضرت ہارون کی اولاد میں سے تھیں، ان کے پہلے شوہر کا نام کنانہ بن ابی الحقیق تھا، یہ پہلے یہودی تھیں۔

ریحانہ احمد، سکھر

مسکراتی کرنیں

☆ علم کے چراغ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو جوں جوں علم کے قطرے تمہارے جسم میں پہنچیں گے تمہارے دل و دماغ روشن ہو جائیں گے یہی وہ روشنی ہو گی جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچانے کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکی کو علم کی روشنی سے روشن کرو پاکستان کو شمع علم سے جگمگاؤ۔

☆ سب سے اچھا کام وہ ہے جو دوسروں کے لئے کیا جائے۔

☆ علم کو دوسروں تک پہنچانا بھی نیکی ہے۔

☆ جو شخص علم کو پھیلاتا ہے وہ معروف ہوتا ہے۔

☆ جو شخص اخلاق سے محروم ہے وہ اچھا مسلمان نہیں ہے۔

صبا رانا، کوٹ رادھا کشن

عظمت کی باتیں

O احسان کرو خواہ ناشکرے پر کیونکہ وہ میزان میں شکر گزار کے احسان سے بھاری ہے۔ (حضرت علیؓ)

O نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔ (بوعلی سینا)

O کامیابی کا زینہ ناکامیوں کی بہت سی سیڑھیوں سے بنتا ہے۔ (ارسطو)

O اس چھوٹی سی دنیا میں نفرتوں سے بچو اس لئے کہ زندگی کم بلکہ بہت کم ہے۔ (سقراط)

O مصیبت میں آرام کی تلاش مصیبت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ (حضرت امام جعفر صادق)

فریحہ رحیم، خانیوال

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زندگی میں اگر ایک دوست مل گیا تو بہت سے مل گئے تو بہت زیادہ ہیں تین مل ہی نہیں سکتے۔

☆ سچی محبت نایاب ہے اور دوستی اس سے بھی نایاب ہے۔

☆ محبت ایک جادو ہے جو ہر جادو کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

☆ محبت ایک ایسا آئینہ ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔

☆ محبت کا لطف محبت کرنے میں ہے۔

زیبا منصور، رحیم یار خان

صدقہ

اپنے بھائی کو دیکھ کر تو متبسم ہوتا ہے تو یہ صدقہ ہے۔

لوگوں کو نیکی کی طرف بلاؤ اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

کسی بھٹکے کو سیدھا راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔

کانٹا یا پتھر وغیرہ کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

اپنے ڈول میں پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔

نغمانہ حبیب، راولپنڈی

اے دوست تیری دوستی

دوستی کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں دوستی وفا کا نام ہے، کچھ کا خیال ہے دوستی دھوکا، فریب، نفرت کا نام ہے اور کچھ اسے محبت کے ترازو میں تولتے ہیں۔ محبتوں کا گلدستہ اپنی تمام رعنائی اور خوشبو لئے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، دوستی روح کی شاعری ہے، جس کا ایک مصرعہ آپ لکھتے ہیں اور دوسرا آپ کا دوست، دوستی میں وفا کا ہونا بہت ضروری ہے، وفا کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خلوص دل ہی نہیں ربط باہمی کے لئے
وفا بھی شرط ہے اے دوست دوستی کے لئے

اس دنیا کا یہ اصول ہے کہ ہر نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر دوستی جتنی پرانی ہو گی اتنی ہی پائیدار ہو گی، سچا دوست وہی ہوتا ہے جو دوسرے دوست کو اس کی برائیوں سے آگاہ کرتا ہے، دوستی ایک نازک پھول ہے جسے بداعتمادی کی ذرا سی گرمی بھی مرجھا دیتی ہے، ایسا کانچ کا برتن ہے جو ذرا سی ٹھیس سے چور ہو جاتا ہے اس لئے خلوص دوستی کی شرط اول ہے۔

عاصمہ حیدر، قصور

چمن چمن خوشبو

☆ جس دروازے سے شک اندر آتا ہے محبت اور اعتماد اس دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

☆ بیماریوں میں بڑی بیماری دل کی ہے اور دل کی بیماریوں میں بڑی بیماری دل آزاری ہے۔

☆ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

☆ اعتماد ضمانت اور کر سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پہ آ گرو۔

☆ انسان اتنا غلط نہیں جتنی ان کی سوچ اور رویے غلط ہیں۔

☆ بارش جسم کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

☆ ظلم کے تیر چلانے کے بعد دل جوئی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ خود کو نہ دوسروں کو۔

سیراب راشد، وہاڑی

آل عمران

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اقامت دین کا یہ کام ہی تحریک اسلامی کا مقصد وجود اور فرض منصبی ہے یہی رضائے الٰہی کا ذریعہ اور حصول جنت کا ضامن ہے، اس مقصد کی تذکیر مختلف انداز سے، جس کی تفصیل ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، ہر وقت ہوتی رہنی چاہیے۔

سائرہ نعمان، کھاریاں

قیمتی جوہر

☆ ہر رات کے بعد دن ضرور طلوع ہوتا ہے اور جو رات صبر سے گزاری جائے اس کی سحر بہت حسین ہوتی ہے۔

☆ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

☆ بارش جسم کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے نہیں دھو سکتی۔

☆ اعتماد ضمانت اور کر سورج کی گرم شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم ایک بے جان شے کی مانند زمین پر آ گرو۔

☆ زندگی پر چراغ اس وقت تک روشن رکھو جب تک گھر کے سارے افراد واپس نہ آ جائیں۔

☆ اعتماد اس پرندے کا نام ہے جو صبح کا ذب میں ہی روشنی کے احساس سے چہچہانے لگتا ہے۔

صباحت علی، منڈی بہاؤالدین

☆☆☆

میری ڈائری سے

نغمانہ حبیب: کی ڈائری سے ایک غزل

محبت اک ادھورا سا خواب ہے
جو نہ دکھا تو نصیب ہے جو دکھ گیا تو کمال ہے
محبت اک انوکھا سا کھیل ہے
گر پا لیا تو جیت ہوئی جو نہ پا سکے تو زوال ہے
محبت اک ادھوری سی بات ہے
جو نہ کہہ سکے تو سب میں صرف کر جو کہہ دیا تو بول ہے
محبت اک ادھوری برسات ہے
جو جھڑی لگی تو لگی رہی جو رک گئی تو ملال ہے
محبت اک انوکھا سا طلسم ہے
جو طاری ہو تو یوں ہو ہزار بار یہ دھمال ہے

عاصمہ حیدر: کی ڈائری سے ایک نظم

تمہیں جاناں اجازت ہے
کہ ان تاریک راہوں پر
تھکن سی خود میں پاؤ تو
اندھیروں نے کبھی دل ڈوب جائے تو
میرے جلتے ہوئے لمحوں
میرے انگارہ ہاتھوں سے چھڑا کے اپنے ہاتھوں کو
فضا کی خوشگواری سے تم نئے جگنوں کو چن لینا
حسیں پلکوں کی نوکوں پر نئے رنگ خواب بن لینا
کوئی گر پوچھ لے میرا تو اس سے ذکر مت کرنا
میرے جیون کی جلتی سی دوپہر سے بے غرض ہو کر
تم اپنی چاندنی راتوں میں جگنو بانٹتے رہنا
میری تنہائیوں کی وحشتوں کی فکر مت کرنا
تمہیں اب بھی اجازت ہے
میری ہر یاد کو دل سے کھرچنا اور مٹا دینا
کہ جب چاہو بھلا دینا
مگر اتنی گزارش ہے
اگر ایسا نہ ہو جاناں
تو اچھا ہے

مہر حبیب راشد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

اگر ہو ممکن
کبھی جو آؤ
تو میرے کمرے
کی سب کتابیں
الٹ پلٹ کر تلاش کرنا
مری پرانی سی ڈائری میں
ورق ورق پہ لکھا ہے
وہ نام تیرا!
اگر ہو ممکن
تو اس حقیقت کی آگہی
یقین دکھا کر خواہشوں کو
جو میں نے حرفوں میں ڈھال رکھا
لفظوں میں کمال رکھا
تمہیں اجازت ہے
مرے حرفوں کے سب صحیفے
وہ ہجر لمحوں کے نقش سارے
جو لکھ چکا ہوں
جلا کے رکھ دو، یا پھاڑ ڈالو
تمہیں یہ حق ہے
مگر یہ آخری حرف وفا آخر
جو لکھ رہا ہوں
مری نگاہوں کے زرد آنسو
گواہی دیں گے
کہ میں نے کتنی اذیتوں سے
یہ دن گزارے
مگر حقیقت تو یہ ہے جاناں
کہ میری چاہت کو تم بھی بالکل سمجھ نہ پائی

یہی کہوں گا
مری صداقت اسی میں ہے
کہ
مجھے محبت تمہی سے ہے

سائرہ نعمان: کی ڈائری سے ایک غزل

چھوڑ کر تجھ کو گیا وہ بھی کہ جس پہ ناز تھا
کیوں نہیں کہتے ہو اس کو وہ تو اک مہمان تھا
وہ تو شہرت کے حوالے سے تھا عام طاق سا
لوٹنا اس آدمی کو کس قدر آسان تھا
کہتے ہیں کہ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں
جس نے مسلی ہیں یہ کلیاں وہ اک شیطان تھا
کس لئے بھری ہے صحراؤں میں یہ کھائی ہوئی
دھوپ جو دے کر گیا تجھ کو وہ سائبان تھا
دل سے کے گھر کو وہ اشکوں کی بارش دے گیا
جو میرا دل تھا میری آنکھیں تھا میری جان تھا
لے گیا جذبوں کی پونجی وہ تو اک نادان تھا
روح میں خام سکوں کا اک خزانہ آ گیا
سایہ ہے جس کا میرے دل پر وہ اک قرآن تھا

صباحت علی: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

نئے رستوں پہ چلنا چاہتا ہوں
ہوا کا رخ بدلنا چاہتا ہوں
تنہ کر دو مجھ پہ اندھیروں کو مسلط
میں سورج ہوں نکلنا چاہتا ہوں
تجھ سی کے تجربوں کا کیا بھروسہ
میں خود کو تو بدل سکتا نہیں ہوں
میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتا ہوں
بہن رکھا ہے کانٹوں کا لبادہ
مگر پھولوں پہ چلنا چاہتا ہوں
میں ہوں تشنگی لفظوں کا سمندر
خزانوں کو رکھنا چاہتا ہوں

فرح سلیم: کی ڈائری سے ایک نظم

"کو رنج"

یہ سے دل کی ڈوری تھام کر
میں چلی پل صراط پر
مرے ذکر کی پاس اندھیرا ہے
ہر جانب سایہ تیرا ہے
مجھے خبر نہ اور کچھ رہی
آنکھوں میں تھی جھلکیاں درد کی
میری سانس سونی شام ہوئے
آ تو بھی دل کی ڈوری تھام لے
تو بدل دے رنگ جدائیوں کے
آنگن کے لیے
مہک میرے گزار دے

نسرین فیصل: کی ڈائری سے ایک نظم

"اعتبار"

اک اداس کمرے میں
رات کے اندھیرے میں
سوچ کے دریچوں میں
یاد کے جھروکوں میں
اک دیا سا جلتا ہے
سوچتا ہوں کس طرح
اس نے زندگانی کو
دکھ بھری کہانی کو
معتبر بنایا ہے
مختصر بنایا ہے
پھر تمام سوچوں کی
کرچیاں سمٹ کر
فاصلوں میں بٹ گئیں
اس لئے تو کہتا ہوں
پیار سے جو دل میں
تم کا شوق ہے تو پھر
مجھے کسی ضروری ہے
خودکشی ضروری ہے
تنہا سے خوف ہے تو پھر
کبھی کسی کی چاہت پر
اعتبار مت کرنا
اور

عطا مت کرنا

عظمیٰ ساجد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

لفظوں کے نام نشتر
میری رگوں میں
اتار کر
بڑی محبت سے پوچھتا ہے
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟

فریدہ جاوید: کی ڈائری سے ایک نظم

میں زندگی کی اداس رستوں میں الجھ گیا ہوں
میں لمحہ لمحہ بکھر گیا ہوں
میرے لہو میں سمٹے جانے کی اک خواہش
سی اک رہی ہے
جو ایک تمنا سنگ رہی ہے
تمہیں شریک سفر بنالوں
جس میں رہنا کو جانتا ہوں
کہ میری سوچیں جنونوں کے
لہو سمندر میں ڈوبتی ہے
میں سوچتا ہوں
جیسے سہارے
خواب رنگی ہیں
تو میرا کھویا ہوا رفاقتوں کا
بھرم کہیں بھی نہ رکھ سکے گا

عنبرین سجاد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

"کچھی تو ہو"
تنہائی میں جس کی خاطر روئے
وہ حسین یاد تم ہی تو ہو
محفل میں ہنسے جس کی خاطر
وہ خوبصورت بات تم ہی تو ہو
جس کے پیچھے بھاگے عمر بھر
وہ حسین خواب تم ہی تو ہو
جس خواہش کے لیے بھٹکے در بدر
وہ دلفریب تعبیر تم ہی تو ہو
کیا کہوں ظالم تم میرے لیے کیا ہو
میری زندگی، میری ہر خوشی تم ہی تو ہو

عالیہ رحید: کی ڈائری سے ایک غزل

کبھی کبھی بے حساب رہنا
کبھی تو خط کا جواب رہنا
پہلے قربتوں سے نہال کرنا
پھر دوریوں کے عذاب رہنا
کوئی بے رنگی میں ماہتاب ہے
کوئی تو اس کو خطاب رہنا
در لاکھ رنجش جواب بنے
تم نہ رنجشوں سا جواب رہنا
رہا سنگ ہاتھوں میں لے کے آئے
تم تب بھی اس کو گلاب رہنا
جو قربتوں کے امین ٹھہرے
انہیں چاہتوں کے سراب دینا
اتنا آساں نہیں ہے مشکل
بے خواب آنکھوں کو خواب رہنا

صباحت ناصر: کی ڈائری سے ایک غزل

تیری یادیں سنبھال رکھے ہیں
ہم تو یہ بھی کمال رکھے ہیں
ہم بھی اپنے عروج پر رہنا
خود کو ہم لازوال رکھے ہیں
ان کے بارے میں یہ سنا ہے کہ وہ
موڈی جیسی چال رکھے ہیں
سال میں چار دن ہی سہی
رابطہ ان سے بحال رکھے ہیں
آزماؤ تم اپنی نفرت کو
ہم محبت کی ڈھال رکھے ہیں
آج ملنے وہ آئیں گے فرحان
صورت کل پہ ٹال رکھے ہیں

☆☆☆

رابعہ رزاق ---- سیالکوٹ

س: عین غین بھابارل کا دروازہ کس طرف ہوتا ہے؟

ج: آنکھوں کی طرف۔

س: عین غین بھابا سر کتنے بال ہوتے ہیں؟ اگر آپ کے ہیں تو گن کر بتا ئیں؟

ج: جتنے آسمان پر ستارے نظر آتے ہیں اگر آپ کی آنکھیں ہیں تو گن لیں۔

س: عین غین بھابا سنا ہے آپ اپریل میں اپنی سو ویں سالگرہ منا رہے ہیں؟ کیا واقعی؟

ج: یہ آپ کو خواب آیا ہے۔

س: عین غین کیم اپریل کو "ان" سے کیا شرارت کروں؟

ج: "ان" کے سامنے آجاؤ وہ ڈر جائیں گے۔

ریحانہ احمد ----

س: "مدت ہوئی ہے آپ کو پریشان کیے ہوئے" اگلا مصرع آپ بتا دیں تو جانیں؟

ج: اس لیے پھر تنگ کرنے آگئے ہیں ہم۔

س: انو منو جی کل آپ کو انگلیوں پہ کون نچا رہا تھا؟

ج: رانی چور میرے ہاتھ کی انگلیوں پہ آپ کو نچا رہا تھا۔

س: میرے بی اے کے پیپرز سر پر ہیں کوئی جلدی سے ایسا وظیفہ بتا ئیں پیپرز بھی دے دوں اور فیل بھی نہ ہوں؟

ج: محنت کا وظیفہ کرو۔

س: اصول اور فضول میں کیا بنیادی فرق ہے؟

ج: اگر اصول آپ کو اچھا انسان بناتا ہے تو اصول ہے ورنہ فضول ہے۔

صبا رانا ---- کوٹ چھٹہ

س: عقلمندی اور بیوقوفی میں کتنا فاصلہ ہے؟

ج: بہت کم۔

س: جبکی کی ارن بولے بھیجی کی راہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: نیک خیال ہے۔

زبیدہ نجم ---- خانیوال

س: مائیکل جیکسن کی روح بے چارہ کل تو لنڈے بازار کی طرف کیوں جا رہا تھا؟

ج: مائیکل جیکسن مر گیا؟ اچھا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔

س: ہائے ٹونی ناراض تو مت ہو بات سنو نہ جانے کیوں تم بڑے اپنے اپنے سے لگتے ہو؟

ج: کتنا کرٹونی کا خلام نے تلخی سے مجھے بھیج رہا ہے ایسے یہ ٹونی کہیں اپنا کیوں لگتا ہے کہیں تم بھی تو......؟

س: من رے بلوری آنکھوں والیا...... بھلا کیا؟

ج: آگے پورا گانا سن لو۔

س: میرا شعور بہلتا نہیں ہے لفظوں سے؟

ج: خانیوال بہت دور ہے کیا کروں۔

زیبا منصور ---- رحیم یار خان

س: صرف ایک بات پوچھنی تھی اگر مجت پہ ٹیکس لگ جائے تو؟

ج: گرلز کالجوں کے دروازے سے رش ختم ہو جائے گا۔

لبنانہ حبیب ---- راولپنڈی

س: مسٹر عبداللہ ایک مدت بعد اس محفل میں حاضر ہوں کیا سما چار ہیں کیسے رہے اتنا عرصہ کیا کبھی ہماری یاد آئی؟

ج: دوبارہ خوش آمدید، سماچار سننے ہیں تو ٹی وی لگاؤ۔

س: تمہاری سوال سے سوال کرنے کی عادت نہ گئی پچھلی بار آمنہ کاظمی نے پوچھا دنیا تمہیں اس موڑ پہ لے آئے کی تمہارا جواب تھا کس موڑ پہ جواب دیا کرو سوال نہ کیا کرو؟

ج: یہ تم آمنہ کاظمی کی طرف سے کیوں پوچھ رہے ہو کہیں......؟

س: میری روح کی دھرتی پر ہی دکھوں کی فصل کیوں اگی ہے؟

ج: دھرتی پہ جس کا بیج بوؤ گے وہی فصل اگے گی۔

س: اجاڑنے والے بھی کیوں اکثر بھول جاتے ہیں؟

ج: اگر بھولیں نہ تو ان کا جینا حرام ہو جائے۔

عاصمہ حیدر ---- قصور

س: جلو مسٹر میں تین تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے کیوں نہیں؟

ج: ایک ہاتھ سے بھی بج سکتی ہے ذرا ہاتھ زور سے اپنے منہ پہ تو مارو۔

س: اے مسٹر دوست یہ کب کہتی ہے "انگلیاں دے دکھاؤ گھر سے"؟

ج: جب کوئی تم جیسا ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی کوشش کرتا ہے۔

س: ارے یہ دل والے جانی ناراض ہو گئے ہو ہوں تمہیں کس سے خیر میں پوچھوں؟

ج: میں نے ناراض کیوں ہونا ہے تالی تو تم نے بجائی ہے۔

سحرب واجد ---- بہاولنگر

س: میں کبھی یہ قربانی کے جانور کو تو اس لئے سجایا جاتا ہے کہ اس کا آخری وقت قریب ہوتا ہے مگر دلہن کو اس طرح سجانا کیا ظاہر کرتا ہے؟

ج: کہ دولہے کا وقت قریب ہے۔

س: میں بھی مجھ جی میری ساس مجھے اس واسطے اپنا بیٹا نہیں بخشتیں کیونکہ پھر میں ان کی بیٹی کا بھائی لگوں گا پلیز اس کا کوئی حل بتائیے؟

ج: تم بھی اپنی ساس کو ہاں نہ کہنا ورنہ ان کی بیٹی تمہاری بہن لگے گی۔

س: لگتا ہے بڑھاپے نے آپ کے جواب دینے کی سکت پر قبضہ جمالیا ہے اگر ایسا ہے تو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم مر گئے ہیں کیا؟

ج: اسی کی تو فکر ہے۔

س: کہتے ہیں کہ کسی کو ذلیل کرنا ہو تو اسے الیکشن میں کھڑا کر دیں یا پھر پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا دیں، ان دونوں میں سے آپ کون سی سیٹ لینا پسند کریں گے؟ (صرف اچھا بات کرلی ہے)

ج: میں تو کرکٹ ٹیم کا کپتان بننا پسند کروں گا کیونکہ الیکشن میں کھڑے ہو کر جو تمہارے ساتھ ہوا ہے اس کے بعد تو میری توبہ۔

سائرہ نعمان ---- کھاریاں

س: میں بھی جی آداب عرض؟

ج: تسلیم۔

س: محبت میں دل ہی کی چلتی ہے دماغ کیوں نہیں؟

ج: اگر دماغ کی چلتی ہوتی تو تم ایسے سوال نہ کرتے۔

☆☆☆

شہر

ایک دیہاتی شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

"چلو یار شہر کی سیر کر کے آتے ہیں؟"

دوسرا شخص بولا۔

"نہیں میں ایک بار شہر گیا تھا لیکن اب دوبارہ نہیں جاؤں گا۔"

پہلا شخص بولا۔

"کیوں بھلا ایسی کیا بات ہو گئی؟"

دوسرا شخص بولا۔

"شہر میں جگہ جگہ جو ہدایات لکھی ہوتی ہیں ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے پچھلی بار میں شہر گیا تو ایک جگہ تحریر تھا "یہاں مت تھوکئے" مجھے مجبوراً وہاں تھوکنا پڑا آگے بڑھا تو لکھا ہوا تھا "ردی کاغذ اس میں ڈالئے" میں نے سڑک سے ردی کاغذ اٹھا کر ڈال دیئے "ایک اور جگہ لکھا ہوا تھا "رفتار حالیس میل فی گھنٹہ" اب تم ہی بتاؤ مجھ جیسا بوڑھا آدمی اتنا تیز کیسے دوڑ سکتا ہے مرتا کیا نہ کرتا میں نے دوڑ لگا دی اور پھر شہر جانے سے توبہ کرلی۔"

فرح سلیم — علی پور

بہت ہے

خطا تو ہو گئی پر آپ نے بھی

ذرا سی بات پہ ڈالا بہت ہے

کا شکوہ ہے تو مت ڈالو

مجھے تو ایک ہی چانٹا بہت ہے

نسرین فیصل — جہلم

چلو اب مسکراؤ

ایک کاہل شخص کے مکان میں آگ لگ گئی، لوگ بجھانے دوڑے لیکن وہ مزے سے بیٹھا رہا، اس پر ایک شخص نے کہا۔

"تعجب ہے تمہارے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہو۔"

کاہل آدمی نے اطمینان سے کہا۔

"آرام سے کہاں بیٹھا ہوں بارش کے لئے دعا کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

ڈاکٹر۔

"آپ اچھے ہو جائیں گے لیکن مجمع میں جانے سے پرہیز کیجئے۔"

مریض۔

"لیکن میں اپنے پیشے سے مجبور ہوں۔"

ڈاکٹر۔

"پیشہ کیا ہے؟"

مریض۔

"جیب تراشی۔"

☆☆☆

استاد کلاس کو بجلی کے بارے میں پڑھا رہا تھا۔

"فرض کرو کہ میں پنکھے کا بٹن آن کروں اور پنکھا نہ چلے تو اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ کہ آپ نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا۔"

شاگرد نے معصومیت سے جواب دیا۔

عظمیٰ ساجد — گوجرانوالہ

ہنسنا منع ہے

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا۔ دوسرے نے پوچھا۔
"ارے بھئی آج گدھے کو کس خوشی میں نہلا رہے ہو؟"
پہلے آدمی نے کہا۔
"آج گدھے کی شادی ہے۔"
دوسرے شخص نے کہا۔
"ہمیں اس خوشی میں کیا کھلاؤ گے؟"
پہلا شخص بولا۔
"جو دولہا کھائے گا وہی تم کھا لینا۔"

فریدہ عابد، ملتان

رنگِ حنا

جہاں رات اندھیری ہے
سکھیاں بھی سہری ہیں
بس اک تیری ہے

تو اک ایسا نمبرا ہے
میرے دل میں ٹھہرا ہے
اعتبار بھی بس تیرا ہے

سدرہ سجاد، سکھر

ہنی مون

شادی کے بعد میاں بیوی ایک صحت افزا، پہاڑی مقام پر ہنی مون پر گئے تو ہوٹل کے منیجر نے نام پوچھے بغیر اندراج کر لیا یہ دیکھ کر بیوی حیران رہ گئی اور کہنے لگی۔
"منیجر صاحب! آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہے؟"
منیجر صاحب بولے۔
"آپ کے شوہر ہر سال ہمارے ہوٹل میں ہنی مون مناتے ہیں۔"

عالیہ وحید، فیصل آباد

بہت خوب

بیوی بہت تیزی سے گاڑی چلا رہی تھی، شوہر نے اس سے کہا۔
"تم تیزی سے گاڑی کو موڑتی ہو تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"
بیوی نے چیختے ہوئے کہا۔
"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے تم بھی موڑ پر میری طرح آنکھیں بند کر لیا کرو۔"

صباحت ناصر، سرگودھا

دور اندیشی

ایک صاحب اپنے دوست کے سامنے اپنی بیگم کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔
"کبھی کبھی اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر کی منزل سے نیچے پھینک دوں، مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"
"کیوں؟"
دوست نے کہا۔
"یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔"
"نہیں۔"
ان صاحب نے چڑ کر کہا۔
"سوچتا ہوں اگر وہ بچ گئی تو میرا کیا ہوگا؟"

عفت آفتاب، جھنگ

یقین

اگر آپ کے ریڈیو کی باریک سی سوئی رات کی تاریکی میں ہزاروں میل دور کی آواز آپ تک پہنچا سکتی ہے اور اگر سارنگی کے چھٹے سر سمندروں، پہاڑوں، صحراؤں، دریاؤں اور پرشور شہروں سے پرے پہنچ سکتے ہیں تو پھر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ خدا بھی تو آپ کی دعا سن سکتا ہے۔

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

اجازت

جانے کون اوٹ سا کس میں
کتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں
دروازے کا اک پٹ کھولے
ناول پڑھتے یوں بیٹھی ہو
جیسے گھر میں تم تنہا ہو
کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

ریحانہ احمد، سکھر

اقتباس

صبح ناشتے میں نقصانات، دوپہر کھانے میں نقصانات، اونگھنے میں نقصانات، جھگڑنے میں نقصانات، او ہو کیا تمہارے ملک میں اس مضمون سے زیادہ دلچسپی لی جا رہی ہے، افسانوں سے لے کر کورٹ تک نقصانات گھسی ہوئی ہے، کورکن کھودنے کھودتے سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ آخر عورتوں نے اس پیشے کو کیوں نہیں اپنایا، سمجھ میں نہیں آتا تو قبر ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی کی راہ لیتا ہے، یونیورسٹی ہال یونیورسٹی اور وہاں سے فرائڈ فرائڈ کا نعرہ لگاتا ہوا واپس آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے گورکنی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

صبا راؤ، کوٹ جنڈ

چاند

اپنی روشنی پورے آسمان پر
پھیلا دیتا ہے
لیکن
دل کے داغ
صرف
اپنے سینے تک محدود
رکھتا ہے

یہ جذبے

سرکش ہیں، باغی ہیں
توڑ دیں گے دیوار بیار سے کی
کہ
دل کے جذبے ہار ماننے نہیں
اور عقل کا فلسفہ
شکستہ پیچھے کہیں رہ جاتا ہے

نرجس رحیم، خانیوال

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں

☆ وقت کو پیچھے سے مت پکڑو، اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔
☆ وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔ (امام غزالی)
☆ وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کیے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا، اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور بیکار چھوڑ دی جائے تو اس میں خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔ (افلاطون)
☆ وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ (ورسٹو)
☆ وقت روئی کے گالوں کی مانند عقل و حکمت کے چرخے میں کات کر اس کے مجبتی پارچہ جات بنا لو ورنہ جہالت کی آندھیاں اسے اڑا کر دور پھینک دیں گی۔ (فیثا غورث)
☆ وقت دولت کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں، یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ (فرینکلن)
☆ آپ مسرور ہوں یا مغموم، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔ (نپولین بونا پارٹ)

زیبا منصور، رحیم یار خان

☆☆☆

اب تو دنیا نے کبھے کی شکایت کی تھی
میں بھولوں کا بھی نے اک انساں کے عوض
اک بے جان ستارے سے محبت کی تھی

....

میرے قلم سے لکھی گئیں
نہ میری زبان سے ادا ہوئی ہیں
مری نظر سے کہنے کی بات تھی
کسی حرف میں نہ سمائی گئی

....

کوئی پھول چنتا ہے کس طرح
کوئی ڈھول ہوتا ہے کس طرح
تجھے تو وقت کی بات ہے
زندگی ہی بتائے گی
فرح سلیم

علی پور
آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر کہتا ہے مجھے میرا چاہنے والا اکثر
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

....

حاصل زندگی عشق وہ ایک لمحہ ہے
عمر بھر جو کبھی حاصل نہیں ہونے پاتا

....

نہ اعتماد خدا ہے نہ اعتماد خودی
کھلا ہوا ہے عجب زہر سا فضاؤں میں
یہ کیا ستم ہے کہ اک شہر میں رہتے ہوئے
تم کبھی ہم سے نہ ہم دکھائی دیں
نسرین اقبال
جہلم

دشت میں پھول اگے دھوپ میں جاگی ٹھنڈک
وحشت احساس میں پھیلا تیری یادوں کا گلال

....

دل داغ داغ ہے تو بہاروں کا کیا قصور
دھوکا فصل رنگ پہ خود ہو گیا ہمیں

....

یہ اجالوں کا بستی اڑے گا

وقت سے پہلے چراغ اپنے بجھائے ہم نے
لبنیٰ ساجد
گوجرانوالہ

خوابوں کے جزیروں میں اتر آتے ہیں اکثر
وہ لوگ کہ اب جن سے ملاقات بھی کم ہے

....

دل کے اس شہر سے میں لاکھ خوشی سے چلوں
بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح

....

یہ اور بات مجھے تھک کے وہ سویا ہے
جو تم کو تمہیں رتجگے بھی دے گا
فریحہ عابد

ملتان
بس ایک تیرے بچھڑنے کی دیر تھی
سمت کے آگیا آنکھوں میں کرب صدیوں کا

....

دکھوں کی دشت کا وہ پھیلا ہے کرب سوچوں میں
کہ سکھ رتوں میں بھی یہ دل اداس رہتا ہے

....

ہے اک عمر سے جاری یہ رتجگوں کا سفر
جادوی آنکھوں میں نیندوں کا ذائقہ ٹھہر گیا
سدرہ سجاد
سکھر

اے دوست میرے ظرف محبت کی داد دے
ہے دل کی چوٹ لب پہ تبسم بنی ہوئی

....

ہے کار چاہتوں کے تقدس میں وہ مجھے
کچھ نہ ملا تو درد تنہائی دے گیا
جتنا ہے ٹھوکروں نے سنبھلنے کا حوصلہ
ہر حادثہ خیال کو گہرائی دے گیا

....

جانے کیا بات تھی اس دور کوئی دو نہ کہا
عمر مسافر تھا اور ایسا کہ ٹھکانہ ہی نہ ہے
عالیہ وحید

گوجرانوالہ
اپنی جاہت میں خود کو کئی خط لکھے
ان کو کھولا پڑھا نہ کیا رکھ دیا
☆☆☆

حنا کا دستر خوان

فوزیہ طارق

پیچ نو پڈنگ سلاد

اشیاء
- آڑو: دو عدد گول
- اسٹیل جام: ایک کھانے کا چمچہ
- مکس ڈرائی فروٹ: نصف کپ
- کریم: ایک کھانے کا چمچہ
- چینی: پانچ کھانے کے چمچ
- پنیر: ڈیڑھ کپ

ترکیب

آڑو کے چار ٹکڑے کر لیں، ایک دیگچی لیں اس میں چار بڑے چمچ چینی اور چار بڑے چمچ پانی ڈال کر چولہے پر رکھ کر ایک ابال دلا لیں، اس کے بعد اس میں آڑو ڈال کر پکا لیں، احتیاط سے کہ آڑو ٹوٹنے نہ پائیں، جب چینی کا پانی خشک ہو جائے تو دیگچی چولہے سے نیچے اتار لیں۔

ایک پیالی لیں اس میں کریم ایک چمچ چینی، پنیر اور جام ڈال کر ساتھ ہی ڈرائی فروٹ بھی ڈال دیں پھر ان سب کو آپس میں مکس کر لیں، آڑو ٹھنڈے ہو جائیں تو انہیں ایک باؤل میں رکھ کر اس میں کریم اور پنیر کا آمیزہ اس طرح بھریں کہ وہ چوٹی کی طرح ہو جائے، لذیذ پیچ نو پڈنگ تیار ہے۔

مزے دار سلاد

اشیاء
- کاہو (سلاد کا پتا): ایک پھول
- شملہ مرچ: ایک عدد
- ٹماٹر: تین عدد
- پنیر: آدھا پاؤ
- گوشت کے ٹکڑے: ایک پاؤ
- تل: تین کھانے کے چمچ
- سیب کا جوس: تین کھانے کے چمچ
- نمک: نصف کھانے کا چمچ
- کالی مرچ پسی ہوئی: ایک چائے کا چمچ
- چینی: ایک چائے کا چمچ

ترکیب

کاہو کے پھول سے پتوں کو علیحدہ کر کے ان کو اچھی طرح صاف کر کے ایک طرف رکھ لیں، ان پتوں کو ایسے برتن میں ڈال کر رکھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں تا کہ ان پر لگا ہوا پانی بھی نیچے گر جائے اور پتیاں بالکل خشک ہو جائیں۔

شملہ مرچ کا تمام گودا اور بیج اس میں سے نکال لیں اور اس طرح باقی صرف خول رہ جائے گا، پھر اس خول کی لمبائی کے رخ ٹکڑے کر لیں اور اس طرح کہ ایک ٹماٹر کے آٹھ ٹکڑے بن جائیں، پنیر اور ابلے ہوئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں اور سلاد کے پتے کاٹ لیں پھر سلاد کے پتے، ٹماٹر، پنیر، گوشت، ہری مرچ کے ٹکڑے ایک بڑے پیالے میں ڈال لیں، اس کے بعد ان چیزوں میں تل، سیب کا جوس، نمک، کالی مرچ، چینی ڈال دیں ان تمام کو اچھی طرح ملا دیں، سلاد تیار ہے، یہ سلاد چار افراد کے لیے کافی ہے۔

دالیں و سبزیوں کا سلاد

اشیاء

دہی	آدھا کلو
آلو ابلے ہوئے	تین عدد
پیاز باریک کتری کٹی ہوئی	ایک پیالی
کھیرا	دو عدد
نمک کالی مرچ پسی ہوئی	حسب ذائقہ
مرغی ابلی ہوئی	چند ٹکڑے

ترکیب

مرغی کے باریک ٹکڑے کر لیں۔ ابلے ہوئے آلو کش کر لیں۔ ایک عدد کھیرا کش کر لیں دوسرے کھیرے کے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ایک کھلے منہ کے پیالے میں دہی ڈال کر پھینٹ لیں دہی میں آلو اور کٹی ہوئی پیاز ڈال کر پھینٹیں، ساتھ نمک اور کالی مرچ شامل کر دیں، دہی میں مرغی کے ٹکڑے اور کش کیا ہوا کھیرا ڈال کر یکجا کر لیں۔ ڈش میں دہی کا آمیزہ ڈالیں۔ دہی کے آمیزے پر کٹا ہوا کھیرا رکھ دیں۔ عمدہ، رنگین اور لذت سے بھرپور سلاد تیار ہے، تناول فرمائیں۔

پوٹیٹو سلاد جرمن

اشیاء

آلو	چھ عدد
ٹماٹر سلائس کیا ہوا	ایک عدد
آٹا	چار بڑے چمچ
پانی	ایک چوتھائی کپ
[illegible]	ایک پاؤ
سرکہ	آدھا کپ
تازہ دھنیا کے پتے	ایک بڑا چمچ
نمک	آدھا چائے کا چمچ
سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچ
کھیرا سلائس کیا ہوا	ایک عدد
پیاز سلائس کیا ہوا	ایک عدد
لیموں اور پودینہ کے پتے	سجاوٹ کے لیے
شکر	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب

سب سے پہلے آلوؤں کو ابال لیں اور ٹھنڈا ہونے کے بعد انہیں چھیل لیں۔ اس کے بعد انہیں باریک سلائس کی شکل میں کاٹ کر ایک بڑے پیالے میں ڈال دیں اور پھر اس میں شکر اور آٹا شامل کر لیں، اس کے بعد اس میں نمک اور سیاہ مرچ بھی ڈال دیں اور پھر بتدریج اس میں سرکہ اور پانی بھی ڈالتے جائیں اور چمچ چلاتے جائیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو اس آمیزے کو آلو والے پیالے میں انڈیل دیں، کھیرا، ٹماٹر، لیموں اور پودینہ کے پتے سے سجا کر پیش کریں یہ بہت ہی عمدہ اور ذائقے سے بھرپور صحت بخش سلاد تیار ہے۔

بارلے اور چکن سلاد

اشیاء

بارلے (جو)	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچ
چکن ٹکڑے	آدھا کلو گرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
سلاد کے پتے	چند عدد
پانی	حسب ضرورت
ادرک پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
سیسیم آئل	سات ملی لیٹر

ترکیب

مرغی کے ٹکڑے اور بارلے (جو) پانی میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکایا جائے اور جب تھوڑا سا پانی رہ جائے تو اسے چھان لیں اور گوشت کے ٹکڑے نکال کر پلیٹ میں رکھ لیں۔ اس کے بعد اسے اس پانی میں پکا لیں جو پھینک دیں اور پھر اس میں ادرک اور پیاز ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں، کچھ دیر بعد اسے اتار لیں اور گوشت کے ٹکڑوں کو پلیٹ میں ڈال کر پسی ہوئی سیاہ مرچ اور نمک چھڑک دیں، پھر اس کے اوپر سرکہ ڈال دیں، اس کے بعد اس پر سیسیم آئل چھڑک دیں اور خوب اچھی طرح سے ہلائیں اور پھر اس پر سلاد کے پتے ڈال کر نان کے ساتھ تناول فرمائیں۔ بہت ہی مزے دار اور پر لطف سلاد تیار ہے۔

ریڈ بین سلاد

اشیاء

ریڈ بین فلنگ کے لیے	چودہ گرام
ریڈ بین سرخ پھلیاں	پانچ گرام
پیاز چھلے دار کاٹیں	چند عدد
سوڈا واٹر	تین سو ملی لیٹر
سلاد کے پتے	چند عدد
وائٹ گرینولیٹڈ شوگر	چھ گرام
ادرک کٹا ہوا	دس گرام
مونگ پھلی کا تیل	ڈیڑھ لیٹر
سرکہ	چالیس لیٹر
سیسیم آئل	دس ملی لیٹر
چٹنی	بیس گرام
سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے ریڈ بینز یعنی سرخ پھلیوں کو دھو کر صاف کر لیں اور پھر ان کو ایک گہرے برتن میں ڈال دیں۔ پھر اس قدر پانی ڈالیں کہ اس سے پھلیاں اچھی طرح سے ڈھک جائیں۔ ہلکی آنچ پر ابال لیں اور صرف اس قدر ابالیں کہ پھلیاں نرم ہو جانی چاہئیں، سوڈا ڈالنے سے پھلیاں جلد اور کافی نرم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد پھلیوں کو پھر نکال کر ان کا پیسٹ بنا لیں اور پھر اس پیسٹ کو کپڑے کی تھیلی میں ڈال دیں، پھر اسے بند کر کے زور سے دبائیں اور اس میں موجود تمام سوڈا نکال دیں۔

پھر مونگ پھلی کے تیل کو ایک ساس پین میں گرم کر لیں اور جب تیل اچھی طرح سے گرم ہو جائے تو پھر اس میں بین پیسٹ ڈال کر فرائی کر لیں، یہاں تک کہ پیسٹ خشک ہو جائے اور لیس دار بھی ہو جائے۔ اس کے بعد تیز چھری سے اس کے ٹکڑے کر لیں اور اس پر سلاد کے پتے ڈال دیں، اس کے بعد سرکہ اور چینی ایک پیالے میں ڈال کر اسے اچھی طرح سے مکس کر کے چٹنی سی بنائی جائے اور پھر چھلے دار کٹا ہوا پیاز پیسٹ کے ٹکڑوں پر پھیلا دیا جائے۔ اس کے بعد اس پر سرکے والی چٹنی ڈال دی جائے اور اس پر کٹا ہوا ادرک اور سیسیم آئل ڈال دیں۔ اس کے بعد نان اور روسٹ گوشت کے ساتھ پیش کریں یہ سلاد کی عمدہ رنگین اور لذت سے بھرپور ڈش تناول فرمائیں۔

کبابی مٹن

اشیاء

مٹن	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پسی ہوئی پیاز	نصف کپ
پسی ادرک	ایک چائے کا چمچ
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

تیل کے علاوہ تمام اشیاء کو مٹن میں ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ چھوڑیں پھر اسے ابال لیں، جب گوشت گل جائے تو گرم تیل میں مٹن تل لیں۔ جب سنہری ہو جائے تو نان کے ساتھ پیش کریں۔

منفرد چنے حلوہ پوری اور آلو

اشیاء

چنے کے لیے

سفید چنے رات کو بھگو دیں	آدھا کلو
پیاز درمیانی	دو عدد
ٹماٹر باریک کاٹ لیں	دو سے تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
ادرک لہسن پیسٹ	ڈیڑھ چائے کا چمچ
سفید زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت
سبز الائچی	چھ عدد
خشخاش	تین کھانے کے چمچ
بادام بھگو لیں	دس عدد
گرم مصالحہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
دال مسور بھگو دیں	تین کھانے کے چمچ
ہرا دھنیا، ہری مرچیں	حسب ضرورت

ترکیب

چنے کو ابال لیں، بادام کو کاٹ کر ابال کر چھیل لیں، دیگچی میں تیل گرم کریں الائچی ڈال کر کڑکڑا لیں اب اس میں پیاز ڈال کر بھونیں، جب پیاز اچھی طرح بھن جائے تو اس میں ادرک، لہسن پیسٹ اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں، جب بھن جائے تو نمک لال مرچ، زیرہ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر ڈالیں اور ایک منٹ تک بھونیں، جب بھن جائے تو بادام چھیل کر ثابت ہی ڈال دیں، ساتھ دال، خشخاش اور دو کپ پانی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں، جب دال گل کر مصالحے کی طرح بن جائے اور تیل اوپر آ جائے تو گرم مصالحہ پاؤڈر، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال دیں اور سرو کریں، نہایت مزے دار چنے تیار ہیں۔

حلوے کے لیے:۔

سوجی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
کھویا	آدھا کپ
ناریل پسا ہوا	آدھا کپ
پستہ کٹا ہوا	دو کھانے کے چمچ
پانی	دو کپ
کیوڑا	چند قطرے
چاندی کے ورق	حسب ضرورت
انڈے	دو عدد

ترکیب

پانی میں چینی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ شیرہ تیار ہو جائے دوسرے پین میں گھی گرم کریں اور سوجی کی رنگت گولڈن ہونے تک فرائی کریں، جب سوجی گولڈن ہو جائے تو شیرہ ڈال کر پکائیں، ایک الگ پین میں انڈے پھینٹ کر فرائی کریں، جب شیرہ خشک ہو جائے تو کھویا، ناریل اور فرائی انڈے ڈال دیں اور بھونیں، جب بھن کر گھی الگ ہو جائے اور حلوہ چکنا چھوڑنے لگے تو پستے اور کیوڑہ ڈال دیں اور اتار لیں، سرونگ ڈش میں نکالیں اور چاندی کے ورق لگائیں۔

فوزیہ خلیل

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

مارچ آیا، رت بدلی، درختوں پر چمکتے نئے سر سبز پتے، خوش رنگ پھول، بہار کی نوید سنا رہے ہیں، فطرت ازل سے اپنا یہ عمل جاری و ساری رکھے ہوئے ہے، موسم بدلتے رہتے ہیں، ہر دن کے بعد رات اور ہر رات کے بعد نیا سورج طلوع ہوتا ہے، لیکن اگر نہیں بدلتے تو وہ حالات ہیں۔

مہذب و متمدن کے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود وحشت و بربریت کا سلسلہ جاری ہے، سائنس اور مادی ترقی کی انتہا کو چھوتی ہوئی اس دنیا میں اگر آج سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے تو وہ انسان ہے، خود کو سپر پاور کہلانے والوں نے عراق، افغانستان، لیبیا میں شاطرانہ چالوں سے اس کو تباہی کے کنارے پہنچا کر اب اپنی نگاہیں شام پر گاڑ رکھی ہیں، دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ابھی تک اپنے وجود کا تشخص اور تعین ہی نہیں کر پا رہے، پاکستان جو ہماری پناہ گاہ ہے، ہمارا وطن ہماری جنت ہے، اسے کرپشن لوٹ مار، کھاؤ اور کھانے دو کی پالیسی اپنا کر دن بدن کمزور کرتے چلے جا رہے ہیں۔

دنیا ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے اور ہم ابھی تک اپنے تعصبات سے ہی باہر نہیں نکل پا رہے، موجودہ حکمرانوں کو ملک کی باگ ڈور سنبھالے بھی ڈھائی سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن کوئی مثبت پیش رفت تو کیا ہوتی، حالات مزید ابتری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، پتا نہیں اہل اقتدار کو اس صورت حال کا کب اندازہ ہوگا، کہتے ہیں کہ انتہا کو پہنچ جانے کے بعد تبدیلی آتی ہے، اس وقت ہم جن بدترین حالات سے گزر رہے ہیں، کیا ممکن ہے کہ عنقریب کوئی ایسی تبدیلی آئے جو ہماری زندگیوں کو سہل بنا دے؟

آیئے درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو کر دعا کریں۔

کہ اللہ پاک ہمارے وطن کو مشکلات سے نکال کر اس کو ایمان دار، نیک اور صالح قیادت عطا کرے جو صرف اور صرف پاکستان کے لیے سوچے اس کے لیے مخلص ہو اور اس کی فلاح کے لیے خود کو وقف کرے آمین یا رب العالمین۔

آیئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں، سب پہلا خط ہمیں میانی چنیوٹ سے حمیرا ادریس کا موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

فروری کا شمارہ ساحر کی ہی مہکی سرورق سے مزین ملا حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہو کر آگے بڑھے اور انشاء نامہ "دنیا گول ہے" سے رکاوٹ تک "پڑھ کر لطف اندوز ہوئے اس مرتبہ سندس جبیں نے ایک دن حنا کے ساتھ گزارا، خاصی خوب پسند آئی گفتگو، پھر آگے بڑھے اور اس تحریر کی طرف بڑھے، جو آج کل ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگی ہے جی ہم

بات کر رہے ہیں ام مریم کی تحریر "دل گزیدہ" کی، کمال کی لفاظی بہترین ڈائیلاگ ڈلیوری اور دلکش منظروں سے سجی اس تحریر کی تیسری قسط انتہائی شاندار تھی، بہت خوب ام مریم آپ کی تحریر کے سحر نے ایک مرتبہ پھر ہمیں جکڑنا شروع کر دیا ہے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، ام مریم کے بعد جس مصنفہ کی تحریر نے اپنی طرف بے ساختہ متوجہ کیا وہ تھا صوفیہ جبیں کا مکمل ناول "طواف محبت" تحریر کا عنوان بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرنے والا تھا جبکہ ناول کی کہانی بھی اچھی تھی بس ایک چیز جو کہ ناگوار گزری وہ تحریر میں انگلش کا بے جا استعمال تھا، نہ جانے مصنفین کو یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ ہم اگر انگریزی زبان کا استعمال نہیں کریں گے، تو ہماری تحریر ادھوری لگے گی، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، اچھا بھلا روانی میں پڑھتے پڑھتے انگلش کا فقرہ ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے بریانی کھاتے کھاتے منہ میں کنکر آ جائے۔

نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول "پربت کے اس پار کہیں" بھی اب دلچسپ ہوتا جا رہا ہے جبکہ سعدیہ [illegible] کے ناول نے تو روز اول سے ہمیں اپنے لفظوں میں قید کر رکھا ہے، بلاشبہ اس ناول کا شمار سعدیہ [illegible] کی بہترین تحریروں میں ہوگا، ام ایمان کا مکمل "زندگی تیرے دم سے" پسند آیا، ارے واہ جی واہ افسانوں میں ہماری پیاری راج دلاری، عالی ناز صاحبہ تشریف لائیں ایک عرصے بعد اپنے مخصوص رنگ میں، بہت خوب افسانہ پڑھ کر مزہ آ گیا، عالی ناز پلیز آپ ابھی ہی ہلکی پھلکی تحریر لکھا کریں سنجیدہ تحریر آپ پہ سوٹ نہیں کرتی، سویرا فلک کا افسانہ بھی بہتر تھا، ناولٹ میں تحسین اختر کی تحریر بے حد پسند آئی جبکہ فرح طاہر کے ناولٹ کی تیسری اور آخری قسط بھی

لیکن کوئی خاص متاثر نہ کر پائی، مستقل سلسلے میں حاصل مطالعہ میں رابعہ رزاق، صبا ناز اور زیبا منصور کا انتخاب بہترین تھا بیاض میں بھی دوستوں کی پسند اچھی لگی، جبکہ میری ڈائری میں، مریم ماہ منیر، عابد محمود، فریحہ، عابد اور منزہ سجاد کا انتخاب لاجواب تھا، رنگ حنا ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں کے خزانے بانٹے، عین نبیں ایک عرصے بعد خوشگوار موڈ میں نظر آئے، حنا کی محفل میں، دسترخوان تو ہوتا ہی مزے دار ہے جبکہ فوزیہ آپی حسب معمول دوستوں کو اکٹھا کیے اپنی محبتیں فراخ دلی سے بانٹتی نظر آئیں، دیکھتے ہیں اس مرتبہ ہمیں خوش آمدید کہتی یا ہمدردی کی ٹوکری کی نظر کرتی ہیں۔

حمیرا اور ہمیں خوش آمدید آپ کو بے پناہ محبتوں کے ساتھ، فروری کے شمارے کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے ہم آئندہ بھی آپ کی محبتوں کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

فرزانہ حبیب: کراچی سے تشریف لائی ہیں وہ لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے آپ کے بزم سے طویل غیر حاضری کے لئے معذرت، مورخہ دسمبر 2015ء کو میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی ہوں اس کے بعد نئی زندگی میں خود کو ایڈجسٹ ہونے کے لئے ٹائم چاہیے تھا، دعا کیجئے گا کہ نئے سفر کے ساتھ زندگی کے اس شاہراہ سفر میں بھی خوشیاں اور قلبی سکون نصیب ہو آمین۔

اب آ جاتے ہیں فروری کے شمارہ کی طرف تمام قارئین کی مشکور ہوں جنہوں نے میرے اس ناول "مجھے آواز دے لینا" کو بھی پسندیدگی کی سند بخشی، ابھی میں طفل مکتب ہوں آپ سب کی

[illegible] رائے [illegible]، خاص طور پر عبیر النساء، سبحان آفندی اور شہزہ بٹ اور جن لوگوں نے ای میل اور فیس بک کے ذریعے میرے ناول کے بارے میں رائے دی ان سب کا ڈھیروں شکریہ، سب سے پہلے اسلامیات سے دل کے ایمان کو روشن کیا، پھر اپنے پسندیدہ مصنفہ ام مریم کے ناول "دل گزیدہ" کی طرف بڑھے نام ہی دل کو کھینچنے والا ہے دوسری قسط نے ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا، ویلڈن ام مریم۔

"پربت کے اس پار کہیں" نایاب جیلانی کا انوکھا اور سفر نامہ پر بنی یہ ناول بڑی خوبصورتی سے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اس میں جگنو کا کردار مجھے اپنی ذات کے قریب نظر آتا ہے، معاملہ فہم، حالات پر قابو پانے کی صلاحیت مگر اندر سے حساس، پلیز اس کے ساتھ انصاف کیجئے گا اور اس کے اپنوں کے لئے خلوص کے جذبے کو خوشگوار صلہ سے نوازیئے گا، ابن انشاء کی "[illegible] رکابی" تک پڑھ کر لب ایک دم مسکرا اٹھے، پر مزاح مگر حقیقت سے قریب تر، "طواف محبت" ابھی زیر مطالعہ ہے، صوفیہ جبیں صاحبہ ادب کی دنیا میں نیا نام لگ رہی ہیں مگر مصنفہ کی کوشش بہتر ہے، فوزیہ جی! آپ سے ایک پیار بھری شکایت ہے کہ میں نے شاعری سلیکشن کے لئے کئی نظمیں اور غزلیں بھیجی مگر ایک بھی شائع نہیں ہوئی، پلیز اس پر بھی نظر ثانی کریں۔

فرزانہ حبیب سب سے پہلے تو آپ کو زندگی کا نیا سفر شروع کرنے پر ادارہ حنا کی طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت سی خوشیاں عطا کرے آمین۔

فروری کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی شاعری ہمارے پاس محفوظ ہے، انشاء اللہ جلد شائع کریں گے، آپ کی محبتوں اور تحریروں کے ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

ام رباب: سانگھڑ سے لکھتی ہیں۔

فروری کا شمارہ بارہ تاریخ کو ملا، ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں سب سے پہلے پڑھی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا جزاک اللہ۔

ہمیشہ کی طرح انشاء نامہ بھی بے حد پسند آیا، سلسلے وار تحریروں میں سب سے پہلے سعدیہ آپی کے ناول "اک جہاں اور ہے" کی طرف بھاگے پڑھ کر دلی سکون ملا نہ جانے سعدیہ آپی کے قلم سے لفظوں کا اک دریا ہے جو بہتا جا رہا ہے اس سے ہم جتنا بھی مستفید ہو سکیں کم ہے ہر کردار اتنا باوزن ہے اپنی اپنی جگہ کہ اللہ اگر کسی ایک کا بھی ذکر نہ ہو تو عجیب سی کمی محسوس ہونے لگتی ہے، واپس لوٹے تو ام مریم کے ناول "دل گزیدہ" کی تیسری قسط پڑھی، پسند آئی، ام مریم کی تحریر کی نمایاں خوبی جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور مریم اپنی خوبصورتی سے کرداروں کو جو ابتدا میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں اجزا میں بڑی خوبصورتی سے ایک مالا میں اکٹھا کر دیتی ہیں، "طواف محبت" کی بات مریم کے بعد جو تحریر نظر آئی وہ بھی تھی، صوفیہ سرور جبیں کا ایک نیا نام ہے بیشک، لیکن اپنی پہلی تحریر میں ہی چونکا دیں گی اپنے پڑھنے والوں کو، یقیناً آگے چل کر صوفیہ حنا میں بہترین اضافہ ثابت ہوں گی، فوزیہ آپی کی خوبی ہے کہ وہ نہ جانے کہاں کہاں سے مصنفین کو پکڑ کر لاتی ہیں اور ہمیں پڑھنے کے لئے بہترین تحریریں مہیا کر دیتی ہیں، دوسرا مکمل ناول ام ایمان کا تھا "زندگی تیرے دم سے" اچھی کوشش کی مصنفہ نے لیکن کہانی کو کچھ زیادہ طویل کر دیا، ناولٹ میں فرح طاہر کا "خواب خواہش اور وجود" اپنے اختتام کو پہنچا فرح آپ نے بھی اپنی تحریر کو بلاوجہ